اکلوتا فرزندِ ذبیح

اسحٰقؑ یا اسمٰعیلؑ



عبدالستار غوری ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری

اردو ترجمہ

عثمان سبحان غوری، ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری

المورد

اکلوتا فرزند ذبیح

اسحاقؑ یا اسماعیلؑ

تصنیف

عبدالستار غوری، ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری

اردو ترجمہ

عثمان سبحان غوری، ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری

نظر ثانی اردو ترجمہ

عبدالستار غوری

المورد

۵۱ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فہرست مضامین

Transliteration Table

ـعـ medial	:	'	ع	:	'	بھ	:	bh
ـع final	:	'	غ	:	gh	پھ	:	ph
عـ initial	:	not expressed	ف	:	f	تھ	:	th
			ق	:	q	ٹھ	:	ṭh
ا	:	a	ک	:	k	جھ	:	jh
ب	:	b	گ	:	g	چھ	:	ch
پ	:	p	ل	:	l	دھ	:	dh
ت	:	t	م	:	m	ڈھ	:	ḍh
ٹ	:	ṭ	ن	:	n	کھ	:	kh
ث	:	th	ں	:	ṇ	گھ	:	gh
ج	:	j	و	:	w			
چ	:	ch	ہ	:	h			
ح	:	ḥ	ة	:	ah (e.g .sunnah)			
خ	:	kh	ـة	:	at (in construct form e.g. sunnat al-Rasūl)			
د	:	d						
ڈ	:	ḍ	ی	:	y			
ذ	:	dh	الـ	:	al- ('l in construct form e.g. Abū'l)			
ر	:	r						
ڑ	:	ṛ						
ز	:	z						
ژ	:	ẓ						
س	:	s						
ش	:	sh						
ص	:	ṣ						
ض	:	ḍ						
ط	:	ṭ						
ظ	:	ẓ						

VOWELS			DIPTHONGS		
Short ـَ	:	a	ـَو	:	aw
ـِ	:	i	ـَی	:	ay
ـُ	:	u	ـَے	:	ae
Long ـا	:	ā	Double		
ـِی	:	ī	ـُوّ	:	uwwa
ـُو	:	ū	ـِیّ	:	iyya
ـو	:	ō	ـَنّ	:	anna
اے	:	ē			
عطف	:	-o- (اردو / فارسی)			
اضافت	:	-i- (اردو / فارسی)			

COMMON ABBREVIATIONS

AD/CE	anno domini (Latin), in the year of the Lord, Common/ Christian Era.
Ar	Arab, Arabia, Arabian, Arabic.
B	Bible.
BC	Before Christ; Bible Commentary; Biblical Commentary.
BCE	Before Christian/Common Era.
BD	Bible Dictionary.
c/ca	About, approximately (Latin circa)
CB	Commentary of the Bible.
CE	Common Era: secular form of AD.
Cf	confer: compare.
Ch	Chapter.
DB	Dictionary of the Bible.
DSS	Dead Sea Scrolls.
E	East.
E	Elohist tradition of some books of the OT of the Bible.
Ed	Editor/edited by.
Edn	Edition.
e.g./eg	for example (Latin exempli gratia).
Enc	Encyclopedia/Encyclopaedia/Encyclopedic.
Esp	especially.
Heb	Hebrew.
i.e.	that is, that means, namely.
J	Jehovist or Yahwist tradition of some books of the OT of the Bible.
JE	Text of the OT based on the combination of the E & J Traditions of the Bible.
L	Latin.
LLX	Septuagint (70): Greek Tr. of the OT claimed to be accomplished by 70 scholars in Alexandria between 250 -150 BC.
MS/MSS	Manuscript/Manuscripts.
MT/Mt	Massoretic /Masoretic Text of the OT; Matthew; Mount.
N	North.

NT	New Testament of the Bible containing 27 books: 4 Gospels + Acts + 21 Epistles (letters) + Revelations. It was originally written in Greek, whereas Jesus Christ delivered his message in the Aramaic language.
op.cit.	in the work already quoted (Latin opere citato).
OT	Old Testament of the Bible Consists of 39 books: The first five are collectively called the Pentateuch or Torah. It was originally written in Heb.
p/pp	Page/pages.
P	Priestly tradition of the OT of the Bible.
Pbl/pblg	Publisher(s)/Publishing/.
Pbln	Publication(s)
Q	Quelle (a German word), i.e. source. A hypothetical common source of the gospels of Matthew and Luke.
q.v.	(L quod vide) which see.
Rvd	Revised.
S	South, southern.
Sic.	thus, so: used within brackets, [sic], to show that a quoted passage, esp. one containing some error or s.th. questionable, is precisely reproduced.
s.o.	Some one.
s.th.	Some thing.
St	Saint.
s.v.	Under the word or heading.
Tr.	Translator, translation, translated by.
Trad/Tradn	Tradition(s).
Uni./Univ.	University.
v/vv	Verse/verses (of the Bible).
V	Version (Translations) of the Bible.
Vol.	Volume.
Vulg.	Vulgate, the Latin Tr. of the Bible accomplished by St Jerome in late 4th century AD.
W	West, western.
Y	Yahwist (Jehovist) tradition of the Bible.
(...)	It indicates that some word(s), sentence(s), or line(s) have been left over from the original quotation.
(....)	It shows that a sizeable text has been omitted from the original quotation.
[]	Square brackets are used to insert something by the Tr./Ed., which did not originally exist in the quotation.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از: جناب جاوید احمد غامدی

پریذیڈنٹ، المورد

ام القریٰ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تعلق قرآن مجید کی دعوت کا ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ذریت ابراہیم کی ایک شاخ بنی اسماعیل میں ہوئی۔ یہ لوگ مکہ میں آباد تھے۔ بیت الحرام کی تعمیر نو کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی اس شاخ کو خود یہاں آباد کیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں مروہ کے پاس انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کیا۔ یہ بیٹے خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد اسماعیل علیہ السلام تھے۔ یہود نے جو تحریفات اپنے صحائف میں کی ہیں، وہ زیادہ تر انھی حقائق سے متعلق ہیں۔ اسماعیل علیہ السلام کی جگہ انھوں نے قربانی کے لیے پیش کیے جانے والے فرزند کی حیثیت سے سیدنا اسحاق علیہ السلام کا نام اپنے صحیفوں میں داخل کر دیا ہے۔ اُن کی قربان گاہ مروہ کے بارے میں بھی بہت کچھ غلط مبحث پیدا کیا ہے۔ بیت الحرام سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کو بھی ہر پہلو سے مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

یہود و نصاریٰ پر اتمام حجت کے لیے ان تحریفات کا پردہ چاک کرنا ضروری تھا۔ دور حاضر کے ایک جلیل القدر عالم اور محقق امام حمید الدین فراہی نے یہ خدمت سر انجام دی اور 'الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح' کے نام سے ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا جس میں نہایت قابل اطمینان دلائل سے یہ تمام حقائق مبرہن کر دیے۔ بزرگوارم عبد الستار صاحب غوری انھی علوم کے محقق ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی قدیم صحائف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق پیشین گوئیوں کی تحقیق کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ اس موضوع کی

اہمیت کے پیش نظر انھوں نے امام فراہی کی تحقیق کو آگے بڑھایا اور انگریزی زبان میں ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جو ہر صاحب علم کی طرف سے داد و تحسین کی مستحق ہے۔ اس میں انھوں نے اصل مسئلہ کی تنقیح مزید کے علاوہ مکہ، زمزم اور حج کی عبادات کے بارے میں بھی بعض اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے اور اپنے مخصوص محققانہ اسلوب میں ایسے نظریات پیش کیے ہیں جو بائبل اور اس کے متعلق علوم کے محققین کے لیے بھی قابل توجہ ہیں اور دینی علوم کے ماہرین کے لیے بھی۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ان علوم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا زاویۂ نظر بھی بعض معاملات میں ان سے مختلف ہے، لیکن ان کے خلوص، محنت اور عالمانہ اندازِ تحقیق سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ وہ اس راہ کے پرانے مسافر ہیں اور راہ و رسم منزل سے خوب آشنا ہیں۔ اہل نظر اس آگہی کے شواہد ان کی اس کتاب میں جگہ جگہ دیکھ سکتے ہیں۔

'المورد' کے لیے باعث عزت ہے کہ ان جیسا عالم اور محقق اس ادارے کے ساتھ 'فیلو' کی حیثیت سے وابستہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ تا دیر یہ خدمات انجام دیتے رہیں اور پروردگار اس کے صلے میں انھیں اپنی عنایتوں سے بہرہ یاب کرے۔

—— جاوید

المورد، لاہور

۲۷ر اپریل ۲۰۰۷ء

دیباچہ طبع ہٰذا

ابتداءً یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد مصنف کو چند اربابِ علم کی طرف سے بیش قیمت تجاویز موصول ہوئیں۔ برصغیر اور کچھ دوسرے ممالک کے موقر جرائد میں اس پر قابلِ قدر تبصرے بھی شائع ہوئے۔ ان کی روشنی میں اور مزید تحقیق کے بعد جہاں ضرورت محسوس ہوئی کتاب کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ مصنف ان تمام اربابِ علم کا شکرگزار ہے، جنھوں نے ازراہِ کرم تبصرے لکھے اور تجاویز پیش کیں۔ مصنف نے بذاتِ خود بھی کتاب کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا اور جہاں مناسب خیال کیا، اصلاح اور نظرِ ثانی کر دی۔

کتاب میں بعض مواقع پر قدرے طویل انگریزی اقتباسات دیے گئے ہیں۔ اسی طرح بعض اشخاص و اماکن کے ناموں کے ساتھ اُن کا انگریزی تلفظ بھی درج کیا گیا ہے۔ اس سے بظاہر کتاب قدرے گراں بار نظر آتی ہے، لیکن اس کی افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ جو حضرات محض حصولِ معلومات کے لیے کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے، اُن سے مصنف معذرت خواہ ہے کہ انھیں اس کی وجہ سے خواہ مخواہ زحمت ہوگی، لیکن مصنف کی مجبوری یہ ہے کہ اُس نے یہ کتاب علمی اور تحقیقی حلقوں کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر لکھی ہے اور اس کی وجہ سے اُنھیں اصل مآخذ و مراجع سے رجوع میں آسانی رہے گی۔

کتاب میں 'یروشلم کی مختصر تاریخ' کے عنوان سے ایک ضخیم ضمیمے کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنے بیٹے ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری، شعبۂ اسلامیات، پنجاب یونیورسٹی کو یہ ذمہ داری سونپی تھی۔ الحمدللہ انھوں نے بطریقِ احسن اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مصنف نے ان کے اس مقالے کا بنظرِ غائر مطالعہ کر کے بعض تجاویز پیش کیں، جن پر انھوں نے خوش اسلوبی سے عمل کیا۔ انھوں نے حواشی کا ایک انڈکس بھی تیار کیا جس سے کتاب کی افادیت میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ مصنف اُن کے اس عالمانہ تعاون کا شکرگزار ہے۔

جناب عثمان سبحان غوری اور ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری نے بڑی محنت اور نہایت ذمہ داری سے کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ الحمدللہ اُن کی یہ کاوش اطمینان بخش اور لائقِ تحسین ہے۔

چند تبصروں سے اقتباسات

What makes Ghawri's work of particular relevance is his almost total, albeit deliberate, reliance on the Bible and the works of Biblical scholars to prove his point.(...). Indeed, the extensive footnotes to which the attention of the reader is constantly invited in almost every page of the book constitutes a significant, if not a major, part of the work itself.(...). Of especial consideration, with regard to Ghawri's approach, must certainly be his eye for detail and his ability to go directly to the point; to the heart of the matter, as it were.

غوری صاحب کے کام کو جس وجہ سے خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے، وہ اُن کا اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے کلیتاً اور ارادتاً بائبل اور اس کے علما کی تحریروں پر انحصار ہے۔(...)۔ ذیلی حواشی، جن کی طرف کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر قاری کی لگاتار توجہ مبذول رہتی ہے، کتاب کا ایک قابل لحاظ حصہ ہیں۔(...)۔ غوری صاحب کی کاوش کا یہ پہلو خصوصی طور پر قابل لحاظ ہے کہ اُن کی نظر تفاصیل پر رہتی ہے اور وہ مضمون کی گہرائی میں اتر کر اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

(ینگ مسلم ڈائجسٹ، بنگلور انڈیا: ستمبر ۲۰۰۵ء)

****

جناب غوری صاحب کی کتاب ذبیح، مروہ، پیرشیبا، بکہ جیسے اہم موضوعات پر بہت قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کو بہت محکم دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ان موضوعات پر موجود مغربی اہلِ قلم کی تحریروں سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ ان کا انداز گفتگو ایک مناظر کا نہیں، بلکہ ایک سنجیدہ محقق کا ہے۔(...)۔ یہ بلاشبہ ایک بہت گراں قدر علمی کوشش ہے۔ غوری صاحب اس کے لیے بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(سہ ماہی فکر و نظر، شمارہ ۳، جلد ۴۲، جنوری تا مارچ ۲۰۰۵ء، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد)

****

فاضل مصنف کا اسلوبِ تحریر معروضی، سائنٹفک اور تحقیقی ہے۔ انھوں نے اپنی بحثوں میں بائبل کے مختلف نسخوں، تراجم، شروح، لغات ومعاجم، اٹلس اور انسائیکلوپیڈیاز سے مدد لی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک قابل قدر اضافہ ہے جس پر فاضل مصنف تحسین وتبریک کے مستحق ہیں۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، شمارہ ۳، جلد ۲۴، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵، علی گڑھ، انڈیا)

****

(...). Ghauri deals with this issue in a very systematic manner in 11 chapters with 3 important appendices (...).

The two main issues selected by Ghauri are: (a) which son of Prophet Ibrahim was offered for sacrifice? (Chapters I to IV), and (b) what was the place of sacrifice (Moriah or Al-Marwah) and related matters (Chapters V to XI).

Before moving further it is better to summarize the story of prophet Ibrahim. Prophet Ibrahim was a prophet of Allah. He had two wives - one, Sarah and the other Hagar (Hajirah). Noble Hajirah was an Egyptian princess, daughter of Pharaoh, who had offered her to Ibrahim. At that time Prophet Ibrahim was issueless. Hajirah gave birth to the first son of Prophet Ibrahim. His name was Ismail, to whose progeny last Prophet of Islam, Muhammad, (peace be upon him) came. Later another son of Prophet Ibrahim was born by noble Sarah. His name was Isaac, whose progeny includes Prophets like Moses, David, Solomon and Jesus. The Jews generally consider Prophet Ismail of inferior origin. As Ibrahim was a great Prophet whose life was full of sacrifices, God ordered him to sacrifice his 'only son' or 'beloved son' into the land of Moriah. But when finally he took the knife to slay his son, God stopped him. The Jews and Christians consider Prophet Isaac the 'only son' referred to above for the special sacrifice. For [most of the] Muslims, it was Prophet Ismail. The Hajj Pilgrimage is based on the traditions of Prophet Ibrahim, his son Ismail and noble Hajirah's faiths and sacrifices at Makkah.

The author's methodology is simple. First he would put forward the Bible story or the claims of the Biblical scholars directly and comment on its weaknesses in the footnotes or in the text as the growth of story demands. Second, he would show its contradictions by extensively citing the criticism of Jewish or Christian scholars on the story or the thesis. Third, he would also raise questions and answer them with utmost skill. He mostly did his construction or deconstruction by using the works of Jewish or Christian scholars.

In these discussions, the author has not claimed any superiority of

Prophet Ismail over Prophet Isaac. He avers, 'The Biblical scholars have taken much liberties with the interpretations of Biblical themes while depicting the characters of Ibrahim, Ismail, Īsaac (...) Sarah and Hagar. The writer of the present book holds all of these great personalities equally respectable, honourable and innocent.'

There is no doubt that the book has been written in 'vintage scholarly style'. I would like to make a suggesstion at the end. As most of us are not familiar with Biblical historiography [or 'chronology'?], it would be pertinent to add a chapter thereon in the beginning of the book Without this full appreciation of the book is not possible [The Chronology has now been given in Appendix on 'A Brief Account of the History of Jerusalem']. (By Javed Ali)

(...) غوری صاحب نے اس موضوع پر کتاب کے گیارہ ابواب اور تین ضمیموں میں بڑے منظم اور حکیمانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔(...)۔

غوری صاحب نے جن دو اہم موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ ہیں: (الف) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کون سے فرزند کو قربانی کے لیے پیش کیا گیا تھا؟ (ابواب اول تا چہارم)، اور (ب) قربانی کا مقام کون سا تھا (موریاہ یا المروہ) اور اس سے متعلق معاملات (ابواب پنجم تا یازدہم)۔

آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا قصہ مختصراً بیان کر دیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالٰی کے پیغمبر تھے۔ اُن کی دو بیویاں تھیں: پہلی حضرت سارہ اور دوسری حضرت ہاجرہ۔ حضرت ہاجرہ ایک مصری شہزادی تھیں۔ وہ فرعون مصر کی بیٹی تھیں جنھیں اُس نے حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اُس وقت حضرت ابراہیمؑ بے اولاد تھے۔ ہاجرہ نے حضرت ابراہیمؑ کے پہلے بیٹے کو جنم دیا۔ اُس کا نام اسماعیلؑ تھا، جن کی نسل سے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ پیدا ہوئے۔ بعد میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاں حضرت سارہ کے بطن سے ایک اور فرزند پیدا ہوا۔ اُن کا نام اسحاقؑ تھا، جن کی نسل سے حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ یہودی بالعموم حضرت اسماعیلؑ کو کم تر حیثیت کا خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عظیم پیغمبر تھے، جن کی زندگی قربانیوں سے بھری ہوئی تھی، اس لیے اللہ تعالٰی نے انھیں اپنا 'اکلوتا' اور 'پیارا' بیٹا موریاہ کی سرزمین میں لے جا کر قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا، لیکن جب بالآخر انھوں نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے چھری پکڑی، اللہ تعالٰی نے انھیں روک دیا۔ یہودی اور عیسائی حضرت اسحاقؑ کو وہ 'اکلوتا فرزند' تصور کرتے ہیں، جن کی خصوصی قربانی پیش کرنے کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اکثر مسلمانوں کے نزدیک یہ اکلوتا فرزند حضرت اسماعیلؑ تھے۔ حج کی رسوم حضرت ابراہیمؑ کی روایات، اُن کے فرزند

اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کے ایمان اور مکہ میں قربانی پر مبنی ہیں۔

مصنف کا طرزِ استدلال نہایت سادہ اور آسان ہے۔ پہلے وہ بائبل کی کہانی اور بائبل کے علما کے دعوے براہِ راست پیش کرتے اور ذیلی حواشی یا متن میں حسبِ ضرورت اُن کی خامیوں کی تشریح کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ یہودی یا عیسائی علما کی اس قصے یا موضوع پر تنقید کے مفصل حوالے دے کر اس کے تضادات ظاہر کرتے ہیں۔ تیسرے نمبر پر وہ سوالات قائم کرتے ہیں اور بڑی مہارت سے اُن کے جوابات دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دعوے کی تائید یا مخالف دعوے کی تردید کے لیے یہودی اور مسیحی علما کی تصانیف سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

ان مباحث کے دوران میں مصنف نے حضرت اسماعیلؑ کی حضرت اسحاقؑ پر کسی فضیلت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اُن کا بیان ہے: 'بائبل کے علمانے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، (...) حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ کے کرداروں کی عکاسی کرتے وقت بائبل کے مضامین کی من مانی تعبیرات سے کام لیا ہے۔ اس کتاب کا مصنف ان تمام عظیم شخصیات کو یکساں طور پر قابلِ احترام، صاحبِ تکریم اور معصوم خیال کرتا ہے۔'

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب 'انتہائی معیاری اور عالمانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اخیر میں، میں ایک تجویز پیش کرنا پسند کروں گا۔ کیونکہ ہم میں سے اکثر لوگ بائبل کے سنین واوقات سے واقف نہیں ہیں، اس لیے مناسب ہوگا کہ کتاب کے شروع میں اس طرح کے ایک باب کا اضافہ کردیا جائے۔ اس کے بغیر کتاب کی پوری تفہیم ممکن نہیں۔

(سنین واوقات کا ایک مختصر اور ضروری نقشہ کتاب کے اخیر میں 'یروشلم کی مختصر تاریخ' نامی ضمیمے میں درج کردیا گیا ہے۔)

(ریڈینس ویوز ویکلی، ۱۶ تا ۲۲ جنوری ۲۰۰۵ء، نئی دہلی، انڈیا)

****

In the Second Appendix, Ghauri gives heaps of evidence about the different types of intentional and unintentional corruption in the text of both the Old and the New Testaments. This is followed by a brief account of the history of the Temple of Solomon in the Third Appendix. These appendices have added to the value of this scholarly work. (....), the book has been written in a scholarly manner and the author attempts to accumulate irrefutable arguments in support of his views.

[اشاعت اول (انگریزی) میں] دوسرے ضمیمے میں غوری صاحب نے نئے اور پرانے عہد نامے

کے متن میں ارادی اور غیر ارادی تحریف کی مختلف اقسام کے متعلق ڈھیروں شہادتیں فراہم کی ہیں۔ اس کے بعد تیسرے ضمیمے میں ہیکلِ سلیمانی کی تاریخ کا مختصر خاکہ فراہم کیا گیا ہے۔ ان ضمیموں نے اس فاضلانہ تصنیف کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ کیا ہے۔ (...)۔ کتاب عالمانہ انداز میں لکھی گئی ہے اور مصنف نے کوشش کی ہے کہ اپنے نظریات کی تائید میں ناقابلِ تردید دلائل جمع کرے۔

(اسلامک سٹڈیز، شمارہ ۱، جلد ۴۴، بہار، ۲۰۰۵ء، اسلام آباد)

****

Mr. Abdus Sattar Ghauri, the learned author of this well-researched work, must be complimented for the tremendous work he has done in documenting this important issue of religious history. This issue, of course, has direct bearing on the relationship of Prophet Muhammad (SAW) with Abraham (AS) and the land where the latter had settled his progeny, i.e. Arabia. Besides discussing the main issue, Mr. Ghauri has added some other related topics as well in the book. These include the locations of Makkah, Al-Marwah and the well of Zamzam.

Here, it may be made clear that at some places the writer of this book had to reproduce some Biblical authorities, which implied the comparison between the Prophets. The Biblical scholars have taken much liberties with the interpretations of Biblical themes while depicting the characters of Abraham, Ishma'el and Isaac. Regrettably, noble Sarah has been depicted as a very cruel, jealous and revengeful woman, while dealing with noble Hajra and her son, Ishma'el.

Mr. Ghauri, however, differs with these Biblical scholars and holds all of these great personalities as equally respected, honourable and innocent. It is, indeed, a matter of great interest to note that this event of the offering for sacrifice was reduced to writing in the Bible more than a thousand years after its happening. It is quite unknown who its writer was and what his credentials were, but, of certain, he was not an eyewitness of the event.

Commenting on the book, Allama Javed Ahmad Ghamidi, the profound scholar of Islam, remarks that going deep into the ancient time, the learned author has conducted an incisive multidisciplinary analysis to bring out the truth. Marked by copious references, this book testifies that the author has an eye for the subtle and the penetrating details.

[Allama Ghamidi, continuing his observations, asserts:] The author has indeed, undertaken daunting task to gather and arrange all the scattered pieces of the facts that were also defaced by corruption and ignorance. Further, Allama Ghamidi asserts that many a time, textual

corruption, far from hiding the truth, actually leaves behind bright clues and trails, which, in turn, help reconstruct the disjointed pieces of the picture.

To conclude: Mr. Ghauri has brought forth copious evidence to show that Abraham had offered Ishma'el for sacrifice. He has made an attempt to solve a long addressed problem on the principles of objective research. He has also tried to present the evidence faithfully and without any manipulations. A narrative par excellence, indeed!

اس انتہائی محققانہ کتاب کے فاضل مصنف جناب عبدالستار غوری کو مذہبی تاریخ کے اس اہم موضوع پر ایسا عظیم الشان دستاویزی کارنامہ سرانجام دینے کی بنا پر خراج تحسین پیش کیا جانا ضروری ہے۔ بلاشبہ یہ موضوع حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باہمی رشتے سے، اور اُس سرزمین یعنی عرب سے، جہاں موخر الذکر نے اپنی نسل لے جا کر آباد کی تھی، براہ راست متعلق ہے۔ مرکزی موضوع پر گفتگو کرنے کے علاوہ غوری صاحب نے کتاب میں بعض دوسرے متعلقہ موضوعات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ یہ موضوعات مکہ، المروہ اور چاہ زم زم کے محل وقوع کی نشان دہی پر مشتمل ہیں۔

اس موقعے پر اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض مقامات پر کتاب کے مصنف کو بائبل سے بعض حوالے نقل کرنا پڑے ہیں، جن سے انبیائے کرام کے درمیان مقابلے کا تاثر ابھرتا ہے۔ بائبل کے علما نے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے کرداروں سے متعلق بائبل کے مضامین کی عکاسی کرتے وقت عموماً غیر محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ قابل افسوس بات ہے کہ سیدہ سارہ کو سیدہ ہاجرہ اور اُن کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ان کے برتاؤ کے بارے میں ایک بڑی ظالم، حاسد اور منتقم مزاج عورت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

تاہم جناب غوری بائبل کے ان علما سے اتفاق نہیں کرتے اور ان تمام عظیم شخصیات کو یکساں طور پر قابل احترام، معزز اور معصوم قرار دیتے ہیں۔ یہ بات واقعی بڑی دل چسپی کی ہے کہ قربانی کے لیے پیش کیے جانے کا یہ واقعہ بائبل میں اپنے وقوع سے ایک ہزار سال سے بھی زیادہ بعد ضبط تحریر میں لایا گیا۔ یہ بات قطعی طور پر نامعلوم ہے کہ اس کا مصنف کون تھا؟ اور اُس کی استنادی حیثیت اور ثقاہت کس درجے کی تھی؟ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ وہ واقعے کا عینی شاہد ہرگز نہ تھا۔

کتاب پر رائے زنی کرتے ہوئے اسلام کے ایک عظیم اسکالر علامہ جاوید احمد غامدی نے لکھا ہے کہ فاضل مصنف نے قدیم زمانے کی تاریخ کی گہرائی میں اتر کر حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں سے نہایت باریک بینی کے ساتھ تحقیق کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ فراواں حوالہ جات کی حامل یہ

کتاب اس امر کی شاہد ہے کہ جزوی تفصیلات اور نادر و نازک مضامین پر مصنف کی گہری نظر ہے۔

[اپنے ملاحظات کے تسلسل میں علامہ غامدی رقمطراز ہیں کہ] فی الحقیقت مصنف نے حقائق کے تمام بکھرے ہوئے اُن ٹکڑوں کو، جنھیں جہالت اور تحریف کے ذریعے سے مسخ کر دیا گیا تھا، جمع اور مرتب کرنے کا عظیم فریضہ سرانجام دیا ہے۔ علامہ غامدی مزید لکھتے ہیں کہ اکثر اوقات تی تحریف حقائق کو چھپانے کے بجائے حقیقت میں نمایاں سراغ اور نشانات راہ چھوڑ جاتی ہے، جو تصویر کے منتشر اجزا کی شیرازہ بندی میں معاون ہوتی ہے۔

قصہ مختصر، جناب غوری نے یہ ثابت کرنے کے لیے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا، وافر شہادت فراہم کر دی ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ ایک قدیم نزاعی مسئلے کا معروضی تحقیق کے اصولوں کی روشنی میں حل پیش کریں۔ انھوں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ شہادت کو بغیر کسی تحریف و تبدیلی کے دیانت داری کے ساتھ پیش کریں۔ [تبصرہ نگار نے اپنے تبصرے کا اختتام اس جملے پر کیا ہے: !A narrative par excellence, indeed]۔ حقیقت میں یہ ایک ایسی کتاب ہے جو عظمت شان کے ہر معیار پر پوری اترتی ہے۔

(کرنل [ریٹائرڈ] غلام سرور، روزنامہ پاکستان اوبزرور، ۷ راگست ۲۰۰۴ء، اسلام آباد)

****

This book is the fruit of a serious effort at studying a complex issue. The author has studied the problem not only by drawing on Islamic resource material but also by studying a wide selection of Christian scholarship. As such, it must be admitted that the book is a unique contribution in the field of Muslim-Christian scholarly dialogue. It is rare to see a Muslim scholar approach Christian scholarship to build his argument. Hence, as an effort in the area of Muslim-Christian dialogue, this work must be welcomed.

یہ کتاب ایک پیچیدہ موضوع پر تحقیق و مطالعہ کی سنجیدہ کاوش کا ثمر ہے۔ مصنف نے نہ صرف اسلامی مواد و مآخذ کی روشنی میں مسئلے کا جائزہ لیا ہے، بلکہ مسیحی علما (کی تحقیقات) کے ایک وسیع انتخاب کو بھی خوب کھنگالا ہے۔ اس طرح یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں کہ یہ کتاب مسلم مسیحی عالمانہ مکالمے کے میدان میں ایک بے مثال اضافہ ہے۔ یہ بات اپنی مثال آپ ہے کہ ایک مسلمان عالم اپنے دلائل کی فراہمی کے سلسلے میں مسیحی علمی مآخذ سے اس قدر استفادہ کرے۔ چنانچہ مسلم مسیحی مکالمے کے سلسلے میں ایک کاوش کے طور پر اس کتاب کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

(تبصرہ نگار: ہرمن روبورگ، ریسرچ اسکالر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ودیا جیوتی جرنل آف تھیالوجیکل ریفلیکشن ۴-اے، راج نواس بلڈنگ، دہلی ۱۱۰۰۵۴، شمارہ نمبر ۲، جلد ۶۹، فروری ۲۰۰۵ء)

****

9934_ NRT_08_Bibliographie 14-03-2007 09:04 Page 336

****

BIBLIOGRAPHIE

Nouvelle Revue Theologique

GHAWRI, A.S., The Only Son offered for Sacrifice Isaac or Ishmael?, with Zamzamm Al-Marwah, and Makkah in the Bible, Lahore, Al-Mawrid, 2004, 22x15, xiv-310p., 15 $.

Un livre bien étrange que celui de ce chercheur Pakistanais qui déploie une érudition absolument étonnante et un esprit inquisiteur remarqablement ingénieux pour prouver que "le fils unique" que devait sacrifier Abraham au mont Moriah n'était pas Isaac (tradition Judéo-chrétienne), mais bien Ismaël (traduction musulmane). Mettant bout a bout des analyses de textes provenant de commentaires bibliques divers anciens et récents, des détails sur les processus de transmission des manuscrits et les erreurs qu'ils perpétuent, dans la tradition tant juive et chrétienne que musulmane, il en arrive à démontrer avec aplomb que l'interprétation musulmane est la seule objective. Il poursuit sa lancée en identifiant le Moriah à la Ka'bah, construite par Abraham et Ismaël (!), et il découvre que le pèlerinage à La Mecque (Mekkah) se trouverait mentionné dans la Bible par Isaïe 60 et dans les Psaumes, notamment Ps 84,7 (=vallée de Baka).

Beaucoup de notations intéressantes dans ce travail, surtout à propos de l'évolution de la double lecture des textes bibliques, mais malheureusement au service d'une cause fondamentaliste qui historicise le "sacrifice d' Abraham" sans y percevoir le message essentiel. Tout en admirant la sagacité et la patience de l'A., nous ne pouvons le suivre dans son raisonnement.---J.R. Tome 129/ 2 (annee 2007)

de la part - et avec le merci - due secr. de la
Nouvelle Revue Théologique
Boulevard Saint-Michel, 24 BE-1040 Bruxelles
secretariat@nrt.be tel. 00 32 2739 34 80 http://www.iet.be

****

اس پاکستانی محقق کی یہ ایک بہت عمدہ کتاب ہے۔ اُس نے اس کی تالیف میں انتہائی حیرت انگیز علم و دانش اور تحقیقی جذبے سے کام لیا ہے۔ اُس نے بڑے سلیقے اور نمایاں طور پر تحقیقی مہارت سے کام لیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ 'اکلوتا

بیٹا، جسے ابراہیم [علیہ السلام] کوہ موریاہ پر قربانی کے لیے پیش کرنا چاہتے تھے، اسحاق [علیہ السلام] نہ تھا (جیسا کہ یہودی اور مسیحی روایت ہے)، بلکہ اسماعیل [علیہ السلام] تھا (جیسا کہ مسلم تاویل کرتے ہیں)۔ شروع سے آخر تک بائبل کی قدیم اور جدید تفاسیر سے اخذ کردہ متون کے تجزیے کے ذریعے سے، مسودات کی منتقلی کے طریقے کار کی تفاصیل کے ذریعے سے، اور یہودی، مسیحی اور مسلم روایت کے مطابق ان کتب میں پائی جانے والی واضح اغلاط کے ذریعے سے مصنف بالآخر نہایت مضبوط بنیادوں پر یہ واضح کر دیتا ہے کہ صرف مسلم تعبیر ہی معروضی تعبیر ہے۔ اپنی تحقیق کے تسلسل میں وہ یہ واضح کرتا ہے کہ موریاہ وہی مقام ہے جہاں ابراہیم [علیہ السلام] اور اسماعیل [علیہ السلام] نے کعبہ تعمیر کیا تھا۔ اُس نے دریافت کیا ہے کہ مکے کے حج کا ذکر بائبل کی کتاب یسعیاہ، باب ۶۰ اور زبور کے مزامیر ۸۴ و ۸۷ (وادی بکا) میں موجود ہے۔

اس کتاب میں بہت سے دل چسپ حواشی اور مشاہدات ہیں جن میں بالخصوص اس امر کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ بائبل کے متون کے متعدد تراجم اور قراءتیں وجود میں آتی رہی ہیں، لیکن بدقسمتی سے مصنف کی اس کاوش سے بنیاد پرستی کے مقاصد کی خدمت ہوتی ہے اور ابراہیم [علیہ السلام] کی قربانی کو تاریخی رنگ دے کر اس کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہم مصنف کے علم و دانش اور صبر کی بھرپور تائید کرتے ہیں، لیکن ہم ان کے استدلال کی کلی تائید نہیں کر سکتے۔

(ببلیو گرافی نا و یلے ریویو تھیا لوجیق، صفحہ ۳۶۶، شمارہ ۱۴۰، مارچ ۲۰۰۷ء، برسلز، بلجیئم)

****

مصنفین نے (...) نہ صرف عہد نامہ قدیم و جدید، بلکہ عیسائی لٹریچر اور متعدد حوالہ جاتی کتب سے متعلقہ مواد اخذ و پیش کیا ہے اور قطعیت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ 'ذبیح' فی الواقع حضرت اسماعیلؑ ہی تھے۔ (.....)۔ مصنفین نے (...) ضمناً فلسطین کے تاریخی مقامات کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ ایک وسیع لوازمے کو ایک جگہ مرتب کر دینے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب ہمارے عیسائی اور یہودی بھائیوں کو تحفے میں دینے کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اردو دان طبقے کے لیے بھی اگر اس کا ترجمہ کر دیا جائے تو اچھا ہوگا۔

جاوید احمد غامدی نے 'پیش لفظ' میں اس کوشش کو اپنے ادارے کے لیے باعث فخر قرار دیا ہے۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن بابت نومبر ۲۰۰۸ء، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور، تبصرہ از پروفیسر عبدالقدیر سلیم)

قربانی کی حقیقی روح

قربانی کے عمل کی حقیقی روح اللہ تعالیٰ کی کامل فرماں برداری ہے، جس کا تمام ابراہیمی مذاہب (اسلام، مسیحیت اور یہودیت) کے صحائف میں ذکر کیا گیا ہے:

(الف) سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت رکھ [یہودی و مسیحی روایت]۔ (کتاب مقدس، استثناء ۶:۴-۵، انجیل متی ۲۲:۳۷، انجیل مرقس ۱۲:۳۱، انجیل لوقا ۱۰:۲۷)

(ب) ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا، (...) تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے، (...) اور وہاں اُسے (...) سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔ (...) تب ابرہام صبح سویرے اٹھا (...)۔ کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لیے تُو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔ (...)۔ اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔ (کتاب مقدس، پیدائش ۲۲:۱، ۲، ۳، ۱۲، ۱۸)۔

(ج) وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اُس سے کہا: 'بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟' اُس نے کہا: 'ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔' آخر کو جب اُن دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ 'اے ابراہیم، تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔' اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اُس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیمؑ پر۔ (القرآن، الصّٰفّٰت ۳۷:۱۰۲تا۱۰۹)۔

(د) تم نیکی کی حقیقت کو ہرگز نہیں پا سکتے، جب تک اُن چیزوں میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمھیں محبوب ہیں، اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے، (اُس کا صلہ تمھیں لازماً ملے گا)، اس لیے کہ اللہ اُسے جانتا ہے۔ (القرآن، آل عمران ۳:۹۲)۔

اس طرح قربانی کی حقیقی روح مختصراً یوں بیان کی جاسکتی ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا کامل نمونہ ہیں۔ انھوں نے اپنا انتہائی پیارا اور نہایت لازمی اثاثہ یعنی اپنا اکلوتا بیٹا بھی اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی کے لیے پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ دنیا کی تمام اقوام میں سے جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت کا رویہ اختیار کرتا ہے، اُسے برکت دی جائے گی، کیونکہ ایک اللہ کی اطاعت مذاہب کے درمیان ہم آہنگی اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات کے درمیان امن کی ضامن ہے۔

دیباچہ

طبع اول ۲۰۰۴ء (انگریزی ایڈیشن)

ابتداءً یہ تحریر ایک مضمون کی صورت میں مصنف کی کتاب 'Paran Prophecy of the Bible Regarding The Prophet of Islam' کے ضمیمے کے طور پر لکھی گئی تھی۔ جب مصنف نے اسے ایک مضمون کی شکل میں جناب جاوید احمد غامدی، سرپرست اعلیٰ، ادارہ علم وتحقیق، المورد کو پیش کیا تو انھوں نے اس بات کی ترغیب دلائی کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کی جائے اور اگر مواد مناسب ضخامت اختیار کرلے تو اس کو ایک مکمل کتاب کی شکل میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مشورے کے مطابق اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ وتحقیق کا آغاز کر دیا گیا۔ متعدد مرتبہ ان کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ان سے رجوع کیا گیا۔ نماز عصر کے لیے جاتے ہوئے راستے میں اکثر اوقات وہ اس کی ترتیب کے سلسلے میں پیش آمدہ مشکلات چند جملوں میں حل کر دیتے تھے۔ اس کام کے دوران میں جاوید صاحب مصنف کی مسلسل رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ مصنف ان کا نہایت ممنون ہے۔

یہ کتاب نہ تو مناظراتی نوعیت کی ہے اور نہ ہی کوئی عام سی معلوماتی تصنیف۔ یہ ایک ایسے مسئلے کو سلجھانے کی معروضی اصولوں پر مبنی کاوش ہے جو طویل عرصے سے زیر بحث رہا ہے۔ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ کسی لفظ یا نظریے کی وضاحت یا کوئی دعویٰ بغیر کسی مستند حوالے کے

پیش نہ کیا جائے۔ ہر بات کی وضاحت اتنی مدلل اور مفصل ہے کہ کسی کو یہ شکایت یا گمان نہ ہو سکے کہ وضاحت ناکافی یا یک طرفہ ہے۔ اس کے علاوہ حوالوں کو بغیر کسی جوڑ توڑ کے نہایت ایمان داری سے اپنی اصل حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک فاضل دوست نے شکوہ کیا ہے کہ اس میں 'حوالہ جات کی بھرمار' ہے۔ مصنف کو اس بات کا پورا احساس ہے، لیکن کتاب کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ یہ حوالے قریباً ناگزیر تھے اور ان سے گریز ناممکن تھا۔ ہوسکتا ہے بعض مقامات پر قاری مواد میں تکرار محسوس کرے، لیکن ایک تو موقع و محل کا تقاضا تھا کہ اس کا ذکر کیا جائے، دوسرے یہ بھی پیش نظر تھا کہ قاری ایسی بلاوجہ کی ورق گردانی سے بچ جائے جو موضوع کی تاثیر اور دلچسپی ختم کرنے کا موجب ہو۔ امید ہے کہ اس کا بغور مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ کتاب کی مزید بہتری کے لیے مناسب تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا اور متعلقہ سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی جائے گی۔

اگر اس 'اکلوتے بیٹے' کو، جسے قربانی کے لیے پیش کیا جانا تھا، اس بات کی خبر ہی نہ ہو تو یہ قربانی اس کے لیے کسی اعزاز کا موجب نہیں ہو سکتی تھی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بائبل کے بیان کے مطابق حضرت اسحاقؑ کو اُس وقت تک قربانی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا، جب تک ان کو اس مقصد سے 'عقیدہ گاہ' تک پہنچا نہ دیا گیا، جبکہ دوسری طرف مسلمانوں کے مطابق 'اکلوتے بیٹے' کو مکمل طور پر اعتماد میں لیا گیا تھا اور اس نے پورے اطمینان سے اسے قبول کیا تھا۔ بلاشبہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اکلوتا بیٹا انتہائی فرض شناس ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اپنے والد کے حکم کی تعمیل کے سلسلے میں سرِ تسلیم خم کرنے والا ہے۔ یہ یقیناً ایک قابلِ تحسین بات ہے، لیکن مسلمان اس کی وجہ سے اُن کی برتری کا دعویٰ نہیں کرتے۔ وہ اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؑ کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش میں سُرخ رُوئی اور ان کی فرض شناسی کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور اسے ایک بیٹے کا مستحسن اقدام سمجھتے ہیں، جس نے اپنے باپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری کی تکمیل کے لیے بغیر کسی حیلہ و حجت کے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

کچھ مسلم علما اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس بیٹے کو قربانی کے لیے پیش

کیا تھا، وہ حضرت اسحاقؑ تھے۔ اس معاملے میں ان کا انحصار کلیۃً بائبل ہی پر ہے۔ یہ واقعہ جنوبی ایشیا کے ایک مسلمان عالم امام حمید الدین فراہیؒ نے اپنی کتاب 'الرای الصحیح فی من ھو الذبیح' میں ہمیشہ کے لیے پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ یہ ساڑھے آٹھ x ساڑھے پانچ انچ سائز کے ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ایک عربی کتاب ہے، جو دار القلم، دمشق سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی موجودگی میں ناچیز مصنف کو اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جو ارباب علم اس سلسلے میں تفصیل کے طالب ہوں، وہ امام فراہیؒ کی مذکورہ کتاب سے رجوع فرمائیں۔

'بیر سبع' پر بھی ایک ضمیمہ شامل کتاب ہے، جسے کتاب ہی کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ 'بیر سبع' کا لفظ بائبل میں 'زم زم' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کتاب کا مضمون اس بات کا متقاضی تھا کہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔ چنانچہ جب اس موضوع پر تفصیلی کام کیا گیا تو اس نے ایک الگ اور مستقل بالذات مضمون کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ اسے کتاب میں ایک ضمیمے کے طور پر شامل کر لیا گیا۔

کتاب کی تدوین کے سلسلے میں اصل موضوع کی تکمیل کے ساتھ ساتھ متعدد ضمنی مباحث پر بھی تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے نتیجے میں کتاب کے موضوعات کا دائرہ کافی وسعت اختیار کر گیا، لیکن اس سلسلے میں جس نکتے پر بھی گفتگو کی گئی ہے، وہ اپنی جگہ کتاب کے موضوع سے متعلق بھی ہے اور اُس مقام پر اس کی ضرورت بھی تھی۔ اس کی وجہ سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح اس میں مندرجہ ذیل ذیلی اور ضروری مباحث پر گفتگو کی گئی ہے:

۱۔ بائبل کے مطابق 'مکے' کا محل وقوع۔

۲۔ بائبل میں 'مکے کے حج' کا ذکر۔

۳۔ بائبل کے مطابق 'المروہ' کا محل وقوع۔

۴۔ حضرت داوٗد کا 'مکے کا حج'۔

۵۔ بائبل کی کتاب یسعیاہ میں مکے میں قربانیوں کا ذکر۔

۶۔ چاہِ زم زم۔

۷۔ ہیکلِ سلیمانی کا مختصر تعارف۔

۸۔ حضرت ہاجرہ کا باندی نہیں بلکہ ایک شہزادی ہونا۔

ان مباحث سے کتاب کی قدر و قیمت اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اصل انگریزی کتاب میں ۸۰ (اسّی) صفحے کا ایک اور ضمیمہ بھی 'متنِ بائبل اور اس میں تحریف کی چند صورتیں' (*The Text of the Bible and Some Types of Corruption in It*) کے نام سے شاملِ کتاب تھا، لیکن اُردو ترجمے میں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ اس پر مزید تحقیق جاری ہے اور اسے ان شاء اللہ ایک مستقل اور مفصل کتاب کی صورت میں الگ سے شائع کیا جائے گا۔

عبدالستار غوری

المورد، ادارہ علم و تحقیق، ۵۱ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون (+9242)5834306, 5865145, Ext.120; Mob. 0345-5205020

email <asghawri@hotmail.com> <asghawri@gmail.com>

حواشیٔ دیباچہ

۱ دی اسٹینڈرڈ جیوئش انسائیکلوپیڈیا (.The Standard Jewish Enc) ایڈیٹر ڈاکٹر سیسل روتھ، مطبوعہ لندن، ڈبلیو ایچ ایلن، ۱۹۵۹ء میں صفحہ ۶۱ پر 'عقیدۃ' کی یوں وضاحت کی گئی ہے:

(Heb. 'binding'): Traditional designation of Abraham's intended offering of Isaac (Gen. 22), the consummation of which was prevented at the last minute by Divine intervention.

(عبرانی میں 'باندھنے' کے لیے) روایتی طور پر یہ لفظ [حضرت] ابراہیم کے [حضرت] اسحاقؑ کو قربانی کے لیے پیش کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے (کتاب پیدایش ۲۲)، جسے آخری لمحے پر اللہ تعالیٰ نے مداخلت کرکے پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے روک دیا تھا۔

اس لفظ کا بھی وہی سہ حرفی مادہ ہے جو عربی کے 'عقد یعقد عقدا' کا ہے۔ اس کے معنی ہیں باندھنا یا گرہ لگانا (معن زلفو مدینہ، عربی انگلش ڈکشنری، نیویارک: پاکٹ بکس، ۱۹۷۳ء)۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو سوختنی قربانی کے لیے پیش کرنے کی غرض سے 'باندھنے' کی طرف اشارہ ہے۔

۲ امام حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۳ء–۱۹۳۰ء) انڈیا میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں پھریہا (فراہی کا لفظ اسی سے ماخوذ ہے) میں پیدا ہوئے۔ جب وہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے تو انھوں نے ابن سعد (۷۸۴ء–۸۴۵ء) کی اسلامی تاریخ پر شہرۂ آفاق کتاب 'طبقات الکبریٰ' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کا یہ ترجمہ اتنا عمدہ تھا کہ کالج کے بانی اور سرپرست اعلیٰ سر سید احمد خان نے اسے کالج کے نصاب میں شامل کرلیا۔ امام فراہی نے بی اے الہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔ ایم اے او کالج علی گڑھ میں عربی کی تدریس کے زمانے میں انھوں نے جرمن مستشرق جوزف ہورووِٹز (۱۸۷۴ء–۱۹۳۱ء) سے، جو وہاں ان کے ساتھ عربی کے پروفیسر تھے، عبرانی زبان سیکھی۔ ۱۹۲۵ء

میں مدرستہ الاصلاح کی سربراہی کا منصب سنبھالا۔ وہاں انھوں نے اپنے بعض شاگردوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ عربی زبان وادب، علوم اسلامیہ اور تاریخ کے عظیم علما کے طور پر مشہور ہوئے۔ امین احسن اصلاحیؒ ان کے ایسے ہی ایک شاگرد تھے جو بعد میں ان کے افکار کے سب سے بڑے شارح قرار پائے۔ امام فراہی نے اپنی زندگی کے تقریباً پچاس سال قرآن کے تحقیقی مطالعہ پر صرف کیے۔ قرآن کی تشریح کے سلسلے میں ان کی سب سے نمایاں خدمت یہ ہے کہ انھوں نے نظمِ قرآن کو ایسے مربوط انداز میں پیش کیا کہ ان سے پہلے اس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ انھوں نے ثابت کیا کہ نظمِ قرآن کے تین عناصر (۱۔ ترتیب، ۲۔ تناسب، ۳۔ وحدت) کے گہرے مطالعے کے نتیجے میں قرآنی الفاظ وآیات کی ایک ہی تاویل ممکن ہے۔ انھوں نے عربی زبان کے متعدد ایسے قواعد ومناہج کو نئے انداز میں مرتب کیا، جو قرآن کے تحقیقی مطالعہ کے سلسلے میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ امام فراہیؒ کی اکثر وبیشتر تصانیف عربی زبان میں ہیں، مثلاً 'مجموعہ تفاسیر فراہی' (یہ قرآن کی چودہ چھوٹی سورتوں کی تفسیر ہے جس کا اردو ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے کیا ہے)؛ 'مفردات القرآن' (اس میں قرآن کے بعض مشکل الفاظ کی جاہلی دور میں عربی زبان کی ادبی روایت اور اسالیب کی روشنی میں تشریح کی گئی ہے)؛ 'الإمعان فی اقسام القرآن'؛ 'الرای الصحیح فی من ھو الذبیح'؛ 'جمھرۃ البلاغۃ'؛ 'اسالیب القرآن'؛ 'دلائل النظام'؛ 'اسباق النحو'؛ 'اصول التاویل'؛ 'فی ملکوت اللہ'؛ 'القائد الی عیون العقائد'؛ 'حجج القرآن' اور 'کتاب الحکمۃ'۔ ان کی بعض کتابوں کے اردو اور انگریزی میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب 'الرای الصحیح فی من ھو الذبیح' کا حال ہی میں جناب نادر عقیل انصاری نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے کیا تھا جو ۱۹۷۵ء میں 'ذبیح کون؟' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔

تعارف

یہودیوں اور عیسائیوں کے مطابق وہ 'اکلوتے فرزند' جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا تھا کہ انھیں قربانی کے لیے پیش کیا جائے، حضرت اسحاق علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام۔ بائبل نے اس واقعہ کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بائبل کے پورے بیان میں 'اکلوتے بیٹے' کا نام 'اسحاق' علیہ السلام صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے جو غیر موزوں بھی ہے اور حقائق کے خلاف بھی ہے۔ اس بیان میں ایسے صریح تضادات موجود ہیں جن کی بنا پر اس کے بارے میں یہود و نصاریٰ کا موقف بالکل ناقابل اعتبار قرار پاتا ہے۔ دوسری طرف مسلم علما کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے جس فرزند کی قربانی پیش کرنے کا حکم دیا تھا، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے مسلم علما حضرت اسحاق علیہ السلام پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی برتری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک تمام پیغمبر اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کی حیثیت سے رتبے میں برابر ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ بعض مقامات پر مصنف نے مجبوراً اور ضرورتاً بائبل سے بعض حوالے نقل کیے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل کے مصنفین نے پیغمبروں کے درمیان موازنے کی روش اختیار کی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی شخصیت اور کردار کے متعلق بائبل میں موجود واقعات کی تشریح کرتے ہوئے علمائے بائبل نے بے باکی، بلکہ قدرے گستاخی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اسی طرح حضرت

سارہ پر الزامات لگائے گئے ہیں کہ وہ حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ اپنے سلوک میں بہت ظالمانہ، حاسدانہ اور انتقامی جذبات رکھتی تھیں۔ یہ صرف علمائے بائبل ہی کا موقف ہے۔ کتاب ہذا کا مصنف ان تمام عظیم شخصیات کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا اور انھیں یکساں طور پر معصوم اور قابل احترام تصور کرتا ہے۔

کتاب کے موضوعات کی تحقیق کے لیے موضوعی اور غیر جانبدار مطالعہ کی روش اختیار کی گئی ہے۔ یہ بات ابتدا ہی میں ذہن نشین کر لی جانی چاہیے کہ جب قربانی کا یہ واقعہ بائبل میں تحریر کیا گیا تھا، اس وقت تک اسے رونما ہوئے قریباً ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ یہ بات بالکل نامعلوم ہے کہ اس کتاب کا مصنف کون تھا اور اس کی ثقاہت کس حیثیت کی تھی، لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ وہ اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہرگز نہیں تھا۔ جب خود مصنف ہی گمنام ہے تو اس بات کا تعین کیسے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے یہ مواد کہاں سے حاصل کیا تھا، اور جس سے حاصل کیا تھا، اس کے ثقہ ہونے کا کہاں تک امکان ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ صدیوں تک اس واقعے کی زبانی روایت کے دوران میں عہد بہ عہد راویوں نے اس کے بیان میں کیسی کیسی 'اصلاحات' اور کتنا 'ردوبدل' کر کے اس کا کیا گیا حلیہ بگاڑا ہوگا، جبکہ اس کام کو سرانجام دینے والے لوگ خود کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے حریف سمجھتے تھے اور اپنے حق میں یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی منتخب قوم اور اس کے لاڈلے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بیان کا گہری نظر اور تنقیدی شعور کے ساتھ سوچ سمجھ کر تجزیہ کیا جائے اور اس کی کسی بھی بات کو قبول کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کے متعلق بے لاگ تحقیق کر لی جائے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ بائبل میں حضرت ابراہیم کو 'آزمانے' کا جو ذکر ہے، اس کے لیے قرآن کریم میں 'ابتلا' کا لفظ آیا ہے۔ 'ابتلا' کے لفظ سے یہ مراد نہیں کہ اکلوتے بیٹے کو لازماً ذبح ہونا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ بات بغیر کسی شک وشبہ کے نکھر کر سامنے آجائے کہ حضرت ابراہیمؑ بلا تامل فرمانِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے بیٹے کی قربانی کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اسی

طرح سورۂ صافات (۱۰۲:۳۷) میں قرآن کے الفاظ 'میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمھیں ذبح کرتا ہوں' اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ محض ایک خواب تھا، نہ کہ ایک واقعی حقیقت۔ قابل غور بات یہ ہے کہ وہ یہ الفاظ استعمال نہیں کرتے کہ 'میں نے تمھیں ذبح کر دیا ہے' یا 'میں نے تمھیں ذبح کیا ہے'۔ اس کے بجائے وہ کہتے ہیں: 'میں تمھیں ذبح (کرنے کا ارادہ) کرتا ہوں'۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل ذبح کی تکمیل مقصودِ الٰہی نہ تھی۔

حواشی تعارف

۱۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جس بیٹے کی قربانی پیش کی جانی تھی، اُس کا نام اس عبارت میں پانچ جگہ بیان ہوا ہے، لیکن پوری عبارت میں صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں یہ اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے۔ باقی چار مقامات (آیات ۳، ۶، ۷، ۹) پر یہ نام کتاب کے مرتب کی طرف سے لیا گیا ہے، اس بیٹے کا ذکر تین مرتبہ (آیات ۵، ۷، ۹) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا ہے، لیکن ان تینوں مقامات پر کسی جگہ بھی انھوں نے اس بیٹے کا ذکر (اسحاق) کے نام سے نہیں کیا۔ آیت ۵ میں انھوں نے اپنے اس بیٹے کے لیے 'میں اور لڑکا' کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور آیات ۷ اور ۸ میں انھوں نے اُس کے لیے 'میرا بیٹا' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ خداوند کے فرشتے نے بھی اس بیٹے کا ذکر کسی جگہ 'اسحاق' کے نام سے نہیں کیا۔

باب اول

'قربانی' کی کہانی، بائبل میں

بائبل میں درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنا 'اکلوتا بیٹا' سوختنی قربانی کے طور پر پیش کرنے کے لیے کہا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ 'اکلوتا بیٹا' صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کو کہا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ صرف اسماعیل علیہ السلام ہی تھے جو چودہ سال تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے فرزند رہے۔ جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کسی بھی فرزند کے متعلق 'اکلوتا بیٹا' کے الفاظ استعمال نہیں کیے جاسکتے تھے، کیونکہ اب ان کے صرف ایک نہیں، بلکہ دو بیٹے تھے۔ یہودی علما نے خیال کیا کہ اللہ کے حضور قربانی کے لیے پیش کیا جانا ایک بہت بڑا اعزاز ہے، اس لیے ان کو یہ بات پسند نہ آئی کہ قربانی کا یہ واقعہ اصلی اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے منسوب ہو، کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ان کے حقیقی مورثِ اعلیٰ نہ تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ تو حضرت اسحاق علیہ السلام تھے، اس لیے انھوں نے قربانی کے اس واقعہ کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی۔

بائبل کے بیان کے مطابق قربانی کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی جائے، جس کی پہلی ہی آیت میں وضاحت کردی گئی ہے۔ قرآن کریم میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کا ذکر موجود ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ. (البقرہ ۲:۱۲۴)

یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اُس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن سب میں پورا اتر گیا، تو اُس نے کہا: 'میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔' ابراہیمؑ نے عرض کیا: 'اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟' اُس نے جواب دیا: 'میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔'

اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ قربانی کا خواب میں دکھایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقصود محض ایک آزمائش ہی تھی اور ان الفاظ پر بعینہٖ عمل کیا جانا مطلوب نہ تھا۔ بیانِ واقعہ سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے۔

بائبل میں واقعۂ قربانی کا بیان

بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے 'اکلوتے بیٹے' کو قربانی کے لیے پیش کرنے کا واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

And it came to pass after these things, the God did tempt Abraham, and said unto him, Abraham: and he said, Behold, here I am. (2) And he said, Take now thy son, thine only son Isaac, whom thou lovest, and get thee into the land of Moriah; and offer him there for a burnt offering upon one of the mountains which I will tell thee of. (3) And Abraham rose up early in the morning, and saddled his ass, and took two of his young men with him, and Isaac his son, and clave the wood for the burnt offering, and rose up, and went unto the place of which God had told him. (4) Then on the third day Abraham lifted up his eyes, and saw the place afar off. (5) And Abraham said unto his young men, Abide ye here with the ass and I and the lad will go yonder and worship, and come again to you (6) And Abraham took the wood of the burnt offering, and laid it upon Isaac his son; and he took the fire in his hand, and a knife; and they went both of them together. (7) And Isaac spake unto Abraham his father, and said, My father: and he said, Here am I, my son. And he said, Behold the fire and the wood: but where is the lamb for a burnt offering? (8) And Abraham said, My son, God will provide himself a lamb for a burnt offering: so they went both of them together. (9) And they came to the place which God had told him of; and Abraham built an altar there, and laid the wood in order, and bound Isaac his son, and laid him on the altar upon the wood. (10) And Abraham stretched forth his hand, and took the knife to slay his son. (11) And the angel of the Lord called unto him out of heaven, and said, Abraham, Abraham: and he said, Here am I. (12) And he said, Lay not thine hand upon the lad, neither do thou any thing upon him: for now I know that thou fearest God, seeing thou hast not withheld thy son, thine only son from me. (13) And Abraham lifted up his eyes, and looked, and behold behind him a ram caught in a thicket by his horns: and Abraham went and took the ram, and offered him up for a burnt offering in the stead of his son. (14) And Abraham called the name of that place Jehovah-jireh: as it is said to this day, In the mount of the Lord it shall be seen.(15) And the angel of the Lord

called unto Abraham out of heaven the second time, (16) And said, By myself have I sworn, saith the Lord, for because thou hast done this thing, and hast not withheld thy son, thine only son:(17) That in blessing I will bless thee, and in multiplying I will multiply thy seed as the stars of the heaven, and as the sand which is upon the sea shore; and thy seed shall possess the gate of his enemies; (18) And in thy seed shall all the nations of the earth be blessed; because thou hast obeyed my voice.

کتابِ مقدس سے اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام! اس نے کہا میں حاضر ہوں (۱)۔ تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا (۲)۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اضحاق کو لیا اور سوختنی قربانی کے لیے لکڑیاں چیریں اور اٹھ کر اُس جگہ کو جو خدا نے اُسے بتائی تھی روانہ ہوا (۳)۔ تیسرے دن ابرہام نے نگاہ کی اور اُس جگہ کو دور سے دیکھا (۴)۔ تب ابرہام نے اپنے جوانوں سے کہا تم یہیں گدھے کے پاس ٹھہرو۔ میں اور یہ لڑکا دونوں ذرا وہاں تک جاتے ہیں اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس لوٹ آئیں گے (۵)۔ اور ابرہام نے سوختنی قربانی کی لکڑیاں لے کر اپنے بیٹے اضحاق پر رکھیں اور آگ اور چھری اپنے ہاتھ میں لی اور دونوں اکٹھے روانہ ہوئے (۶)۔ تب اضحاق نے اپنے باپ ابرہام سے کہا اے باپ! اُس نے جواب دیا کہ اے میرے بیٹے میں حاضر ہوں۔ اُس نے کہا دیکھ آگ اور لکڑیاں تو ہیں پر سوختنی قربانی کے لیے برہ کہاں ہے؟ (۷)۔ ابرہام نے کہا اے میرے بیٹے خدا آپ ہی اپنے واسطے سوختنی قربانی کے لیے برہ مہیا کر لے گا سو وہ دونوں آگے چلتے گئے (۸)۔ اور اس جگہ پہنچے جو خدا نے بتائی تھی۔ وہاں ابرہام نے قربان گاہ بنائی اور اُس پر لکڑیاں چنیں اور اپنے بیٹے اضحاق کو باندھا اور اسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے اوپر رکھا (۹)۔ اور ابرہام نے ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے (۱۰)۔ تب خداوند کے فرشتہ نے اُسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام اے ابرہام! اس نے

کہا میں حاضر ہوں (۱۱)۔ پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لیے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مُجھ سے دریغ نہ کیا (۱۲)۔ اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابرہام نے جا کر اُس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا (۱۳)۔ اور ابرہام نے اُس مقام کا نام یہوواہ یری رکھا۔ چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے[۵] کہ خُداوند کے پہاڑ پر مُہیا کیا جائے گا (۱۴)۔ اور خُداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پُکارا اور کہا کہ (۱۵)۔ خُداوند فرماتا ہے چُونکہ تُو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ (۱۶)۔ میں تجھے برکت پر برکت دُوں گا اور تیری نسل[۶] کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دُوں گا اور تیری اُولاد اپنے دُشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی[۷] (۱۷)۔ اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی[۸] کیونکہ تو نے میری بات مانی[۹] (۱۸)۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مندرجہ بالا عبارت میں قصہ نگار نے صرف محدود الفاظ ہی خداوند کی طرف منسوب کیے ہیں، باقی تمام عبارت قصہ نگار کے اضافی توضیحی الفاظ پر مشتمل ہے۔ جو الفاظ خداوند کی طرف منسوب ہیں، ان میں بھی ہزار سالہ زبانی روایت کے مراحل میں فطری طور پر اور راویوں کے رجحانات و نظریات کے زیرِ اثر حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس سے عبارت کی استنادی حیثیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بائبل کے اس قصے کی حیثیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے 'اکلوتے' بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کرنے کے مندرجہ بالا قصے میں قابلِ لحاظ حد تک کئی مرتبہ متعدد تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ 'انسائیکلوپیڈیا ببلیکا' میں اس کے متعلق وضاحت کی گئی ہے:

It has become certain that the story has been considerably altered since E [Elohist] wrote it. The editor or compiler of JE [Yahwist and Elohist] not only appended vv 14b-18 (an unoriginal passage, full of reminiscences), but also introduced several alterations into vv. 1-14a. (...). So far, however, as an opinion is possible, the form of the Elohist's story is, apart from the detail about the ram, all his own. It was suggested, indeed, by circumstances already related in the traditional narratives; but it was molded by himself, and it is bathed throughout in an ideal light. Evidently this pious writer felt that for the higher religious conceptions no traditional story would be an adequate vehicle. The course which he adopted shows the writer to have been a great teacher. He admits the religious feeling which prompted the sacrifice of a firstborn son; (...).[1]

یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ جب سے الوہسٹ (Elohist) نے یہ قصہ تحریر کیا اس وقت سے یہ قابلِ لحاظ حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ یہوسٹ (Yahwist) + الوہسٹ (Elohist)، یعنی JE کے مدیر و مؤلف نے نہ صرف اس میں آیات ۱۴-ب تا ۱۸ (جو اصلی عبارت میں موجود نہیں، بلکہ زبانی یادداشتوں پر مشتمل ہیں) کا اضافہ کیا، بلکہ آیات ۱ تا ۱۴-الف میں بھی متعدد تبدیلیاں کیں۔ (...)۔ تاہم جس حد تک کوئی رائے قائم کرنا ممکن ہے، دنبے کے متعلق بیان کردہ تفصیلات کو چھوڑ کر، الوہسٹ کے بیان کردہ قصے کے خدوخال اس کی اپنی تصنیف ہیں۔ اس کی طرف اشارے توفی الحقیقت ان حالات سے ماخوذ ہیں جو روایتی قصے میں پہلے سے موجود ہیں، لیکن ان کا ڈھانچا خود اسی کا تیار کردہ ہے اور یہ شروع سے آخر تک ایک مثالی انداز میں لکھا گیا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اس نیک اور پارسا مصنف نے یہ محسوس کیا کہ بلند تر دینی تصورات کے لحاظ سے وہ قصہ جو روایتی طور پر بیان ہوتا آ رہا ہے، مناسب نہیں۔ اس نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف ایک بہت بڑا معلم رہا ہے۔ وہ اس دینی احساس کا اعتراف کرتا ہے جو پہلوٹھے بیٹے کی قربانی کا محرک ہوا۔ (...)۔

یہ اقتباس اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ الگ الگ نِکات کی صورت میں اسے یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

(۱) اس قصے میں 'تبدیلیاں' اور 'اضافے' پوری آزادی سے روبہ عمل لائے گئے ہیں۔

(۲) 'تبدیلیوں' کا عمل محض ایک مفروضہ نہیں ہے، بلکہ یہ 'ایک یقینی امر' ہے۔

(۳) 'تبدیلیاں' صرف ایک دو نہیں، بلکہ 'قابل لحاظ' مقدار میں کی گئی ہیں۔

(۴) اس قصے کا مرکزی موضوع الوہسٹ روایت سے تعلق رکھتا ہے۔

(۵) جس مؤلف نے الوہسٹ اور یہوسٹ بیانات کے امتزاج سے یہ قصہ ترتیب دیا ہے، اس نے نہ صرف آیات ۱۴-ب تا ۱۸ کا اضافہ کیا، بلکہ آیات ۱ تا ۱۴-الف میں اپنی طرف سے متعدد تبدیلیاں بھی کیں۔

(۶) مؤلف ایک نیک و پارسا مصنف اور ایک بڑا معلم تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ روایتی قصہ مفید مطلب نہیں تو اُس نے اسے بڑی آزادی سے بذاتِ خود ایسے انداز میں ڈھال لیا جو اس کے نزدیک بلند تر دینی تصورات کے لحاظ سے زیادہ موزوں تھا۔

(۷) 'پہلوٹھے بیٹے کی قربانی' ایک دینی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔

حواشی باب اول

1. The Bible (KJV), Gen. 22:1-18.

۲ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو سوختنی قربانی کے طور پر پیش کرنے کے لیے لے جا رہے تھے۔ یہ بات کہ وہ وہاں عبادت کے لیے جا رہے تھے، درست نہیں ہے، تاہم اگر 'عبادت' سے یہاں 'قربانی' مراد لی جائے تو یہ کہنا صریحاً غلط ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام خود اور یہ لڑکا ان (دو جوانوں) کے پاس واپس آ جائیں گے۔ وہ اپنے 'اکلوتے بیٹے' کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی غرض سے لے جا رہے تھے، اس لیے واپسی پر وہ اور ان کا یہ لڑکا اکٹھے تو کسی صورت نہ آ سکتے تھے۔ جب بیٹا قربان ہونا تھا تو ظاہر ہے واپس تو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی آ سکتے تھے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جھوٹ نہیں بول رہے تھے اور انھیں اس بات کی پیشگی اطلاع تھی کہ اس لڑکے کی جگہ قربانی کے لیے ایک برّہ مہیا کر دیا جائے گا تو پھر نام نہاد قربانی کا یہ سارا ڈراما بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے اور 'آزمائش' والی یہ بات سراسر بے معنی اور فضول قرار پاتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کہانی کا یہ حصہ جعلی ہے، کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے عظیم الشان پیغمبر کو ایک جھوٹے اور دھوکے باز انسان کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ یہ بات ایک نبی کے منصب کے کسی طرح بھی شایان شان نہیں۔ جو شخص سچا، دیانت دار اور قابل اعتماد نہ ہو، اسے نبی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

۳ یہ بات بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کے کردار سے مطابقت نہیں رکھتی کہ لکڑیوں کا بھاری گٹھا تو اپنے فرزند کے ناتواں کندھوں پر لاد دیں، حالاں کہ اسے ابھی ابھی اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی کے لیے پیش کیا جانا ہے۔ یہ صریحاً بے رحمی ہے۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ ایسا کرتے۔ اس طرح کہانی کا یہ حصہ کسی طرح قابل اعتبار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴ یہاں پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات درست نہیں ہو سکتی کہ 'خدا آپ ہی اپنے واسطے سوختنی قربانی کے لیے برّہ مُہیا کر لے گا'۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا

تھا اور وہ اسی مقصد کے لیے جا بھی رہے تھے۔ انھیں اس بات کا قبل از وقت علم نہ تھا کہ ان کے بیٹے کی جگہ قربانی کے لیے ایک برّہ مہیا کر دیا جائے گا، وگرنہ تو 'آزمایش' کا یہ سارا عمل ایک ڈراما قرار پاتا اور اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ اس صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول کہ 'خدا آپ ہی اپنے واسطے سوختنی قُربانی کے لیے برّہ مُہیا کرے گا' درست نہیں، جو ناقابل یقین ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بعد کے کسی مؤلف کا اضافہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اس طرح کی جھوٹی طفل تسلیوں کے ذریعے سے اپنے بیٹے کو بہلانے کی کوشش کریں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہانی کا یہ حصہ بھی کسی بعد کے مؤلف کا طبع زاد ہے۔

۵ یہ بات کہ 'چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے' صریحاً ایک ایسا اضافہ ہے جو ممکن ہے کہ اس واقعہ کے رونما ہونے کے صدیوں بعد کسی مؤلف نے کیا ہو۔ بعض مفسرین اس اضافے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں، مثلاً:

This name, Moses adds, gave birth to the proverb, 'In the Mount of Jehovah it shall be seen.' [*7th Day Adventist Bible Com.*, ed. Francis D. Nichol et al. (Hagerstown: Review & Herald Publishing Association, 1978), 1:353].

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کا اضافہ کر دیا کہ اس نام کی وجہ سے یہ کہاوت مشہور ہو گئی ہے کہ 'خُداوند کے پہاڑ پر مُہیا کیا جائے گا'۔

لیکن اب کوئی ثقہ عالم تورات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف قرار نہیں دیتا، کیونکہ یہ تو ان کے قریباً پانچ سو سال بعد ضبطِ تحریر میں لائی گئی تھی۔

۶ سیاق وسباق کا تقاضا ہے کہ بائبل کی یہ عبارت:

'چونکہ تُو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے، دریغ نہ رکھا، اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دُوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دُوں گا'

اس بیٹے سے متعلق قرار دی جائے جس کا یہاں ذکر ہوا ہے اور جسے ابھی ابھی حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کے لیے پیش کیا تھا۔ تاہم جب 'تیری نسل' کے الفاظ کا اس طرح مطلقاً استعمال کیا جائے تو ان کا

اطلاق ان کی نسل کے دوسرے لوگوں پر بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن اس میں حضرت اسماعیلؑ اور ان کی اولاد ترجیحی طور پر شامل ہوگی۔ اس طرح نسلِ اسماعیل علیہ السلام 'برکت' اور 'اضافہ' کے وعدے میں لازماً شامل قرار پائے گی۔

ے اس کا حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل پر اطلاق ممکن نہیں۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ ان کے متعلق یہ کہا جائے کہ 'تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی'، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو اپنے صد سالہ عہدِ متحدہ مملکت کی مختصر سی مدت کے سوا اپنی تاریخ کے کسی دور میں اپنے پھاٹکوں کی حتیٰ کہ ہیکل سلیمانی کی عمارت کی بھی حفاظت نہ کرسکی۔

۸ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے، وہ صرف اپنے آپ ہی کو اللہ تعالیٰ کی لاڈلی اور منتخب قوم قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں بائبل کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

۱۔ دنیا کے سب گھرانوں میں سے میں نے صرف تم کو برگزیدہ کیا ہے۔ (عاموس ۳:۲)

۲۔ کیونکہ تو خداوند اپنے خدا کی مقدس قوم ہے اور خداوند نے تجھ کو روئے زمین کی اور سب قوموں میں سے چن لیا ہے تاکہ تو اس کی خاص قوم ٹھہرے۔ (استثنا ۱۴:۲)

۳۔ اور جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے شکست دلائے اور تو ان کو مار لے تو تُو ان کو بالکل نابود کر ڈالنا۔ تُو ان سے کوئی عہد نہ باندھنا اور نہ ان پر رحم کرنا۔ تو ان سے بیاہ شادی بھی نہ کرنا۔ نہ ان کے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا اور نہ اپنے بیٹوں کے لیے ان کی بیٹیاں لینا کیونکہ وہ تیرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کردیں گے تاکہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں۔ (...) کیونکہ تو خداوند اپنے خدا کے لیے ایک مقدس قوم ہے۔ خداوند تیرے خدا نے تجھ کو روئے زمین کی اور سب قوموں میں سے چن لیا ہے تاکہ اس کی خاص امت ٹھہرے خداوند نے جو تم سے محبت کی اور تم کو چن لیا تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ تم شمار میں اور قوموں سے زیادہ تھے کیونکہ تم سب قوموں سے شمار میں کم تھے۔ بلکہ چونکہ خداوند کو تم سے محبت ہے اور وہ اس قسم کو جو اس نے تمہارے باپ دادا سے کھائی پورا کرنا چاہتا تھا اس لیے خداوند تم کو اپنے زور آور ہاتھ سے نکال لایا اور غلامی کے گھر یعنی مصر کے بادشاہ فرعون کے ہاتھ سے تم کو خلاصی بخشی۔ سو جان لے کہ خداوند تیرا خدا وہی خدا ہے۔ وہ وفادار خدا ہے اور جو اس سے محبت رکھتے ہیں اور اس کے حکموں کو مانتے ہیں ان کے ساتھ ہزار پشت تک وہ اپنے عہد کو قائم رکھتا اور ان پر رحم کرتا ہے۔

(...)۔ اور [وہ] تجھ سے محبت رکھے گا اور تجھ کو برکت دے گا اور بڑھائے گا اور اس ملک میں جسے تجھ کو دینے کی قسم اس نے تیرے باپ دادا سے کھائی، وہ تیری اولاد پر اور تیری زمین کی پیداوار یعنی تیرے غلہ اور مے اور تیل پر اور تیرے گائے، بیل کے اور بھیڑ بکریوں کے بچوں پر برکت نازل کرے گا۔ تجھ کو سب قوموں سے زیادہ برکت دی جائے گی اور تم میں یا تمھارے چوپایوں میں نہ تو کوئی عقیم ہوگا نہ بانجھ [یہ وعدہ صریحاً خلاف حقیقت ہے، کیونکہ یہودیوں میں سے ایسے ہزاروں لوگ ہوئے ہوں گے جو بانجھ تھے یا ان کے مویشی بانجھ تھے]۔ اور خداوند ہر قسم کی بیماری تجھ سے دور کرے گا اور مصر کے ان برے روگوں کو جن سے تو واقف ہے تجھ کو لگنے نہ دے گا۔ بلکہ ان کو ان پر جو تجھ سے عداوت رکھتے ہیں نازل کرے گا [یہ بھی خوش اعتقادی پر مبنی ایک خواہش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور زمینی حقائق کے بھی خلاف ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان نام نہاد 'خداوند کے لوگوں' کی ذہنیت کیا تھی]۔ اور تو ان سب قوموں کو جن کو خداوند تیرا خدا تیرے قابو میں کر دے گا نابود کر ڈالنا۔ تو ان پر ترس نہ کھانا [کیسے بدنصیب ہوں گے وہ بے چارے لوگ جو شامت اعمال سے خدا کی اس 'چنی ہوئی قوم' کے ہتھے چڑھ جائیں]: (...) اور خداوند تیرا خدا ان قوموں کو تیرے آگے سے تھوڑا تھوڑا کر کے دفع کرے گا۔ تو ایک ہی دم ان کو ہلاک نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ جنگلی درندے بڑھ کر تجھ پر حملہ کرنے لگیں۔ بلکہ خداوند تیرا خدا ان کو تیرے حوالے کرے گا اور ان کو ایسی شکست فاش دے گا کہ وہ نابود ہو جائیں گے (استثنا ۷: ۲-۴ الف، ۶-۱۰، ۱۳-۱۶، ۲۲-۲۴)۔

جیوئش انسائیکلوپیڈیا، ۴: ۴۵ پر بائبل کی کتاب استثنا ۱۴: ۲ (R.V.) سے نقل کیا گیا ہے:

Thou art an holy people unto the Lord thy God, and the Lord hath chosen thee to be a peculiar people unto himself, above all peoples that are upon the face of the earth.

تو خداوند اپنے خدا کے نزدیک ایک مقدس قوم ہے اور خداوند نے تجھے روئے زمین کی تمام قوموں کے مقابلے میں اپنے لیے ایک مخصوص قوم کے طور پر چن لیا ہے۔

جیوئش انسائیکلوپیڈیا، ۴: ۴۵ پر 'Mek. Yitro, Pes. R. K. 103b, 186a, 200a' کے حوالے سے مزید بیان کیا گیا ہے:

The Lord offerd the Law to all nations; but all refused to accept it except Israel.

خداوند نے قانون تمام قوموں کو پیش کیا، لیکن اسرائیل کے سوا سب نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یہودی عملی طور پر اسے اپنے لیے امتیازی وجہ افتخار سمجھتے ہیں۔ یہ بات ان کے درمیان ایک مسلسل روایت کی حیثیت رکھتی ہے۔اس طرح یہ بات کہ'اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی' یہود پر کسی طرح صادق نہیں آتی۔اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی پوری نسل، جو بنی اسرائیل یا یہود کے نام سے معروف ہے، کی تاریخ اس بات کی نفی کرتی ہے۔مندرجہ بالا اقتباسات کے حوالے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روے زمین کی تمام قومیں حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل، یعنی یہود کے وسیلے سے کسی طرح بھی برکت حاصل نہیں کر سکتیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہود کا وجود روے زمین کی تمام قوموں کے لیے مُوجب تکلیف ولعنت ہے۔اس کے برعکس حضرت اسماعیل علیہ السلام، جنھیں قربانی کے لیے پیش کیا گیا تھا، ہی وہ ذات ہیں جن کی نسل کے ذریعے سے روے زمین کی تمام قومیں فیض یاب ہوئی ہیں۔

9 کتاب مقدس، پیدایش،۲۲: ۱-۱۸، بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور،۲۰۰۲ء۔
10- *Enc. Biblica*, Ed. T.K. Cheyne, (London: Watts and co.), 2:2175,7.

باب دوم

حضرت ابراہیمؑ کو اپنا اکلوتا بیٹا قربان کرنے کا حکم دیا گیا تھا

بائبل واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ جس بیٹے کی قربانی درکار تھی، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا 'اکلوتا بیٹا' تھا۔ یہ ایک بہت اہم اور مرکزی نکتہ ہے۔ اسے نہ نظر انداز کیا جانا چاہیے اور نہ بے وزن سمجھنا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلوٹے اور سب سے بڑے فرزند[1] حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ 'اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا'۔

بائبل میں درج ہے:

> اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی (...) اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے[2] (...)۔ اور ابرام سے ہاجرہ کے ایک بیٹا ہوا اور ابرام نے اپنے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ سے پیدا ہوا اسماعیل رکھا اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔[3]

لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو وہ ایک سو سال کے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام چودہ سال کے ہو چکے تھے۔ بائبل کا بیان ہے:

> اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے سو اس کو ساری نہ پکارنا۔ اس کا نام سارہ

ہوگا۔ اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا۔ یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ قومیں اس کی نسل سے ہوں گی اور عالم کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے۔ تب ابرہام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ کیا سو برس کے بڈھے سے کوئی بچہ ہوگا اور کیا سارہ کے جو نوے برس کی ہے اولاد ہوگی؟ اور ابرہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔[۴]

اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔[۵]

اس طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام چودہ (۱۴) سال کی عمر کو پہنچنے تک 'حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے' کی حیثیت رکھتے تھے۔

اگر بائبل کی متعلقہ عبارت کا، جو اس کتاب کے شروع میں دی گئی ہے، دوبارہ مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ اس لڑکے کے وصف کے طور پر جسے قربانی کے لیے پیش کیا جانا تھا، تین مرتبہ استعمال کیے ہیں، لیکن اُس نے اپنی تمام گفتگو میں اس بیٹے کا نام 'اسحاق' صرف ایک دفعہ لیا ہے۔ اگر ان الفاظ کو نظر انداز کر دیا جائے جو کہانی نویس یا ایڈیٹر نے بیانیہ مکمل کرنے کے لیے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں، تو وہ الفاظ جو عبارت میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، حسب ذیل بنتے ہیں:

Abraham: (...) Take now thy son, thine only son Isaac, whom thou lovest, and get thee into the land of Moriah; and offer him there for a burnt offering upon one of the mountains which I will tell thee of. (...) Abraham, Abraham: Lay not thine hand upon the lad, neither do thou any thing upon him: for now I know that thou fearest God, seeing thou hast not withheld thy son, thine only son from me. (...), By myself have I sworn, (...), for because thou hast done this thing, and hast not withheld thy son, thine only son: That in blessing I will bless thee, and in multiplying I will multiply thy seed as the stars of the heaven, and as the sand which is upon the sea shore; and thy seed shall possess the gate of his enemies; And in thy seed shall all the nations of the earth be blessed; because thou hast obeyed my voice.

ابرہام: (...) اب اپنے بیٹے، اپنے اکلوتے بیٹے اسحاق کو جس سے تو محبت کرتا ہے، لے اور تو موریاہ کی سرزمین میں جا، اور اسے ان پہاڑوں میں سے ایک پر جو میں تجھے بتاؤں گا ایک سوختنی

قربانی کے طور پر پیش کر۔ (...) ابرہام، ابرہام، اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ ڈال، نہ تو اس پر کوئی چیز کر۔ کیونکہ اب یہ دیکھ کر کہ تو نے اپنا بیٹا، اپنا اکلوتا بیٹا مجھ سے نہیں روکا ہے (یعنی مجھ سے بچا کر نہیں رکھا ہے)، میں جان گیا ہوں کہ تو خداوند سے ڈرتا ہے۔ (...) میں اپنی ذات کی قسم کھاتا ہوں (...) کیونکہ تو نے یہ چیز کی ہے اور اپنے بیٹے، اپنے اکلوتے بیٹے کو مجھ سے بچا کر نہیں رکھا: میں تجھے برکت میں برکت دوں گا اور بڑھانے میں مَیں تیری نسل کو آسمان کے تاروں کی مانند اور اس ریت کی مانند جو ساحل سمندر پر ہے، بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے صدر دروازے پر قبضہ کرے گی اور تیری نسل میں زمین کی تمام قومیں برکت پائیں گی۔ کیونکہ تو نے میری آواز کی پیروی کی ہے۔

یہاں اس بیٹے کا، جسے قربانی کے لیے پیش کرنا تھا، اس طرح ذکر ہوا ہے:

۱۔ تین مرتبہ Whom اور Him کی ضمیروں کے ساتھ۔ (اگر) اس عبارت میں سے اسحاق کے لفظ کا اضافہ نظر انداز کر دیا جائے تو ان ضمیروں کے ذریعے سے اس بات کا یقینی علم ممکن نہیں کہ یہاں کون سا بیٹا مراد ہے۔

۲۔ ایک مرتبہ لفظ 'لڑکا' کے ساتھ (اس سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان دو بیٹوں میں سے وہ 'لڑکا' کون تھا)۔

۳۔ تین مرتبہ 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ میں (ظاہر ہے کہ یہ لڑکا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا، کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو ان کی زندگی کے کسی مرحلے میں بھی 'تیرا اکلوتا بیٹا' نہیں کہا جاسکتا تھا)۔

یہاں لفظ 'اسحاق' صرف ایک مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور وہ اس جگہ جہاں 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ پہلی مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ کوئی قاری، جو معمولی سا بھی ادبی ذوق رکھتا ہو اور اس کے ساتھ معروضی، غیر متعصب اور آزاد سوچ کا بھی مالک ہو، اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ لفظ 'اسحاق' اس جگہ بالکل فالتو، غیر متعلق اور بے محل ہے۔ اگر وہ لڑکا، جو قربانی کے لیے درکار تھا، اسحاق ہوتا تو صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ 'اپنے بیٹے اسحاق کو لو'۔ اللہ تعالیٰ 'تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ ہرگز استعمال نہ کرتا، کیونکہ یہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے حق میں بہر صورت ایک جھوٹی بات ہے

اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ جھوٹی بات کرے۔ 'تیرا اکلوتا بیٹا' اور 'اسحاق' ایک واحد وجود کے لیے یک جا استعمال نہیں ہو سکتے، کیونکہ واقعاتی لحاظ سے وہ ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ الفاظ کے استعمال اور ان کی ترکیب سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اصل میں جس کی قربانی درکار تھی وہ 'اکلوتا بیٹا' تھا۔ اور قربان کیے جانے والے بیٹے کی امتیازی خصوصیت اس کا اکلوتا پن تھا جو اس کی نمایاں طور پر ایک پیشگی شرط تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 'تیرا اکلوتا بیٹا' جو اس عبارت میں تین مرتبہ استعمال ہوا ہے، وہ دو مرتبہ 'اسحاق' کے بغیر آزادانہ حیثیت میں استعمال ہوا ہے۔ اور صرف ایک مرتبہ 'اسحاق' کے ساتھ آیا ہے۔ 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ کی ساخت بغیر کسی شک وشبہ کے یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ زور اولاً 'بیٹے کے اکلوتے پن' پر ہے، جس سے کہنے والے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلوبہ بیٹا اکلوتا بیٹا ہے۔ اور یہ زور ثانیاً وضاحتی ضمیر 'تیرا' پر ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو بیٹا قربانی کے لیے مطلوب ہے، وہ 'اے ابراہیم تمھارا بیٹا ہے اور وہ صرف تمھارا ہی اکلوتا بیٹا ہے (نہ کہ تمھاری بیوی کا اکلوتا بیٹا)'۔ اگر اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہوتا کہ قربانی کے لیے حضرت اسحاق علیہ السلام کا پیش کیا جانا مطلوب تھا تو وہ بلا تردُّد اعلان کرتا 'سارہ کا اکلوتا بیٹا' یا 'تمھارا سارہ سے اکلوتا بیٹا'، اور وہ کسی حالت میں بھی یہ نہ کہتا کہ 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا'۔ اس طرح تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی الجھن پیدا ہوتی ہے اور بعد کے آنے والے ادوار میں پوری مذہبی دنیا کے لیے بھی۔ لفظِ 'اسحاق' کا ایسے بھونڈے اور متناقض انداز میں استعمال چغلی کھاتا ہے کہ اس مقام پر کسی نادان مؤلف نے صریحاً بے جوڑ انداز میں کوئی تحریف کی ہے۔

محترم قاری سے التماس ہے کہ وہ یہاں بائبل کی متعلقہ عبارت کو ایک مرتبہ پھر پوری توجہ کے ساتھ اور تمام ذہنی تحفظات سے بالاتر ہو کر پڑھے۔ عبارت کی روانی متکلم کا منشا اور ارادہ پوری طرح واضح کر رہی ہے اور اس میں کسی ابہام کی کوئی گنجایش نہیں۔ متکلم (اللہ تعالیٰ) پوری عبارت میں قربانی کے لیے مطلوب فرزند کے لیے 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ استعمال کر رہا ہے اور کسی جگہ بھی اس کے لیے 'تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ کے بغیر محض 'تیرا بیٹا' کے الفاظ استعمال نہیں کر رہا،

تا کہ کسی جگہ مخاطب کے لیے غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔ 'تیرا اکلوتا بیٹا' اور 'اسحاق' صریح طور پر ایک دوسرے کے متضاد و متناقض الفاظ ہیں اور انھیں یکجا استعمال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اسحاق زندگی کے کسی مرحلے میں بھی 'اکلوتا بیٹا' نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کے لیے 'اکلوتا بیٹا' کے الفاظ استعمال نہیں کیے (البتہ قصے کے راوی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ایک جگہ اپنے ذبیح بیٹے کے لیے 'میرا بیٹا اسحاق' کے الفاظ بھی استعمال کرائے ہیں)۔ مختلف مقامات میں سے صرف ایک جگہ مؤلف کتاب نے اللہ تعالیٰ سے 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ کے ساتھ 'اسحاق' کا لفظ کہلوایا ہے، لیکن سیاق وسباق سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کسی مدوِّن کا بعد کا اضافہ ہے۔ یہودیوں کی اس روش کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ وہ 'دینی ضرورت' کے تحت بائبل کی عبارت میں حذف واضافہ یا تبدیلی کا آزادانہ ارتکاب کرتے تھے اور اس بات میں کوئی برائی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ نسل اسحاق علیہ السلام کو ایک برتر اور چنی ہوئی قوم ثابت کرنا ان کی 'دینی ضرورت' تھی۔ اس کے بعد یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آنی چاہیے کہ کسی 'نیک اور پارسا' ربی نے پوری معصومیت سے جہاں پہلی مرتبہ 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ دیکھے ہوں، وہاں فی البدیہہ اپنے 'Wishful Preconception' کے تحت 'اسحاق' کا لفظ وضاحت کے طور پر لکھ دیا ہو، جسے بعد کے ناقلین نے مفید مطلب سمجھ کر یا معصومانہ غلط فہمی سے اصل عبارت میں شامل کر لیا ہو۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بائبل یہ دعویٰ کرتی ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یہ صریحاً تحریف ہے، یا جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا نے لکھا ہے[6]، جس کا اوپر ایک اقتباس میں ذکر ہے، یہ تبدیلی کے زمرے میں آتا ہے۔ بائبل کے علماء و مفسرین نے اس بات کا ادراک کر لیا تھا کہ یہاں ضرور کوئی گڑبڑ کی گئی ہے[7]۔ انھیں اخلاقی جرأت سے کام لے کر اس غلطی کی اصلاح کر دینی چاہیے تھی، یا پھر کم از کم وہ اس کی نشاندہی ہی کر دیتے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ یہ سمجھ لینے کے باوجود کہ یہاں بائبل کے مؤلف نے صریحاً کوئی گڑبڑ یا اضافہ کیا ہے، وہ

بڑے شوق سے اس کے ساتھ چمٹے رہے۔ میتھیو ہنری (Matthew Henry) نے اپنی تفسیرِ بائبل میں اس ترجمہ میں 'Only' کے ساتھ 'One' کا اضافہ کر کے اس میں ترمیم و اصلاح کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

That son whom thou lovest. It was a trial of Abraham's love to God, and therefore it must be in a beloved son, and that string must be touched most upon: in the Hebrew it is expressed more emphatically, and, I think, might very well be read thus, Take now that son of thine, that only one of thine, whom thou lovest, that Isaac. [8]

'وہ بیٹا جس سے تو محبت کرتا ہے': یہ ابرہام کی خداوند کے ساتھ محبت کا امتحان تھا اور اس لیے اسے ایک پیارے بیٹے ہی کی صورت میں ہونا چاہیے تھا۔ اور اس روح کو پوری طرح پیش نظر رکھنا چاہیے۔ عبرانی میں اسے زیادہ زور دے کر بیان کیا گیا ہے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ اسے یوں پڑھنا زیادہ بہتر ہوگا: 'اپنے اس بیٹے' کو لے، اس کو جو تیرا ایک ہی اکلوتا بیٹا ہے، جس سے تو محبت کرتا ہے، وہی اسحاق۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح ترجمے کے لیے 'صرف ایک' کے وصفی الفاظ استعمال کیے جانے چاہییں تھے نہ کہ صرف 'Only' 'یعنی' اکلوتا' کے۔ اگر میتھیو ہنری کے مجوزہ ترجمے کو اختیار کر بھی لیا جائے تو بھی مفہوم وہی رہتا ہے۔ صحیح ترجمہ 'یعنی' وہ تیرا ایک ہی اکلوتا' کا یقینی مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس وقت صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ اور ابھی تک ان کے ہاں کوئی دوسرا بیٹا پیدا نہ ہوا تھا۔ سیدھی سی بات ہے کہ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ جب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'ایک' اور 'اکلوتے' بیٹے تھے۔ اور اس وقت تک حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر چودہ سال ہو چکی تھی۔

بائبل کے علما نے لفظ کے حقیقی مفہوم سے گریز کی سعیِ لاحاصل کی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ لفظ 'اکلوتا' کا مطالعہ کیا جائے۔ عبرانی بائبل میں 'اکلوتا' کے لیے 'یحید' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

'یحید' کے معنی ہیں: 'ایک ہی، تنہا، اکیلا (بچہ یا بیٹا)، تنہائی میں (سٹرونگز ڈکشنری ۴۹، اندارج نمبر ۳۱۷۳، عہدنامہ قدیم کی عبرانی و آرامی لغات، برل، ۲۰۰۱ء، ص ۴۰۶)'۔ اس کے علاوہ بائبل کے سارے عہدنامہ قدیم میں یہ لفظ صرف مندرجہ ذیل چار مقامات پر استعمال ہوا ہے:

کیونکہ میں بھی اپنے باپ کا بیٹا تھا اور اپنی ماں کی نگاہ میں نازک اور اکیلا لاڈلا۔ (امثال ۴:۳)

اپنے اکلوتوں پر ماتم اور دلخراش نوحہ کر۔ (یرمیاہ ۶:۲۶)

(...) اور ایسا ماتم برپا کروں گا جیسا اکلوتے بیٹے پر ہوتا ہے۔ (عاموس ۸:۱۰)

جیسا [ماتم] کوئی اپنے اکلوتے کے لیے کرتا ہے۔ (زکریاہ ۱۲:۱۰)

ان تمام مقامات پر اس کا ترجمہ صرف لفظ 'اکیلا یا اکلوتا' ہی سے کیا جا سکتا ہے اور سیاق و سباق میں کوئی دوسرے معنی مناسب معلوم نہیں ہوتے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ بائبل 'یحید' کا لفظ صرف 'اکیلا یا اکلوتا' ہی کے مفہوم میں استعمال کرتی ہے اور بائبل کے محاورے اور سیاق و سباق کے مطابق اس لفظ کو کوئی اور معنی نہیں دیے جا سکتے۔

بائبل کے بعض مفسرین نے اس جعل سازی کی توجیہ کے لیے مضحکہ خیز توضیحات پیش کی ہیں۔ شلوموبیتشاکی، سلیمان بن اسحاق نامی ایک مشہور فرانسیسی نژاد یہودی ربی نے، جسے عام طور پر راشی (۱۰۴۰ء–۱۱۰۵ء) کہا جاتا ہے، اپنی تفسیر تورات میں اس موضوع پر کچھ دلچسپ ملاحظات لکھے ہیں۔ اس نے اس واقعے کو ایک تخیلاتی گفتگو کی شکل دے دی ہے اور ایک سادہ سے بیان کو اپنے مزعومات و تصورات کے رنگ میں ڈھالنے اور من پسند انداز میں توڑ مروڑ کر اس کی تاویل کرنے کی مہارت کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا ہے۔ اس اقتباس پر بالعموم کتاب کے متن کے اندر تبصرہ نہیں کیا گیا۔ اس کے بجائے حواشی میں موقع ہی پر تبصرے درج کر دیے گئے ہیں، خواہ وہ قدرے طویل ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں۔ راشی لکھتا ہے:

thy son. 'But I have two sons,' Abraham said. 'Thine only son,' was the reply. 'But each is the only one of his mother!' 'Whom thou lovest,' he was told. 'But I love both!' and the answer came 'Even Isaac.' Why did not God

name Isaac at once? Lest Abraham's mind reeled under the sudden shock. Further, to make His command more precious to him. And finally, that he might receive a reward for every word spoken.[10]

'تیرا بیٹا'۔ ابراہیم نے کہا: 'لیکن میرے تو دو بیٹے ہیں'۔[11] جواب تھا: 'تیرا اکلوتا بیٹا'۔[12] 'لیکن (ان میں سے) ہر کوئی اپنی ماں کا اکلوتا ہے'۔[13] اسے بتایا گیا: 'جس سے تو محبت کرتا ہے'۔[14] 'لیکن میں تو دونوں سے محبت کرتا ہوں'۔[15] اور جواب آیا: 'اسحاق ہی'۔[16] خداوند نے پہلی ہی دفعہ میں اسحاق کا نام کیوں نہ لیا؟[17] کہیں ابراہیم کا ذہن اچانک صدمے کے تحت چکرا نہ جائے۔[18] مزید اس لیے کہ اس (خدا) کا حکم اس (ابراہیم) کے لیے قابلِ قدر بن جائے۔[19] اور آخری بات یہ کہ اسے ہر اس لفظ کا اجرو ثواب مل سکے جو اس نے ادا کیا۔

اس معاملے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ 'تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت تک کوئی دوسرا بیٹا (حتیٰ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام بھی) پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی اس وقت پیش کی ہوگی جبکہ وہ قریباً تیرہ سال کے تھے، کیونکہ جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو اس وقت تک حضرت اسماعیل علیہ السلام چودہ سال کے ہو چکے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'اکلوتے بیٹے' ہونے کی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔

اس دوسرے بیان کے مضامین کے اعادے کے طور پر ذیل میں اس کے چند اہم نکات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو واضح طور پر 'اپنے بیٹے، اپنے اکلوتے بیٹے' کی قربانی پیش کرنے کا حکم دیا تھا نہ کہ اپنے 'کسی' یا 'ایک' بیٹے کی قربانی کا۔

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلوٹے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور وہ اس وقت پیدا ہوئے تھے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال کی تھی۔

۳۔ حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے تھے اور وہ اس وقت پیدا

ہوئے تھے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سو سال کے تھے۔

۴۔ اس طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام قریباً چودہ سال کی عمر تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'اکلوتے بیٹے' رہے۔ اس تمام عرصے کے دوران میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوئی دوسرا بیٹا نہیں تھا، کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام تو اس وقت پیدا ہوئے تھے، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام قریباً چودہ سال کے ہو چکے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے 'اکلوتے بیٹے' کو قربانی کے لیے پیش کیا، اس وقت تک تو حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا 'اکلوتا بیٹا' قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ پوری بائبل میں کسی جگہ بھی یہ بات موجود نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت سارہ کا 'اکلوتا بیٹا' قربان کرنے کا حکم دیا ہو۔ یہ تو بائبل کے مفسرین کی محض کھینچا تانی ہے کہ وہ اس طرح کا بے سروپا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

۶۔ جیسا کہ اوپر درج ہوا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا نے وثوق سے دعویٰ کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے 'اکلوتے بیٹے' کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی کہانی قابل لحاظ حد تک متعدد مرتبہ کئی مقامات پر تحریف و تبدیلی کا ہدف بنی ہے۔ اس طرح 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے ساتھ 'اسحاق ہی' کا اضافہ صریحاً کتاب کے مؤلف کی ترمیم و تحریف کی ایک بھونڈی مثال ہے۔

۷۔ جس 'اکلوتے بیٹے' کو قربانی کے لیے پیش کیا جانا مطلوب تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صرف اکلوتا ہی نہیں، بلکہ لاڈلا اور پیارا بیٹا بھی تھا اور 'آزمایش' کو کمال تک پہنچانے کے لیے ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ اس موضوع پر کتاب ہذا کے ایک مستقل باب میں الگ سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے (ملاحظہ کیجیے باب چہارم)۔

۸۔ جس بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کیا جانا درکار تھا، وہ ایک 'لڑکا' تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی بالغ نہیں ہوا تھا، بلکہ قریباً تیرہ چودہ سال کا تھا، لیکن بائبل کے مفسرین کے مطابق جب حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی کے لیے پیش کیا گیا تو وہ قریباً دو تین سال کے بچے تھے اور ان کا حال ہی میں

دودھ چھڑایا گیا تھا، یا پھر وہ بیس سے لے کر سینتیس سال تک کے جوان آدمی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو جب نام نہاد قربانی کے لیے پیش کیا گیا تو وہ 'لڑکے' نہ تھے، جبکہ بائبل قربانی کے لیے پیش کیے جانے والے بیٹے کے لیے 'لڑکے' کا لفظ استعمال کرتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ ایک صریح غلطی ہے، یہ بات خصوصی توجہ کی طالب ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی اپنے باپ کے 'اکلوتے بیٹے' نہیں رہے۔

حواشی باب دُوم

1-*The Jewish Enc.*, Ed. Isidore Singer (KTAV Publishing House, Inc., USA), 6:647.

2۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ ہاجرہ سارہ کی باندی یا کنیز تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک شہزادی تھیں اور اس مصری بادشاہ کی بیٹی تھیں، جس نے انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی سارہ کی خدمت کے لیے پیش کیا تھا تا کہ وہ ایک پاکیزہ ماحول میں پرورش پائیں۔ یہاں بائبل کے مؤلفین نے انھیں جان بوجھ کر لونڈی یا باندی کے طور پر پیش کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے:

That Hagar appears as a slave-woman is a necessary consequence of the theory on which the Hebrew myth is based, the notion being that Ishma'el was of inferior origin. (*Enc. Biblica*, Column 1933).

یہ بات کہ ہاجرہ کو ایک لونڈی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، عبرانی روایت پر مبنی نظریے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور وہ نظریہ یہ ہے کہ اسماعیل ایک فروتر نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہاجرہ کو لونڈی اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام سے فروتر ثابت کیا جائے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہاجرہ ایک مصری شہزادی تھیں، جیسا کہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

According to Midrash (Gen. R xiv.), Hagar was the daughter of Phraoh, who, seeing what great miracles God had done for Sarah's sake (Gen.xii, 17), said: "It is better for Hagar to be a slave in Sarah's house than mistress in her own." In this sense Hagar's name is interpreted as "reward" ("Ha-Agar" = "this is reward"). (...). Hagar is held up as an example of the high degree of godliness prevalent in Abraham's time, (...). Her fidelity is praised, for even after Abraham sent her away she kept her marriage vow, (...). Another explanation of the same name is "to adorn," because she was adorned with piety and good deeds (l.c). (*Jewish Enc.*, 6:138).

مدراش کے بیان کے مطابق ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھی۔ جب فرعون نے یہ دیکھا کہ سارہ کے لیے اللہ تعالی

نے کیسے عظیم معجزات صادر فرمائے ہیں تو اس نے کہا: 'ہاجرہ کے لیے یہ بات زیادہ اچھی ہے کہ وہ سارہ کے گھر میں لونڈی بن کر چلی جائے، بہ نسبت اس بات کے کہ وہ اپنے گھر میں مالکہ کی حیثیت سے رہے۔' اس مفہوم کے اعتبار سے ہاجرہ کے نام کا ترجمہ 'اجر یا انعام' (ھا اجر یعنی یہ اجر ہے) کیا جاتا ہے۔(...)۔ہاجرہ کو ابراہیم کے دور میں رائج نیکی و پارسائی کے اعلیٰ درجے کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔(...)۔اس کی وفاداری کی تعریف کی گئی ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ ابراہیم نے اسے اپنے گھر سے دور کر دیا تھا لیکن پھر بھی اس نے ابراہیم کے ساتھ اپنی شادی کے بندھن کو برقرار رکھا۔(...)۔اس نام (ہاجرہ) کی ایک اور توضیح ہے 'سجانا'۔ کیونکہ اسے نیکی و پارسائی اور اعمالِ صالحہ سے مزین کیا گیا تھا۔

ایچ ای رائل نے بھی اپنے مضمون 'ہاجرہ' میں یہی رائے بیان کی ہے:

Rashi, in his commentary on 6:1, records the belief that Hagar was a daughter of Pharaoh, who, after seeing the wonders that had been done for Sarah, declared that it was better for his daughter to be a bondservant in the house of Abraham than a mistress in the palace of another. (J. Hastings, *Dic. of Bible*, 2:278.)

راشی نے اپنی تفسیر (۱:۶) میں یہ عقیدہ درج کیا ہے کہ ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھی۔ فرعون نے یہ دیکھ کر کہ سارہ کے لیے کیسے عجیب و غریب معجزات صادر ہوئے ہیں، یہ اعلان کیا کہ اس کی بیٹی کے لیے ابراہیمؑ کے گھر میں لونڈی کی حیثیت سے رہنا اس بات سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ کسی اور کے محل میں ملکہ بن کر رہے۔

۳ پیدائش ۱۶:۱،۳،۱۵،۱۶۔

۴ بائبل (NASB) پیدائش ۱۷:۱۵-۱۸۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے شدید محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

۵ پیدائش ۲۱:۵۔

۶ ملاحظہ کیجیے باب اول میں 'بائبل کے اس قصے کی حیثیت'۔

۷ بلاشبہ ان مفسرین میں سے بعض نے کسی نہ کسی انداز میں اس غلطی کی نشاندہی کی ہے، مثلاً '*The Works of Flavius Josephus*' کا مترجم ولیم وسٹن 'Isaac, as being his only-begotton' پر اپنے حاشیے میں لکھتا ہے:

Note, that both here and Heb. xi. and 17. Isaac is called Abraham's only-begotten son, though he at the same time had another son, Ishmael. The

Septuagint expresses the true meaning, by rendering the text the beloved son.' (*The Works of Flavius Josephus*, Tr by W. Whiston, Boston, D Lothrop & Co., na., footnote 1 on ch. XIII, paragraph 1, p. 42).

ملاحظہ کیجیے کہ یہاں اور عبرانیون ۱۱: ۱۷، میں دونوں جگہ اسحاق کو ابراہیم کا 'اکلوتا بیٹا' کہا گیا ہے، حالانکہ اس وقت ان کا ایک دوسرا بیٹا اسماعیل بھی موجود تھا۔ ہفتادی ترجمے میں اس کے [بزعم خویش] صحیح معنی درج ہیں اور اس نے متن کا ترجمہ 'پیارا بیٹا' کے الفاظ میں کیا ہے۔

حقیقت میں 'rendering the text the beloved son' والا جملہ ایک من گھڑت بات ہے جس کی کوئی لغوی بنیاد نہیں۔ کسی لفظ کا اپنے مزعومات کی تسکین یا ناپسندیدہ صورت حال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس طرح کا ترجمہ کرنا تحریف ہی کی ایک قسم ہے۔ اس لفظ 'اکلوتا' کے لیے اصل عبرانی بائبل میں جو لفظ آیا ہے، وہ 'یحید' ہے، لیکن 'دی نیو جیروم تفسیر بائبل' مطبوعہ ٹی پی آئی بنگلور، انڈیا، ۱۹۹۴ء کے مصنف نے بھی وہی من مانی کی ہے۔ جب وہ صفحہ ۲۵ پر یہ لکھنے کے باوجود کہ اسحاقؑ کے لیے 'تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ کا استعمال غلط ہے، یہ دعویٰ کرتا ہے:

'Only son' is inaccurate, since Abraham will have other sons; already the LXX 'ton agapeton' correctly interpreted the Hebrew word as 'favored' by God.

'اکلوتا بیٹا' غلط ترجمہ ہے، کیونکہ ابراہیمؑ کے [اس وقت] دوسرے بیٹے بھی ہوں گے۔ ہفتادی ترجمے نے پہلے ہی عبرانی الفاظ کا 'خداوند کا پسندیدہ' کے الفاظ میں صحیح مفہوم بیان کیا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بائبل کے قریباً تمام تراجم میں لفظ 'یحید' کا ترجمہ 'اکلوتا' کیا ہے (فی الحقیقت، اس کے بنیادی مادے 'یحد' کے پیشِ نظر، جس کے معنی صریحاً 'ایک ہونا' ہیں، یہی ترجمہ صحیح ہے)، سوائے چند جری یہودیوں کے جنھوں نے قصداً معنوں میں تحریف کی ہے۔

8. *Matthew Henry's Bible Com.*, 1:80.

9 جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، جیسا کہ اس کتاب کے باب چہارم میں تفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔

10. As quoted by Dr. A. Cohen in *The Soncino Chumash*, (Hindhead, Surrey: The Soncino Press, 1947), 108.

11 'لیکن میرے دو بیٹے ہیں' کے جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے (نعوذ باللہ) خدا کو غلطی لگ گئی ہو، جیسے

اُس کے علم میں نہ ہو کہ سارہ پہلے ہی ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے کو جنم دے چکی تھیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ گویا ابراہیم علیہ السلام بے خبر خدا کے علم میں، جسے غلطی لگ گئی تھی، لانا چاہتے تھے اور انھیں بتانا چاہتے تھے کہ 'بلکہ میرے دو بیٹے ہیں' (اللہ تعالیٰ اس راقم کو معاف فرمائے جسے مجبوراً جملے کے الفاظ کے مضمرات بیان کرنے کے لیے یہ الفاظ استعمال کرنے پڑے)۔ فاضل مفسر کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُس کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے 'بے علم' ہونے کا مفہوم مترشح ہوتا ہے۔ اُسے تو اس بات پر بڑی اطمینان و مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ اُس نے حضرت اسماعیل کو 'اکلوتے بیٹے' کے طور پر قربانی کے لیے پیش کیے جانے کے استحقاق کی فضیلت سے محروم کر دیا ہے اور بزعم خویش قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی فضیلت حضرت اسحاق کے حق میں ثابت کر دی ہے۔

۱۲ اس لفظ 'اکلوتا' کے لیے اصل عبرانی لفظ 'یحید' ہے۔ 'سٹرونگز عبرانی ڈکشنری' اندراج نمبر ۳۱۷۳، ص ۴۹ کے مطابق اس کے معنی ہیں:

from 3161; sole; also lonely; only (child, son), solitary.

'اکیلا، تنہا، لاڈلا وغیرہ۔ اندراج نمبر ۳۱۶۱ 'یحد' ہے جو لفظ 'یحید' کا مادہ ہے اور اس کے معنی ہیں 'ایک ہونا یا ہو جانا' یہ وہی لفظ ہے جو عربی میں وحدت ہے اور اس کے معنی بھی وہی ہیں۔

عہد نامہ قدیم کی عبرانی اور آرامی ڈکشنری (صفحہ ۴۰۶) میں اس کے معانی ہیں:

only, single, alone, the only son, the only one.

یہ بات بالکل ناقابل یقین ہے کہ راشی جیسے فاضل شخص کو اس لفظ کی حقیقت اور معنی معلوم نہ ہوں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر کسی شخص کے بہ یک وقت دو بیٹے ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی اس کا 'اکلوتا بیٹا' نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں سے ہر ایک کو اس کے دو بیٹوں میں سے 'ایک' ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو اس کا 'اکلوتا بیٹا' کہنا اسی طرح غلط اور گمراہ کن ہے، جیسے لفظ 'تین' کو 'ایک' کہنا۔ بائبل کے بعض مفسرین نے بھی اس بات کو محسوس کیا ہے۔ 'دی نیو جیروم تفسیر بائبل' میں کتاب پیدائش کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رچرڈ جے کلیفرڈ اور رولینڈ ای مرفی (صفحہ ۲۵ پر) لکھتے ہیں:

'اکلوتا بیٹا' درست نہیں، کیونکہ ابراہیم کے دوسرے بیٹے بھی ہوں گے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی

پیش کی اس وقت تک ان کے صرف ایک ہی فرزند تھے۔ یہ بات خود بخود ظاہر ہے کہ وہ 'اسماعیل' علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں، نہ کہ 'اسحاق' علیہ السلام۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ چند یہودی مترجمین (مثلاً مسوراتی متن کے مطابق تورات، صفحہ ۳۵-۳۶، دی توراہ، ایک جدید تفسیر صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷۔ موخر الذکر میں عبرانی متن بھی موجود ہے اور اس میں یہاں 'معید' کا لفظ استعمال کیا ہے) نے اس لفظ 'اکیلا یا اکلوتا' کا ترجمہ اصل مادے کو نظرانداز کرتے ہوئے 'پسندیدہ' (favored one) کیا ہے۔ یہ صریحاً بدنیتی پر مبنی ہے۔

اس کہانی میں ایک اور بھی لفظ ہے جو اس نکتے کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے اور وہ ہے لفظ 'لڑکا'۔ بائبل کی متعلقہ عبارت میں یہ لفظ دو مرتبہ ادا کیا گیا ہے۔ پہلی دفعہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے اور دوسری دفعہ خداوند کے فرشتے کی زبان سے۔ اصل عبرانی زبان میں لڑکے کے لیے جو لفظ آیا ہے، وہ ہے: 'نعر'۔ سٹرونگز ڈکشنری میں اس کے معنی ہیں:

a boy, from the age of infancy to adolescence; by impl. a servant; also (by interch. of sex), a girl (of similar latitude in age): babe, boy, child, damsel, lad (*Heb. Dic. in Strong's Exh. Concordance*, entry 5288, p. 79.).

لڑکا: بچپن سے لے کر عنفوانِ شباب کی حدود میں داخل ہونے تک [یعنی تقریباً تیرہ چودہ سال تک]، نوکر، لڑکی وغیرہ۔

اس طرح یہ بات یقینی طور پر طے ہو جاتی ہے کہ قربانی کے لیے پیش کیا جانے والا بیٹا ایک تو 'اپنے باپ کا اکلوتا فرزند' ہونا چاہیے اور دوسرے عمر کے اعتبار سے 'لڑکا'۔ یہ دونوں شرائط حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذات میں پوری طرح موجود ہیں، جبکہ حضرت اسحاق علیہ السلام قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی ان دونوں شرائط میں سے کوئی بھی پوری نہیں کرتے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے قربانی کا حکم دیتے وقت اس کی وضاحت کر دی تھی۔ جہاں تک حضرت اسحاق علیہ السلام کے نام نہاد قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی عمر کا تعلق ہے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ علمائے بائبل کے مطابق اس نام نہاد قربانی کے وقت حضرت اسحاق علیہ السلام یا تو ابھی لڑکپن کی حدود میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے اور صرف دو تین سال کے بچے تھے، یا پھر لڑکپن کی عمر کی حدود پار کر کے جوان آدمی بن چکے تھے۔

بائبل کے یہودی مفسرین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے پیش کی جانی والی اس نام نہاد قربانی کے وقت حضرت اسحاق علیہ السلام کی عمر کے بارے میں مختلف آرا رکھتے ہیں۔

ڈبلیو گنتھر پلاٹ لکھتے ہیں:

According to the Rabbis, Isaac was thirty-seven years old. However, the story should be read not in chronological order but rather as an unrelated unit; here Isaac is a mere boy. The Rabbis took the death of Sarah to be immediately related to the Akedah [sacrifice]; therefore, with Sarah dying at 127 years of age, Isaac would be 37, having been born when his mother was 90.(W. Gunther Plaut, in his '*The Torah: A Modern Commentary*' (NY: Union of American Hebrew Congregations, 1981), p. 146)

ربیوں کے مطابق اسحاقؑ سینتیس سال کے تھے۔ تاہم کہانی کو ماہ وسال کے نقطہ نظر سے نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ اسے ایک آزاد اکائی کے طور پر لینا چاہیے۔ یہاں 'اسحاق' محض ایک لڑکا ہے۔ ربیوں نے سارہ کی وفات کو قربانی کے فوری بعد قرار دیا ہے۔ اس طرح جب سارہ ایک سو ستائیس سال کی عمر میں فوت ہوئی تو اس وقت اسحاقؑ کی عمر سینتیس سال بنتی ہے کیونکہ وہ اس وقت پیدا ہوئے تھے جب ان کی والدہ کی عمر نوے سال تھی۔

صفحہ ۱۵۹ پر وہ مزید لکھتا ہے:

Abraham returned alone from Moriah, and Sarah, believing to Isaac to have been sacrificed, died of grief.–Midrash.

ابراہیم موریاہ سے تنہا واپس آئے۔ سارہ نے سوچا کہ اسحاق قربان کر دیے گئے، اس لیے وہ غم سے مر گئی۔

جوزیفس لکھتا ہے:

Now Isaac was twenty-five years old. And as he was building the altar, he asked his father what he was about to offer, since there was no animal there for the oblation (*Antiquities*, Book I, Chap. XIII, para. 2, p. 42).

اب اسحاق پچیس سال کا تھا۔ اور وہ قربانی کا چبوترہ تیار کر رہا تھا۔ کیونکہ نذرانے کے طور پر پیش کرنے کے لیے کوئی جانور موجود نہ تھا، اس لیے اس نے اپنے والد سے پوچھا کہ وہ (ابراہیم) قربانی کے لیے کیا پیش کرے گا؟

'دی جیوئش انسائیکلوپیڈیا' میں ۶: ۶۱۷ پر درج ہے:

In Jose ben Zimra's opinion, the akedah took place immediatley after Isaac's weaning [at the age of 2 or 3 years].

جوز بن زمرہ کے خیال میں قربانیِ اسحاق" کا دودھ چھڑانے کے فوری بعد (دو یا تین سال کی عمر میں) پیش کی گئی تھی۔

بائبل میں بیان کیا گیا ہے:

ابراہیم نے سوختنی قربانی کے لیے لکڑیاں لیں اور انھیں اپنے بیٹے اسحاق" پر لادا۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بچہ جس کا ابھی دودھ چھڑایا ہی گیا ہے، اسے لکڑیوں کا اتنا بڑا بوجھ اٹھوا دیا جائے! ایلین جی وائٹ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیرِ بائبل' ۱:۳۴۹ پر لکھتا ہے:

'اسحاق' اس وقت بیس سال کا جوان آدمی تھا۔

خواہ نام نہاد قربانی کے لیے پیش کیے جانے کے وقت حضرت اسحاق علیہ السلام کو ابھی ابھی دودھ چھڑایا جانے والا بچہ قرار دیا جائے یا سینتیس سال یا پچیس سال یا بیس سال کا سمجھا جائے یا کسی اور عمر کا، بہر صورت وہ 'لڑکا' ہرگز قرار نہیں دیے جاسکتے۔ پھر حضرت اسحاق علیہ السلام کی عمر کچھ بھی ہو، انھیں اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی 'تیرا اکلوتا بیٹا' نہیں کہا جاسکتا، جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی 'تیرا اکلوتا بیٹا' اور 'لڑکا' ہونے کی حیثیت چودہ سال کی عمر تک برقرار رہی۔ اس طرح اگر قربانی کے لیے حضرت اسحاق علیہ السلام کو پیش کیا جانا ہوتا تو 'تیرا اکلوتا بیٹا' والی بات بالکل بے معنی قرار پاتی ہے۔

۱۳۔ یہ 'اس کی ماں' کے الفاظ کہاں سے درمیان میں آگئے؟ یہ بات صریحاً ناقابلِ یقین ہے کہ اتنا بڑا صاحبِ علم مصنف 'تیرا اکلوتا بیٹا' جیسے سیدھے سادے بیان پر ایسی لغو توجیہ پیش کرسکتا ہے۔ یہاں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ یہ مکالمہ صرف اللہ تعالیٰ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ہو رہا ہے۔ اس مکالمے میں کسی تیسرے شخص کا کوئی دخل نہیں۔ اس جملے میں اللہ تعالیٰ متکلم ہے، کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہم کلام ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام مخاطب ہیں، جن کے لیے مخاطب یا حاضر کی ضمیر ہی استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے مخاطب کی ضمیر 'تیرا' استعمال کی ہے۔ اس مخاطب کی ضمیر 'تیرا' کا اطلاق کسی صورت بھی حضرت سارہ پر نہیں ہوسکتا جو یہاں موجود ہی نہیں ہیں اور ان کے لیے صرف غائب ہی کی ضمیر استعمال ہوسکتی

تھی۔ اللہ تعالیٰ نے 'اکلوتا بیٹا' کو مجہول انداز میں نہیں بیان کیا کہ کسی شک یا تردد کی کوئی گنجائش باقی رہ جائے، بلکہ 'اکلوتا بیٹا' کو واضح طور پر لفظ 'تیرا' کے وصف سے موصوف کر کے بیان کیا ہے۔ بدیہی طور پر اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ 'اے ابراہیمؑ، جو لڑکا قربانی کے لیے درکار ہے، وہ 'تیرا' اکلوتا بیٹا ہے اور کسی ماں کا اکلوتا بیٹا نہیں'۔ جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ہے تو ان جیسے ذی شعور انسان کے بارے میں یہ بات قطعی طور پر ناقابلِ تصور ہے کہ وہ اس جگہ 'تیرا اکلوتا بیٹا' جیسے واضح جملے کا 'لیکن ہر ایک اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے' جیسا احمقانہ جواب دیں گے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ 'اپنی ماں کا' کے الفاظ کا 'تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ سے کیا تعلق ہے۔

۱۴۔ اس موضوع پر اس کتاب کے باب چہارم میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۵۔ ملکہ تخیلہ سے مالا مال فاضل مفسر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے 'لیکن میں دونوں سے محبت کرتا ہوں' کے الفاظ ادا کرائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں اس لفظ 'دونوں' سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام دونوں ہیں۔ اگر کسی شخص کے دو بیٹے ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو بھی 'اکلوتا' نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کو اپنا 'اکلوتا بیٹا' قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دے رہا ہے اور دوسری طرف یہ فاضل مصنف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے منہ میں 'لیکن میں دونوں سے محبت کرتا ہوں' کے الفاظ ڈال رہے ہیں۔ یہ بیانات صریحاً متضاد ہیں اور اس طرح 'لیکن میں دونوں سے محبت کرتا ہوں' کے الفاظ قطعی طور پر بے بنیاد اور بے سروپا ہیں۔

۱۶۔ جہاں تک 'اسحاق" ہی' کے الفاظ کا تعلق ہے وہ جملے کی روانی اور سیاق وسباق کے لحاظ سے صریحاً غیر متعلق اور فضول ہیں۔ جس بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کیا جانا مطلوب تھا اگر وہ اسحاق علیہ السلام ہوتے تو اللہ تعالیٰ کو 'تمہارا بیٹا اسحاق" ' کے الفاظ ادا کرنے چاہییں تھے، لیکن جب وہ 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ ادا کر رہا ہے تو اس سے مراد اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس جگہ لفظ 'اسحاق" کا اضافہ کسی چابک دست مؤلف کی نامناسب اور غیر موزوں تحریف کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

۱۷۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ تمام فرضی سوالات اور ان کی یہ ساری ترتیب مفسر محترم کی ذہنی کاوش

کی اختراع ہے، وگرنہ بائبل کی عبارت میں ان کا کوئی اشارہ یا تذکرہ موجود نہیں۔ اگر کوئی جانب دار مؤلف اتنے بھدے انداز میں یہاں لفظ 'اسحاق' کا اضافہ نہ کرتا تو ہمارے یہ فاضل مفسر اپنی تخیلاتی تخلیق کاری کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ کس طرح کر سکتے تھے!

۱۸ 'مبادا ابراہیمؑ کا ذہن اچانک صدمے سے چکرا جائے' تحلیلِ نفسی کا کیا شان دار مظاہرہ ہے!

۱۹ 'اپنے فرمان کو اس (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے لیے مزید قیمتی بنانے کے لیے': سبحان اللہ! کیا خوب انداز ہے۔ قارئین توجہ فرمائیں کہ اگر انھوں نے کسی کے لیے اپنے حکم کو زیادہ قیمتی بنانا ہو، تو یہ اس کا کتنا عمدہ طریقہ ہے!' آخری بات یہ کہ وہ اپنے ادا کیے ہوئے ہر لفظ کا بھرپور اجر پائے' تحریف کی یہ کیا شان دار توجیہ ہے!

باب سوم

پہلے پھل یا پہلوٹھے بیٹے کے نذرانے کی رسم

جب کبھی انسانی قربانی درکار ہوتی تو پسندیدہ بات یہ تھی کہ وہ 'پہلوٹھے' کی ہو۔ اگر مطلوبہ قربانی انسانی جان کی نہ بھی ہوتی، بلکہ کسی جانور یا پھل کی ہوتی تو بھی ضروری تھا کہ یا تو یہ پہلوٹھے جانور کی ہو اور یا پہلے پھل کی۔ ذیل میں اس نقطے کی وضاحت کے لیے کچھ مستند حوالے پیش کیے جا رہے ہیں۔ 'مقدس صحیفے کی ایک نئی تفسیر' میں درج ہے:

At the time of Abraham human sacrifice was customary and frequent among his canaanite neighbors, and the early legislation of Ex 22:29, which states without modification that first-born sons are to be given to God, seems clearly to imply a stage in Israel's thought which regarded such sacrifices as a religious duty.[1]

ابراہیم کے عہد میں ان کے کنعانی ہمسایوں میں انسانی قربانی رائج تھی اور اس پر کبھی کبھی عمل بھی کیا جاتا تھا۔ کتابِ خروج ۲۲: ۲۹ میں اس حکم سے کہ پہلوٹھے بیٹے اللہ کی بارگاہ میں[2] پیش کیے جائیں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں بنی اسرائیل کا خیال تھا کہ ایسی قربانیاں مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دی ریورنڈ، ٹی کے چینی اپنے مقالے 'اسحاق' میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

The course that he adopted shows the writer to have been a great teacher. He admits the religious feeling which prompted the sacrifice of a firstborn son.[3]

مصنف نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم مبلّغ اور معلّم ہے۔ وہ

باب سوم

پہلے پھل یا پہلوٹھے بیٹے کے نذرانے کی رسم

جب کبھی انسانی قربانی درکار ہوتی تو پسندیدہ بات یہ تھی کہ وہ 'پہلوٹھے' کی ہو۔ اگر مطلوبہ قربانی انسانی جان کی نہ بھی ہوتی، بلکہ کسی جانور یا پھل کی ہوتی تو بھی ضروری تھا کہ یا تو یہ پہلوٹھے جانور کی ہو اور یا پہلے پھل کی۔ ذیل میں اس نقطے کی وضاحت کے لیے کچھ مستند حوالے پیش کیے جا رہے ہیں۔ 'مقدس صحیفے کی ایک نئی تفسیر' میں درج ہے:

At the time of Abraham human sacrifice was customary and frequent among his canaanite neighbors, and the early legislation of Ex 22:29, which states without modification that first-born sons are to be given to God, seems clearly to imply a stage in Israel's thought which regarded such sacrifices as a religious duty.[1]

ابراہیم کے عہد میں ان کے کنعانی ہمسایوں میں انسانی قربانی رائج تھی اور اس پر کبھی کبھی عمل بھی کیا جاتا تھا۔ کتابِ خروج ۲۲:۲۹ میں اس حکم سے کہ پہلوٹھے بیٹے اللہ کی بارگاہ میں[2] پیش کیے جائیں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں بنی اسرائیل کا خیال تھا کہ ایسی قربانیاں مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دی ریورنڈ، ٹی کے چینی اپنے مقالے 'اسحاق' میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

The course that he adopted shows the writer to have been a great teacher. He admits the religious feeling which prompted the sacrifice of a firstborn son.[3]

مصنف نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم مبلغ اور معلم ہے۔ وہ

تسلیم کرتا ہے کہ ایسا دینی جذبہ بھی موجود تھا جس کے نتیجے میں 'اکلوتے بیٹے' کی قربانی پیش کی جاتی تھی۔

مارکس ڈوڈس بیان کرتا ہے کہ اس دور کی سب سے زیادہ عظیم مذہبی عبادت پہلوٹھے بیٹے کی قربانی تھی۔ یہ بات نامناسب خیال کی جاتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی ایسی چیز کی قربانی پیش کی جائے جو حقیقی طور پر قابل قدر نہ ہو۔ (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نزدیک ان دو بیٹوں میں سے کون سا حقیقت میں قابل قدر تھا۔ اس موضوع پر کتاب ہذا میں کسی اور مقام پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے)۔ مارکس لکھتا ہے:

Abraham was familiar with the idea that the most exalted form of religious worship was the sacrifice of the first-born. He felt, in common with godly men in every age, that to offer to God cheap sacrifices while we retain for ourselves what is truly precious, is a kind of worship that betrays our low estimate of God rather than expresses true devotion.[4]

ابراہیم اس نظریے سے آگاہ تھے کہ دینی عبادت کا بلند ترین مقام یہ تھا کہ قربانی میں پہلوٹھے بیٹے کو پیش کیا جائے۔ ہر دور کے دین دار لوگوں کی طرح ان کا بھی یہ خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ادنیٰ قربانیاں پیش کرنا اور حقیقی معنوں میں اعلیٰ اور بیش قیمت چیزیں اپنے لیے بچا کر رکھنا عبادت کی ایک ایسی قسم ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہماری سچی لگن نہیں ہے، بلکہ ہم اس کو اس کے شایانِ شان مرتبہ نہیں دیتے۔

سٹینلے اے کک (Stanley A. Cook) لکھتا ہے کہ ایک زمانے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہلوٹھے بیٹے کی قربانی پیش کرنا اسی طرح لازمی سمجھا جاتا تھا جس طرح پہلے پھل اور جانوروں کے پہلوٹھے بچے کا نذرانہ پیش کرنا لازم تھا:

The firstborn male enjoyed the privileges of which he was not to be deprived (...). Not only were the first-fruits as acceptable an offering as the firstlings, but when (in exceptional cases) a human victim was required it was a firstborn that was preferred (2K.3:27). (...). No doubt, strictly, the offering of the firstborn to Yahweh was at one time considered to be as binding as the offering of firstlings and first-fruits, and, indeed, the evidence goes to show that in exceptional cases the offering was actually made. However, just as the first-fruits were offered as a part of the whole, it is conceivable that originally the rite of circumcision was instituted upon

the same principle to typify the offering of the firstborn.[۵]

پہلوٹھے نر کو ایسا استحقاقِ فضیلت حاصل تھا جس سے اُسے محروم نہیں کیا جا سکتا تھا(...)۔ نہ صرف یہ کہ پہلے پہلے پھلوں کو اسی طرح قابل قبول نذرانے کی حیثیت حاصل تھی، جس طرح پہلوٹھے جانوروں کو، بلکہ جب (استثنائی حالات میں) کوئی انسانی بھینٹ درکار ہوتی، تو اس سلسلے میں بھی پہلوٹھے بچے کو ترجیح دی جاتی (۲۔ سلاطین ۳: ۲۷)۔ (...)۔ بلاشبہ ایک زمانے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہلوٹھے بیٹے کی قربانی پیش کرنا اسی طرح لازم خیال کیا جاتا تھا جس طرح جانوروں کے پہلے پہلے بچوں اور پہلے پہلے پھلوں کا نذرانہ پیش کرنا لازم تھا۔ اس بات کے عملی شواہد موجود ہیں کہ استثنائی حالات میں اس طرح کی انسانی قربانی فی الواقع بھی پیش کی جاتی تھی، تاہم جس طرح پہلے پہلے پھل پوری فصل کے ایک جز کے طور پر نذر کیے جاتے تھے، اسی طرح یہ بات بھی قابل فہم ہے کہ ختنہ کی رسم کی بنیاد بھی اسی اصول پر رکھی گئی تھی کہ یہ پہلوٹھے بیٹے کی قربانی کی علامت سمجھی جائے۔

مندرجہ بالا عبارت کے اولین جملے میں بیان کیا گیا ہے کہ 'پہلوٹھے نر کو ایسا استحقاقِ فضیلت حاصل تھا جس سے اسے محروم نہیں کیا جا سکتا تھا'۔ خود بائبل میں بھی واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں اور ایک محبوبہ اور دوسری غیر محبوبہ ہو اور محبوبہ اور غیر محبوبہ دونوں سے لڑکے ہوں اور پہلوٹھا بیٹا غیر محبوبہ سے ہو، تو جب وہ اپنے بیٹوں کو اپنے مال کا وارث کرے، تو وہ محبوبہ کے بیٹے کو غیر محبوبہ کے بیٹے پر جو فی الحقیقت پہلوٹھا ہے، فوقیت دے کر پہلوٹھا نہ ٹھہرائے۔ بلکہ وہ غیر محبوبہ کے بیٹے کو اپنے سب مال کا دُونا حصہ دے کر اُسے پہلوٹھا مانے، کیونکہ وہ اس کی قوت کی ابتدا ہے اور پہلوٹھے کا حق اسی کا ہے۔[۶]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود بائبل کے مطابق پہلوٹھے بیٹے کا استحقاقِ فضیلت ناقابل تنسیخ ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی بیویوں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ میلان کی وجہ سے کسی دوسری بیوی کے بیٹے کو اس کے پہلوٹھے پن کے جائز اور واجب حق سے محروم کرنا چاہے، تو اس کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ پہلوٹھے بیٹے کے نذرانے کو قربانی کی اعلیٰ ترین شکل سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قربانی کے لیے پیش کیے

جانے کا استحقاقِ فضیلت حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ناقابل تنسیخ اور ناقابل انتقال حق تھا۔ اسے کسی حالت میں بھی حضرت اسحاق علیہ السلام کی طرف منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہود کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے: 'دی بک آف جوبلیز' (The Book of Jubilees)۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ بائبل کی مستند کتابوں میں شامل نہیں، لیکن یہ کلی طور پر مسترد بھی قرار نہیں دی جاتی۔ بائبل کے علما اپنے نقطۂ نظر کے حق میں بلا تردد اس کے حوالے نقل کرتے ہیں۔ 'انٹر پریٹرز بائبل ڈکشنری' میں ایس۔ تدیسخ (S. Tedesche) نے اپنے مقالے 'Jubilees, Book of' میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں، تاکہ قاری کو اس کی حقیقی اہمیت سے آشنائی ہو:

One of the most important books of the Pseudepigrapha. It gives a graphic picture of judaism in the two pre-Christian centuries. Its purpose was to show that Judaism, as it then was, had been the same from the very beginning of known history. (...). emphasis is also placed on jewish tenets and customs, and the importance of preserving the difference between Jews and Gentiles is stressed. (...). The purpose of the author was to do for Genesis what the Chronicler did for Samuel and Kings----to rewrite the facts in such a way that it would appear that the law was rigorously observed by the patriarchs. (...). His desire was to save Judaism from the demoralizing effects of Hellenism by glorifying the law and picturing the patriarchs as irreproachable; by glorifying Israel and urging her to preserve the separateness from the Gentiles; and by denouncing the Gentiles and also Israel's national enemies. The "Angel of the Presence" reveals to Moses on Sinai the history and religious laws of Gen. 1-Exod. 3 in the form of sermonized translations, or Midrashic Targums, which show only favorable practices and omit anything derogatory. (...). The contrast between Jews and Gentiles is sharply drawn, and Israel is warned to keep separate. (...), and anything is omitted that would put the patriarchs in an unfavorable light.[7]

غلط منسوب کتابوں (Pseudepigrapha) میں سے (یہ) ایک اہم ترین کتاب (ہے)۔ یہ قبل مسیح کی دو صدیوں میں یہودیت کی واضح تصویر کشی کرتی ہے۔ اس کی تحریر کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ یہودیت، معلوم تاریخ کی ابتدا ہی سے اسی حالت میں موجود رہی ہے، جیسی کہ یہ اس وقت موجود تھی۔ (...)۔ اس میں یہودی عقائد اور رسم و رواج پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ یہود اور غیر یہود کے

درمیان امتیاز قائم رکھنے کی اہمیت پر بھی بڑا زور دیا گیا ہے۔(...)۔مصنف کا مقصد یہ تھا کہ جو چیز Chronicler نے کتابِ سموئیل اور کتابِ ملوک کے سلسلے میں سرانجام دی ہے، یعنی حقائق کو دوبارہ ایسے انداز میں لکھا جائے جس سے ظاہر ہو کہ بزرگ آبا قانونِ شریعت کی سختی سے پیروی کرتے تھے، وہی چیز وہ خود کتابِ پیدائش کے بارے میں سرانجام دے۔(...)۔اس کی خواہش تھی کہ:

(۱) قانونِ شریعت کی عظمت ظاہر کرے،

(۲) بزرگ آبا کو تنقید سے بالاتر حیثیت میں پیش کرے،

(۳) بنی اسرائیل کی عظمت بیان کرے،

(۴) بنی اسرائیل کو غیر قوموں سے اپنی الگ حیثیت قائم رکھنے پر زور دے کر،

(۵) غیر قوموں اور بنی اسرائیل کے قومی دشمنوں کو باطل اور مسترد قرار دے کر،

یہودیت کو یونانیت کے تباہ کن اور حوصلہ شکن اثرات سے بچایا جائے۔

[چنانچہ وہ] 'فرشتۂ بارگاہِ خداوندی' کوہِ سینائی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کتابِ پیدائش باب اول سے لے کر کتابِ خروج باب سوم تک میں شامل قوانینِ شریعت اور تاریخی واقعات واعظانہ تراجم کی صورت میں نازل کرتا ہے۔ان میں صرف موافق اور پسندیدہ باتیں ہی ظاہر کی جاتی ہیں اور اہانت آمیز چیزیں حذف کر دی جاتی ہیں۔(...)۔یہودیوں اور غیر قوموں کے درمیان فرق کی بڑے واضح انداز میں تصویر کشی کی جاتی ہے اور بنی اسرائیل کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنا الگ تشخص برقرار رکھیں اور غیر قوموں میں خلط ملط نہ ہوں۔(...)، اور ہر ایسی چیز کو حذف کر دیا گیا ہے جو بزرگ آبا کو ناپسندیدہ انداز میں پیش کرے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

(۱) '*The Book of Jubilees*' غلط منسوب کتابوں (Pseudepigrapha) کی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

(۲) اس میں یہودیوں اور غیر قوموں کے درمیان فرق مراتب پر بہت زور دیا گیا ہے۔

(۳) یہود کی برتری اور غیر قوموں کی کم تری ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔(...)،

اور ہر ایسی چیز حذف کر دی گئی ہے جو بزرگ آبا کو ناپسندیدہ رنگ میں پیش کرے۔

(۴) 'مصنف کا مقصود یہ تھا کہ وہ کتاب پیدائش کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو مصنف کتاب تواریخ نے کتاب سموئیل اور کتاب ملوک کے ساتھ کیا تھا'۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک کتاب پیدائش کے موضوعات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں 'کتاب جوبلیز' کا بیان کسی طرح بھی اس سے کم قابلِ اعتماد نہیں، جتنا کہ کتاب تواریخ کا بیان کتاب سموئیل اور کتاب سلاطین کے بارے میں ہے۔

(۵) اس کتاب کے مصنف کی خواہش تھی کہ (ا) قانونِ شریعت کی عظمت ظاہر کر کے (ب) بزرگ آبا کو تنقید سے بالاتر حیثیت میں پیش کر کے (ج) بنی اسرائیل کی عظمت بیان کر کے (د) بنی اسرائیل کو غیر قوموں سے اپنی الگ حیثیت قائم رکھنے پر زور دے کر اور (ہ) غیر قوموں اور بنی اسرائیل کے قومی دشمنوں کو باطل اور مسترد قرار دے کر یہودیوں کو یونانیت کے حوصلہ شکن اثرات سے محفوظ رکھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ 'کتاب جوبلیز' کا مصنف اس میں کسی ایسے مواد کا وجود برداشت نہیں کر سکتا تھا، جو یہودیوں کے قومی احساسِ تفاخر اور مفاد کو نقصان پہنچا سکتا ہو۔

(۶) جہاں تک بزرگ آبا کا تعلق ہے، مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ ان کے متعلق انتہائی محبت اور احترام کا اظہار کرے۔

(۷) اس نے ہر ایسی چیز حذف کر دی ہے جو ان آبا (Patriarchs) کو نامناسب انداز میں پیش کرے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ 'کتاب جوبلیز' نہ تو کوئی غیر اہم کتاب ہے اور نہ اس میں کوئی ایسی بات جگہ پا سکتی تھی جو یہودیوں اور بزرگ آبا کے مفاد کے منافی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بائبل کے علما اپنے موضوعات اور اپنی تحریروں کو وقیع بنانے کے لیے اس میں سے پوری آزادی سے حوالے نقل کرتے ہیں۔ اس کتاب میں درج ہے:

And he drew near to the place of the mount of God.(...). And I called to him from heaven, and said unto him: 'Abraham, Abraham;' and he was terrified and said: 'Behold, (here) am I.' And I said unto him: 'Lay not thy hand upon the lad, neither do you anything to him; for now I have shown that thou fearest the Lord, and hast not withheld thy son, thy first-born son, from me.'[8]

اور وہ خداوند کے پہاڑ کی جگہ سے قریب ہوا۔ (...)۔ اور میں نے اسے آسمان سے پکارا اور اُس سے کہا 'ابراہیم ابراہیم!' اور وہ خوف زدہ ہوا اور اس نے کہا 'دیکھیے میں یہ رہا'۔ اور میں نے اسے کہا 'اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ ڈالو اور نہ اس کے ساتھ کچھ کرو۔ کیونکہ اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ تم خدا سے ڈرتے ہو اور تم نے اپنے بیٹے، اپنے پہلوٹے بیٹے، کو بھی مجھ سے بچا نہیں رکھا'۔

اسی کتاب کے ۱۸:۱۵ میں دوبارہ بیان کیا گیا ہے:

And the Lord called Abraham by his name a second time from heaven, (...). And he said: 'By Myself have I sworn, saith the Lord, Because thou hast done this thing, And hast not withheld thy son, thy beloved son, from Me, That in blessing I will Bless thee,'[2]

اور خداوند نے آسمان سے ابرہام کو دوسری دفعہ اس کا نام لے کر پکارا، (...)۔ اور اس نے کہا، خداوند کہتا ہے 'مجھے اپنی ذات کی قسم، کیونکہ تو نے یہ چیز سرانجام دی ہے اور اپنے بیٹے، اپنے پیارے بیٹے، کو بھی مجھ سے نہیں روکا [بچا کے رکھا]، اس لیے میں تجھے پوری طرح برکت دوں گا'۔

اس کتاب کے ایڈیٹر نے 'تیرے پیارے بیٹے' پر ایک ذیلی حاشیہ دیا ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے:

But here c d have 'thy first-born son'.

لیکن یہاں مسودہ 'c' اور مسودہ 'd' میں 'تیرا پہلوٹا بیٹا' لکھا ہے۔

'کتاب جوبلیز' کے اس ورشن کے مقدمے میں صفحہ ۲ پر 'c' اور 'd' کی تشریح کر دی گئی ہے۔ اس کے مطابق 'c' سے مراد اس کتاب کا حبشی مسودہ ہے جو توبنگن (Tubingen) کی یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت ہے۔ اور 'd' سے مراد کتاب کا وہ حبشی مسودہ ہے جو پیرس کی نیشنل لائبریری کی ملکیت ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 'کتاب جوبلیز' کے باب ۱۸ کی آیات ۱۱ اور ۱۵ کے مطابق ابرہام سے اپنے پہلوٹے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

اس طرح مستند علما نے وضاحت کی ہے کہ اگر چند مخصوص حالات میں چار و ناچار کسی کو جسمانی قربانی کے لیے پیش کرنا ہوتا، تو اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے باپ کا پہلوٹا بیٹا یا پہلوٹا جانور ہو۔ دوسری صورت میں، ایک عمومی قانون کے طور پر، یہ ضروری تھا کہ کسی باپ کے

پہلوٹھے بیٹے یا پہلوٹھے جانور کا فدیہ دے کر اُس کو چھڑا لیا جائے۔ مندرجہ بالا اقتباسات کے علاوہ بھی ایسے متعدد علما ہیں جو یہی رائے رکھتے ہیں۔ اُن میں سے چند ایک کے نام ہیں: پیک (Peake) کی تفسیر بائبل[10]، نیو جیروسلیم بائبل[11]، کرسچین کمیونٹی بائبل[12]۔

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام مسلمہ طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلوٹھے فرزند ہیں، اس سلسلے میں بائبل اور دیگر متعلقہ ریکارڈ میں اس قدر واضح اور غیر مبہم الفاظ موجود ہیں کہ اس کے حق میں استدلال کرتے وقت انسان خفت محسوس کرتا ہے، لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ بائبل کے کچھ فاضل علما ایسی واضح حقیقت سے انکار کرنے اور اسے مسخ کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے، اس لیے ذیل میں اس موضوع پر نہایت اختصار سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حضرت اسحاق علیہ السلام بطور فرزندِ حضرت ابراہیم علیہ السلام

بائبل میں درج ہے:

تب خدا نے فرمایا: 'بیشک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا۔ تو اس کا نام اضحاق رکھنا'۔[13]

اور جب اُس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔[14]

حضرت اسماعیل علیہ السلام بطور فرزندِ حضرت ابراہیم علیہ السلام

بائبل میں درج ہے:

اور ابرام سے ہاجرہ کے ایک بیٹا ہوا اور ابرام نے اپنے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ سے پیدا ہوا، اسماعیل رکھا (۱۵)۔ اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔[15]

تب ابرہام نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اور سب خانہ زادوں اور اپنے سب زر خریدوں کو یعنی اپنے گھر کے سب مردوں کو لیا اور اسی روز خدا کے حکم کے مطابق ان کا ختنہ کیا۔[16]

لیکن لونڈی کا بیٹا بھی تمہارا بیٹا ہے اور میں اس کی نسل کو عظیم قوم بناؤں گا۔[17]

میں لونڈی کے بیٹے کو بھی بہت سے بچے عطا کروں گا، تا کہ وہ ایک قوم بن جائیں۔ وہ بھی تمھارا بیٹا ہے۔[18]

اس آیت کا ترجمہ اردو کتاب مقدس نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں درج ذیل ہے:

اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا، اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے۔
(پیدائش ۲۱:۱۳)

اس طرح یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بائبل کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام، دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یکساں طور پر حقیقی، جائز اور قانونی فرزند تھے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند نہ تھے یا چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں جدا کر دیا تھا، اس لیے وہ ان کے فرزند نہ رہے تھے تو یہ بات حقائق کے بھی خلاف ہے اور اس کی کوئی وجہِ جواز بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتلا دیا تھا کہ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کسی اور جگہ آباد کر بھی دیا جائے، تب بھی وہ ان کے فرزند رہیں گے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت پیدا ہوئے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام چھیاسی سال کے تھے اور حضرت اسحاق علیہ السلام اس وقت پیدا ہوئے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سو برس کے تھے۔ اس طرح صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'پہلوٹھے بیٹے' قرار پاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'پہلوٹھے بیٹے' ہونے کا استحقاق فضیلت حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ناقابل تنسیخ اور ناقابل تبدیل حق تھا۔ اور کوئی شخص انھیں ان کے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے تھے۔ اُنھیں ان کی زندگی کے کسی مرحلے پر بھی اور الفاظ کے کسی مفہوم کے مطابق بھی اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلوٹھا بیٹا نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی تھے جن کو قریباً چودہ سال تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بلا شرکتِ غیرے 'اکلوتے بیٹے' کی حیثیت حاصل رہی، جبکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو اپنی پوری زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ حیثیت حاصل نہیں رہی کہ انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام

کا 'اکلوتا بیٹا' قرار دیا جا سکے۔ وہ بیٹا جس کے متعلق قربانی کے طور پر پیش کیے جانے کا حکم دیا گیا تھا، اس کے لیے لازم تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا بیٹا ہو۔ نیز یہ کہ وہ ان کا پہلوٹا بیٹا بھی ہو۔ اگر اس حکم سے اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہوتا کہ قربانی کے لیے 'اکلوتا وارث' یا 'حضرتِ سارہ کا اکلوتا بیٹا' پیش کیا جائے، جیسا کہ بائبل کے بعض علما نے اللہ تعالیٰ کے الفاظ سے یہ مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے واضح اور دوٹوک الفاظ استعمال کرتا۔ اسے حضرتِ ابراہیم کو 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دے کر مخمصے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان الفاظ سے کسی طرح بھی یہ متبادر ہوتا ہے کہ جس فرزند کو قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنی پیدائش کے وقت یا اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے میں نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'اکلوتے بیٹے' تھے اور نہ ان کے پہلوٹھے بیٹے تھے۔ جب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام زندہ رہے، حضرت اسحاق علیہ السلام ان کے 'اکلوتے بیٹے' نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ ان کے آخری سانس تک حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی زندہ موجود رہے۔ اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ حقیقتِ حال کا ادراک کرے۔

'پہلوٹھے بیٹے' کے استحقاقِ خصوصی کے متعلق مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں جو نتائج برآمد ہوتے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں ان کے پڑوسی کنعانیوں میں انسانی قربانی کا رواج عام تھا۔ کتابِ خروج ۲۲:۲۹ میں بھی درج ہے کہ پہلوٹھا بیٹا خداوند کی نذر کیا جانا چاہیے۔

۲۔ نہ صرف پہلے پہلے پھل اور جانوروں کے پہلوٹھے بچے نذرانے کے طور پر پیش کیے جاتے تھے، بلکہ (استثنائی حالات میں) جب کسی انسانی قربانی کی ضرورت ہوتی تو 'پہلوٹھے بیٹے' ہی کو ترجیح دی جاتی (۲۔ سلاطین ۳:۲۷)۔

۳۔ 'پہلوٹھے نر بیٹے' کو کچھ ایسے خصوصی استحقاق حاصل تھے جن سے اسے کسی صورت میں محروم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۴۔ سیوڈی پی گرافا کی ایک اہم کتاب 'کتاب جوبلیز' میں خداوند کا یہ فرمان درج ہے:
'کیونکہ اب میں نے ظاہر کر دیا ہے کہ تو خداوند سے ڈرتا ہے اور تو نے اپنے بیٹے، 'پہلوٹھے بیٹے' کو بھی مجھ سے بچا کر نہیں رکھا'۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹا جو قربانی کے لیے پیش کیا گیا تھا، وہ نہ صرف بائبل کے مطابق، بلکہ تمام دستیاب ریکارڈ کے مطابق، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلوٹا بیٹا تھا۔

۵۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حقیقی اور جائز بیٹے ہیں، اگرچہ (حضرت قطورہ کے بطن سے) ان کے چند اور بیٹے بھی تھے۔

۶۔ کسی شخص کے صرف ایک ہی بیٹے کو اس کا 'پہلوٹا بیٹا' کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'پہلوٹھے بیٹے' تھے، جو حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش سے قریباً چودہ سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔

۷۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'پہلوٹھے بیٹے' ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام قریباً چودہ سال تک ان کے 'اکلوتے بیٹے' بھی رہے، جبکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو یہ فضیلت اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی حاصل نہیں رہی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنی زندگی کے کسی مرحلے میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'اکلوتے بیٹے' یا 'پہلوٹھے بیٹے' نہیں کہلا سکتے تھے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا 'اکلوتا بیٹا' قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ مزید برآں مُرَوَّجہ دستور کے مطابق اسے 'پہلوٹا بیٹا' بھی ہونا چاہیے تھا۔ اس لحاظ سے فطری طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی خاطر نامزد کیا جا سکتا تھا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام ان میں سے ایک شرط بھی پوری نہ کرتے تھے، اس لیے صرف یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہو سکتے تھے جن کو قربانی کے لیے پیش کرنا مقصود تھا۔ اور یہ کسی طرح بھی

حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں ہو سکتے تھے۔

۹۔ مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی کو زیادہ شان دار اور وقیع بنانے کے لیے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقی معنوں میں وفاداری ثابت کرنے کے لیے ان کا 'پہلوٹھا اور اکلوتا بیٹا' ہی وہ ہستی ہو سکتا تھا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا تھا کہ اسے قربانی کے طور پر پیش کیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی بیوی سارہ بھی بوڑھی ہو چکی تھیں۔ وہ سنِ یاس سے گزر چکی تھیں اور فطری طور پر کوئی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہی تھیں۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اب کسی مزید اولاد کی توقع نہ کر سکتے تھے۔ ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا، جو اب معقول عمر کو پہنچ چکا تھا، تا کہ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹا سکے۔ زندگی کے اس مرحلے میں انھیں اس بیٹے کی ضرورت بھی بہت تھی۔ جس بیٹے کی قربانی درکار تھی۔ اگر وہ دو بیٹوں میں سے ایک ہوتا اور وہ بھی ان کا چھوٹا بیٹا 'اسحاق' جو کم مفید، کم طاقت ور، کم صلاحیت اور ان کے لیے کم مددگار ہوتا تو یہ آزمائش اتنی شدید، معنی خیز اور کامل نہ ہوتی، جتنی کہ اس حال میں ہوتی، جبکہ قربانی کے لیے مطلوب بیٹا پہلوٹھا اور اکلوتا ہوتا۔

۱۰۔ ایسی صورت حال میں جہاں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کا 'پہلوٹھا اور اکلوتا بیٹا' قربان کرنے کی آزمائش میں ڈال رہا ہے، اور وہ بھی ان کی زندگی کے اس دورِ ضعیفی میں، اسے بیٹے کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ 'تیرا بیٹا، تیرا اکلوتا بیٹا' کے الفاظ اتنے واضح ہیں کہ ان کے لیے مزید کسی توضیح یا اضافہ کی ضرورت نہیں۔ اگر یہاں 'اسحاق ہی' کے الفاظ داخل کیے جائیں تو فرمان کی تاثیر اور شان ختم ہو جاتی ہے۔ اکلوتے بیٹے کے نام کا ذکر ایک فضول اضافہ ہے اور ایک فصیح و بلیغ ذہین اور مسحور کن خطیب سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ تحریف کی ایک بھونڈی مثال ہے جو کسی پُر جوش، مگر نا پختہ کار اور جانب دار مؤلف نے کی ہے۔ جس سے اس کے مجرم ضمیر اور غیر پاکیزہ محرکات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

حواشی باب سوم

1. Charles Gore, Goudge, Alfred Guillaume, *A New Commentary, on Holy Scripture*, London, 1928, p. 53.

۲۔ کتابِ مقدس میں درج ہے:

تو اپنی کثیر پیداوار اور اپنے کولھو کے رس میں سے مجھے نذر و نیاز دینے میں دیر نہ کرنا اور اپنے بیٹوں میں سے پہلوٹھے کو مجھے دینا۔ اپنی گایوں اور بھیڑوں میں سے بھی ایسا ہی کرنا۔ سات دن تک تو بچہ اپنی ماں کے ساتھ رہے۔ آٹھویں دن تو اُسے مجھ کو دینا۔ (خروج ۲۲:۲۹)

پیک کی (Peake's) تفسیرِ بائبل میں صفحہ ۲۲۱ پر وضاحت کی گئی ہے:

Every first-born is the property of Yahweh. (...). It [set apart] is the word used also for sacrificing children to Molech. Since the Canaanite practice, resorted to on occasion certainly, was abhorent to Israel, it is unlikely that the term was borrowed from them. (...). Though in Israel the first-born were to be set apart to Yahweh as his, they were not to be given to him by sacrifice, but they were to be 'ransomed' from him, a term which could suggest that they were sacrificed in theory, though not in actual fact. (...). The price of the redemption of the first-born of human beings, which is not stated here, was later fixed at 5 shekels, Num. 18:15f.

ہر پہلوٹھا اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ (...)۔ یہ [الگ کرنا]، وہ لفظ ہے جو بچوں کو مولیخ (ایک عمونی دیوتا، جس کے لیے بچے بھینٹ چڑھائے جاتے تھے اور جسے شریعتِ موسوی میں حرام کیا گیا تھا) پر قربان کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا، کیونکہ یہ کنعانی رسم، جو یقینی طور پر بعض مواقع پر اختیار کی جاتی تھی، بنی اسرائیل کے لیے قابلِ نفرت تھی، یہ بات بعید از قیاس ہے کہ یہ اصطلاح اُن سے لی گئی ہو۔ (...)۔ اگرچہ بنی اسرائیل نے پہلوٹھے بیٹے اللہ تعالیٰ کے لیے الگ کر دیے ہوتے تھے، تاہم انھیں قربانی کے ذریعے سے اسے پیش نہیں کیا جانا ہوتا تھا، بلکہ انھیں اُسے (اللہ تعالیٰ کو) فدیہ دے کر چھڑا لیا جاتا تھا۔ لفظ فدیہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انھیں نظریاتی طور پر تو قربان کر دیا جاتا تھا، تاہم امرِ واقعہ میں نہیں۔ (...)۔ انسانوں کے پہلوٹھے بیٹوں کے فدیے کی قیمت، جو یہاں تو بیان نہیں کی گئی ہے، بعد میں

پانچ شیکل مقرر کی گئی تھی، جیسا کہ بائبل کی کتاب گنتی ۱۸:۵ اور بعد میں درج ہے:

اُن جانداروں میں سے جن کو وہ خداوند کے حضور گذرانتے ہیں جتنے پہلوٹھی کے بچے ہیں [Everything] that first opens the womb of all flesh خواہ وہ انسان کے ہوں خواہ حیوان کے وہ سب تیرے [لاویوں کے] ہوں گے پر انسان کے پہلوٹھوں کے فدیہ لے کر اُن کو ضرور چھوڑ دینا اور ناپاک جانوروں کے پہلوٹھے بھی فدیہ سے چھوڑ دیے جائیں۔ اور جن کا فدیہ دیا جائے وہ جب ایک مہینے کے ہوں تو اُن کو اپنی ٹھہرائی ہوئی قیمت کے مطابق مَقدِس کی مثقال کے حساب سے جو بیس جیرے کی ہوتی ہے چاندی کی پانچ مثقال لے کر چھوڑ دینا۔

'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' (۵:۳۹۶) میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

According to Talmudic tradition, the first-born acted as officiating priests in the wilderness, until the erection of the Tabernacle, when the office was given to the tribe of Levi. In consequence of the deliverance from the tenth plague, when 'the Lord slew all the first-born in the land of Egypt' but spared the first-born of the Israelites, the following commandment was given: 'Sanctify unto me all the first-born whatsoever openeth the womb among the children of Israel, both of man and of beast: it is mine'. The first-born of clean beasts were thus made holy and were unredeemable, while the first-born of unclean beasts and of man had to be redeemed from the priests. (….).

Every Israelite is obliged to redeem his son thirty days after the latter's birth. The mother is exempt from this obligation. The son, if the father fails to redeem him, has to redeem himself when he grows up. The sum of redemption as given in the Bible (Num. 18:16) is five shekels, which should be given to the priest.

تالمودی روایت کے مطابق جب منصب کہانت قبیلہ لاوی کو سونپا گیا تو خیمۂ اجتماع کی تعمیر سے قبل تک صحرا میں پہلوٹھے بیٹے کاہن کی جگہ کام کرتے تھے۔ دسویں وبا سے رہائی کے وطیرے میں جب خداوند نے سرزمین مصر کے تمام پہلوٹھوں کو مار دیا، اور بنی اسرائیل کے اکلوتے بیٹوں کو باقی رہنے دیا تو مندرجہ ذیل فرمان جاری کیا گیا: 'تمام پہلوٹھے، جو بھی اولادِ اسرائیل میں پہلے پیدا ہوں، خواہ وہ انسان ہوں یا جانور، انھیں مقدس قرار دو، وہ میرے ہیں'۔ اس طرح حلال جانوروں کے پہلوٹھے بچے مقدس قرار دیے گئے اور انھیں فدیہ دے کر نہیں چھڑایا جا سکتا تھا، جبکہ حرام جانوروں اور انسانوں کے پہلوٹھے بچوں کا فدیہ دے کر انھیں کاہنوں سے چھڑا لیا جانا ہوتا تھا۔ (….)۔

ہر اسرائیلی اپنے بیٹے کی پیدائش کے تیس دن بعد فدیہ دے کر چھڑانے کا پابند ہے۔ ماں اس فریضے

سے بری الذمہ ہے۔ اگر باپ بیٹے کو فدیہ دے کر نہ چھڑا سکے تو بیٹے کو بڑا ہونے پر اپنا فدیہ خود ادا کر کے اپنے آپ کو چھڑانا ہوگا۔ فدیے کی رقم، جیسا کہ بائبل میں درج ہے (گنتی ۱۸:۱۶)، پانچ شیکل ہے، جو کاہن کو دی جانی چاہیے۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ پہلوٹھے بیٹے کے فدیے سے متعلق یہ قانون خروج سے بعد کے زمانے کے اسرائیلیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا اطلاق حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے پہلوٹھے بیٹے پر نہیں ہوسکتا۔

3. *Enc. Biblica*, 3:2177.
4. Marcus Dods, *The Expositor's B.*, NY, 1903, 1:199-200.
5. *Enc. Biblica*, 3:1525-26.

۶۔ کتابِ مقدس، استثنا ۲۱:۱۵-۱۷۔

7. *The Interpreter 's Dic. of the Bible*, 2:1002-03.
8. *The Book of the Jubilees*, 18:11, in *The Apocrypha and Pseudepigrapha of the OT in Eng*, Ed. R. H. Charles, (Oxford: The Clarendon Press, 1968), 2:40.
9. *The Book of the Jubilees*, 18:15, p. 40.

۱۰۔ پیک کی تفسیر بائبل میں بیان ہے:

The story may also have been intended to explain the early Hebrew custom of ransoming the firstborn of male children (cf. Exod. 34:20).(*Peake's Com. of Bible*, ed. H. H. Rowley, (London: Thomas Nelson & Sons Ltd, 1967), p. 193)

اس کہانی کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ نر بچوں میں سے پہلوٹھے بچے کا فدیہ دینے کی قدیم عبرانی رسم کی توضیح کی جائے۔

۱۱۔ نیو جیروسلم بائبل میں درج ہے:

The story as it stands justifies the ritual prescription for the redemption of the first-born of Israel: like all 'first-fruits' these belong to God. (*The New Jerusalim Bible*, ed Alexander Jones, Darton, (London: Longman & Todd Ltd., 1993), p. 41)

اپنی موجودہ صورت میں یہ کہانی اس رسم کی وجہ جواز پیش کرتی ہے کہ اسرائیل کے پہلوٹھے بچوں کو فدیہ دے کر رہا کرایا جائے، جس طرح تمام 'پہلے پھل' خداوند کی خدمت میں پیش کیے جاتے تھے۔

۱۲۔ کرسچین کمیونٹی بائبل میں وضاحت ہے:

In a first reading the text also justifies the ransom of the firstborn children. As

for all first-fruits they belong to God; but unlike the firstborn of animals which are immolated, children are redeemed (Ex 13:13). (*Christian Community Bible*, ed. Patricia Grogan, Catholic Bishops' Conference of the Philippines, 1995, p. 73)

اولین قراءت میں متن پہلوٹے بچوں کے فدیے کی توجیہ بیان کرتا ہے۔ جہاں تک تمام پہلے پہلے پھلوں کا تعلق ہے، وہ خداوند کی ملکیت ہیں، لیکن جانوروں کے پہلوٹے بچوں کے برعکس جنھیں قربان کرکے جلا دیا جاتا ہے، انسانی بچوں کو فدیہ دے کر چھڑا لیا جاتا ہے۔ (خروج ۱۳:۱۳)

۱۳ کتابِ مقدس، پیدائش ۱۷:۱۹۔

۱۴ کتابِ مقدس، پیدائش ۲۱:۵۔

۱۵ کتابِ مقدس، پیدائش ۱۶:۱۵-۱۶۔

۱۶ کتابِ مقدس، پیدائش ۱۷:۲۴۔

۱۷ کتابِ مقدس، پیدائش ۲۱:۱۳۔

۱۸ کتابِ مقدس، پیدائش ۲۱:۱۳۔

باب چہارم

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے

'اپنے پیارے بیٹے'[1] کی قربانی مطلوب تھی

بائبل کا بیان ہے کہ جس بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کیا جانا تھا، وہ 'اکلوتا بیٹا' تھا، جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام محبت کرتے تھے۔ یہ 'محبت' والا نکتہ نہایت اہم ہے اور اس سے سرسری طور پر نہیں گزر جانا چاہیے۔

'حضرت ابراہیم علیہ السلام کو محبت کس بیٹے سے تھی؟' اس امر کی تحقیق نہایت محنت سے کی جانی چاہیے۔ اور اس پر بے سوچے سمجھے ایک رواں سا تبصرہ نہیں کرنا چاہیے۔ پہلی بات جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے، وہ بائبل کے یہ الفاظ ہیں: 'Whom thou lovest' 'یعنی: جس سے تو محبت کرتا ہے'۔

یہ متعلقہ بیٹے کے لیے محض عام سا سادہ بیان نہیں ہے، بلکہ اس سیاق و سباق میں اس کے امتیازی خصائص کا بیان ہے۔ ان الفاظ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کسی بیٹے پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں چسپاں نہیں کیا جانا چاہیے۔ انھیں بڑی سوچ بچار اور ذمہ داری سے متعین طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلقہ بیٹے ہی پر لاگو کرنا چاہیے۔

جہاں تک حضرت اسحاق علیہ السلام کا تعلق ہے، 'Whom thou lovest' 'یعنی: جس سے تو محبت

کرتا ہے' کے الفاظ ان سے متعلق قرار نہیں دیے جا سکتے۔ بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے لیے واجبی پدرانہ شفقت کا اظہار ضرور کرتے ہوں گے، جو ایک فطری بات ہے، لیکن وہ ان کے لیے کوئی غیر معمولی محبت اور لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے حضرت اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کا ذکر کیا گیا جو درج ذیل ہے:

> اور خدا نے ابرہامؔ سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے، سو اُس کو ساری نہ پکارنا۔ اس کا نام سارہ ہوگا۔ اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا۔ یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ قومیں اس کی نسل سے ہوں گی اور عالم کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے۔[3]

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے کچھ خاص خوشی نہ ہوئی، بلکہ اس آنے والے فرزند کے لیے انھوں نے عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی واحد خواہش اور انتہائی اہم ترجیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، جیسا کہ بائبل میں بھی بیان کیا گیا ہے:

> اور ابرہامؔ نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیلؑ ہی تیرے حضور جیتا رہے۔ تب خدا نے فرمایا کہ بے شک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا۔ تو اس کا نام اضحاقؑ رکھنا اور میں اس سے اور پھر اس کی اولاد سے اپنا عہد، جو ابدی عہد ہے، باندھوں گا۔ اور اسمٰعیلؑ کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔[3]

بائبل کے مفسرین نے اسے بجا طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حق میں محبت کے اظہار کی علامت قرار دیا ہے۔ 'دی نیلسن سٹڈی بائبل' (*The Nelson Study Bible*) میں بیان کیا گیا ہے:

What is more, he still loved his son Ishmael(16:15:17:18).[4]

مزید برآں یہ کہ وہ اب بھی اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام سے محبت کرتے تھے۔

'وکلف کی تفسیر بائبل' (*Wycliffe Bible Com.*) میں یہ بات اس انداز میں بیان کی گئی ہے:

Sarah may have feared that Abraham, out of love for Ishmael, would

give the older lad the prominent place in the inheritance. (...). To drive them out must have been exceedingly grievous to Abraham, for he loved the boy.[5]

ہوسکتا ہے سارہ ڈرتی ہو کہ اسماعیلؑ کی محبت کی وجہ سے ابراہیمؑ ترکے میں بڑے لڑکے کو غالب حصہ دے دیں گے۔ (...)۔ انھیں گھر سے نکال دینے پر ابراہیمؑ کو ضرور شدید دکھ ہوا ہوگا، کیونکہ وہ اس لڑکے سے محبت کرتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام سے محبت کرتے تھے، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے محبت اتنی نمایاں اور واضح تھی کہ حضرت سارہ کو بھی اس کا بخوبی علم تھا۔ دی ڈِووشنل فیملی بائبل (*The Devotional Family Bible*) میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

He [Abraham] bears Ishma'el upon his heart, and expresses a laudable concern for him.[6]

وہ [حضرت ابراہیم علیہ السلام] اسماعیلؑ کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں اور ان کے لیے قابل ستائش محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

مارکس ڈوڈس (Marcus Dods) نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی وہ فرزند تھے جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت زیادہ محبت کرتے تھے، بہت عمدہ توضیحی شذرہ قلم بند کیا ہے۔ اس نے اس شدید محبت کی توجیہ بھی بیان کی ہے۔ وہ رقم طراز ہے:

Abram's state of mind is disclosed in the exclamation: "Oh, that Ishmael might live before Thee!" He had learned to love the bold, brilliant, domineering boy. (...). But there he was, in actual flesh and blood, full of life and interest in everything, daily getting deeper into the affections of Abram, who allowed and could not but allow his own life to revolve very much around the dashing, attractive lad [It may be noted that when Ishma'el was still a 'lad', Isaac had either not been born, or would have been still a suckling baby]. (...). "Oh, that Ishmael might serve Thy turn!" Why call me again off from this actual attainment to the vague, shadowy, non-existent heir of promise, who surely can never have the brightness of eye and force of limb and lordly ways of this Ishmael? Would that what already exists in actual substance before the eye might satisfy Thee and fulfil Thine intention

and supersede the necessity of further waiting! Must I again loosen my hold, and part with my chief attainment?[7]

ابرام کی ذہنی کیفیت ان کے اس فجایئے سے ظاہر ہے 'اے کاش اسماعیلؑ تیرے حضور جیتا رہتا!' ان کے دل میں اس جرأت مند، روشن دماغ اور چھا جانے والی شخصیت کے حامل لڑکے کی محبت جاگزیں ہو چکی تھی۔ (...)۔ وہ [حضرت اسماعیل علیہ السلام] گوشت پوست کے ایک مجسم پتلے کی صورت میں زندہ و پایندہ اس [حضرت ابراہیم علیہ السلام] کے سامنے موجود تھا۔ ہر چیز میں دلچسپی اور ولولۂ حیات سے بھرپور! ابرام کے دل میں اس کی محبت روز بروز گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ان [حضرت ابراہیم علیہ السلام] کی زندگی اس جاذب نظر اور شان والے لڑکے کے گرد ہی گھومتی تھی۔ [ذہن میں رہے کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام ایک 'لڑکے' تھے، حضرت اسحاق علیہ السلام یا تو سرے سے پیدا ہی نہ ہوئے ہوں گے یا پھر ابھی ایک شیر خوار بچے ہوں گے]۔ (...)۔ 'اے کاش کہ اسماعیل ہی تیری خدمت بجا لاتا رہے!' ایسا کیوں ہے کہ مجھے اس واقعی اور حاصل شدہ نعمت سے محروم کیا جا رہا ہے اور مجھ سے ایک مبہم پرچھائیں اور غیر موجود (خیالی) وعدے کے وارث کے متعلق گفتگو کی جا رہی ہے جو یقیناً اس اسماعیل جیسی آنکھوں کی چمک، اعضا کی توانائی اور شاہانہ انداز کا کبھی مالک نہیں ہو سکتا۔ کاش ایسا ہوتا کہ جو (لڑکا) واقعی مجسم طور پر آنکھوں کے سامنے موجود ہے، تُو اسی پر مطمئن ہو جائے اور یہی تیرے مقاصد پورے کرے اور مجھے مزید انتظار کی زحمت گوارا نہ کرنا پڑے۔ کیا اب میں پھر اپنے ہاتھ آئی ہوئی چیز کھو دوں اور اپنی سب سے بڑی حاصل شدہ چیز سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔

ملحوظ خاطر رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے اتنی شدید محبت اس لیے ظاہر کر رہے ہیں، کیونکہ وہ ہونہار ہیں، توانا ہیں اور بھرپور استعداد کے مالک ہیں۔ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ بائبل ڈکشنری' (*Seventh Day Adventist Bible Dic.*) میں درج ہے:

When 13 years later, God announced the imminent birth of Isaac (ch 17: 1-8, 15-17), Abraham interceded on behalf of Ishma'el, whom he dearly loved.[8]

جب تیرہ سال بعد خداوند نے اس بات کا اعلان کیا کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش ہونے

والی ہے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام، جن سے وہ بہت زیادہ محبت کرتے تھے، کے حق میں سفارش کی اور اُن کی وکالت کی۔

ڈاکٹر کوہن (Dr. Cohn) لکھتے ہیں:

I (...) would be satisfied if only Ishma'el lived before Thee.[9]

اگر صرف اسماعیلؑ ہی تیرے حضور جیتا رہے تو میں بہت مطمئن ہوں گا۔

جہاں تک حضرت اسحاق علیہ السلام کا تعلق ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی طرف اس لیے بے التفاتی کا اظہار کرتے تھے کہ ان میں یہ تمام اوصاف موجود نہ تھے۔ بائبل کے علما نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی کمزوریوں کا واضح طور پر اقرار کیا ہے۔ *J. Hastings' Dic. of the Bible* میں بیان کیا گیا ہے:

Isaac is a less striking personality than his father is. Deficient in the heroic qualities, he suffered indisposition from an excess of mildness, and the love of quiet (...). He was rather shifty and timid in his relations with Abimelech (26:1-22), too easily imposed upon, and not a good ruler of his household–a gracious and kindly but not a strong man.[10]

اسحاق کی شخصیت اتنی نمایاں نہیں جتنی ان کے والد کی ہے۔ ان میں دلیرانہ اوصاف کی کمی ہے۔ نرمی اور سکون کی خواہش کی زیادتی کی وجہ سے ان کی شخصیت میں بے دلی کا غلبہ تھا۔ (...)۔ ابی ملک سے اپنے تعلقات کے بارے میں وہ ڈھلمل یقین اور بودے ثابت ہوئے۔ دوسرا آدمی بآسانی ان پر غالب آجاتا تھا اور وہ اپنے گھرانے کے بھی کوئی اچھے حاکم و منتظم نہ تھے۔ وہ فیاض اور نرم دل تو تھے، لیکن مضبوط آدمی نہ تھے۔

ولیم نیل (William Neil) نے بھی حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

Isaac is generally referred to in the commentaries as a colourless personality. Certainly when we compare him with Abraham and Jacob it is impossible to form a clear picture of him. Few stories are recorded about him, presumably because there was little known of him that was worth recording, and in those stories in which he does feature he is generally a minor participant in the narratives dealing with his more notable father or son.[11]

تفسیروں میں (حضرت) اسحاق (علیہ السلام) کا ذکر عام طور پر ایک بے رنگ سی شخصیت کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جب ہم ان کا (حضرت) ابراہیمؑ اور (حضرت) یعقوبؑ سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ ان کی کوئی واضح تصویر پیش کر سکیں۔ ان کے متعلق شاذ ہی کسی واقعے کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کے متعلق کم ہی کوئی ایسی بات معلوم ہے جو قابل تحریر ہو۔ اور جن واقعات میں وہ نمایاں ہوتے بھی ہیں، ان میں عام طور پر ان کا ذکر اپنے شہرہ آفاق والد یا بیٹے کے مقابلے میں محض سرسری سا ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل کے علما کے مطابق حضرتِ اسحاق علیہ السلام کی شخصیت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مقابلے میں کم جاذبِ نظر اور متاثر کن تھی، تاہم اسلامی اقدار و روایات کے لحاظ سے اس کی تائید ممکن نہیں۔ اسلام کے مطابق یہ دونوں ایک ہی مرتبے کے انبیا تھے۔ اب یہ بات کسی طرح موزوں نہیں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے زیادہ محبت اور وابستگی کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہ جسمانی طور پر بھی مضبوط تھے اور عملی تعاون بھی فراہم کر سکتے تھے۔

ایک اور شہادت بھی ہے جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے 'محبت' ثابت ہوتی ہے۔ جب حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ فرمائش کی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہ کو گھر سے نکال دیا جائے، تو اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت دکھ ہوا۔ اس سے ان کی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ شدید محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ بائبل میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اس لیے اس [سارہ] نے [حضرت] ابراہیمؑ سے کہا 'اس نوکرانی اور اس کے بیٹے کو نکال باہر کرو۔ کیونکہ اس نوکرانی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاقؑ کے ساتھ وارث نہیں ہوگا۔ اور [اس] واقعے سے [حضرت] ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے [اسماعیلؑ] کی وجہ سے شدید دکھ پہنچا۔ [ایڈیٹر نے یہاں حاشیے میں لکھا ہے: 'ابراہیمؑ کی نظر میں یہ بہت الم ناک تھا'][12]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے 'محبت' اتنی واضح ہے کہ بائبل کے یہودی مفسرین بھی اس کا ذکر کیے بغیر نہیں رہتے۔ ڈاکٹر کوہن Dr. Cohen رقم طراز ہیں:

Scripture points out that this grief was caused not by the prospect of loosing the woman but on account of Ishmael.[13]

صحیفہ [توریت] اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ [حضرت ابراہیم علیہ السلام کو] یہ دکھ اس عورت [حضرت ہاجرہ] کے کھو دینے پر نہ تھا، بلکہ [حضرت] اسماعیلؑ کی وجہ سے تھا۔

مندرجہ بالا ساری بحث سے یہ بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ 'جس سے تو محبت کرتا ہے' کے الفاظ صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے متعلق کہے جا سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق۔ نیز یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی طور پر صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا، کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'پیارے بیٹے' تھے۔

جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے 'اکلوتے بیٹے' کو قربانی کے لیے پیش کرنے کے موضوع کا تعلق ہے، اوپر کے چار ابواب میں اس پر قدرے سیر حاصل گفتگو کی جا چکی ہے۔ کچھ متعلقہ نکات کا تفصیلی مطالعہ آنے والے ابواب میں پیش کیا جائے گا۔ کتاب کے اس حصے کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے اس واقعے کے اختتامیے اور کہانی کے آخری منظر کے طور پر ایک اختتامی شذرہ قلم بند کیا جائے۔

حضرت ابراہیمؑ 'اکلوتے بیٹے' کے بغیر اکیلے واپس لوٹے

کہانی مندرجہ ذیل آخری جملے پر اختتام پذیر ہوتی ہے:

تب ابرہام اپنے جوانوں کے پاس لوٹ گیا اور وہ اٹھے اور اکٹھے بیر سبع کو گئے اور ابرہام بیر سبع میں رہا (پیدائش ۲۲:۱۹)

آیت پر غور وفکر اور اس کے دیانت دارانہ جائزے سے ایک محتاط قاری کی ان نکات کی طرف رہنمائی ہوتی ہے:

(۱) 'تب ابرہام اپنے جوانوں کے پاس لوٹ گیا' سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھر واپسی کے سفر کے دوران میں 'اکلوتا بیٹا'، خواہ یہ 'اکلوتا بیٹا' کوئی بھی ہو، اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ گنتھر پلاٹ لکھتا ہے:

The text says that Abraham returned from Moriah but omits a mention of Isaac. (…) Isaac did not come back with his father.[14]

متن کہتا ہے کہ ابراہیمؑ موریاہ سے واپس آئے، لیکن اسحاق" کا ذکر حذف کر دیتا ہے۔ (…)۔ اسحاق" اپنے والد کے ساتھ واپس نہیں آئے تھے۔

لفظِ 'اسحاق' کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہے کہ آیت صریحاً بیان کرتی ہے کہ 'اکلوتا بیٹا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ واپس نہیں آیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اُس کی رہائش یہیں موریاہ کے نزدیک تھی۔ اگر یہ 'اکلوتا بیٹا'، جسے قربانی کے لیے پیش کیا جانا تھا، حضرت اسحاق علیہ السلام ہوتے، تو وہ اپنے والد کے ساتھ ضرور واپس بیر سبع جاتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'اکلوتا بیٹا' حضرت

اسماعیل علیہ السلام تھے جو موریاہ کے نزدیک قیام پذیر تھے اور اس طرح اُنھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ واپس نہیں جانا تھا۔

(۲) یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان حبرون میں رہائش پذیر تھا، لیکن وہ اپنا زیادہ وقت بیر سبع میں اپنے ریوڑوں کے ساتھ گزارتے تھے، جبکہ انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کو موریاہ میں آباد کیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے 'اکلوتے بیٹے' اسماعیل علیہ السلام کو اُن کی جائے سکونت موریاہ میں چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

(۳) اگر قربانی کے لیے پیش کیے جانے والے بیٹے اسحاق علیہ السلام ہوتے تو اُن کے لیے یہ بات کسی طرح روا نہ تھی کہ وہ اپنے والد سے کسی ناراضی یا بے التفاتی کا مظاہرہ کرتے اور اُن کے ساتھ نہ جاتے۔

حواشی باب چہارم

۱ اس باب کا موضوع یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا 'پیارا بیٹا' قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور ان کے 'پیارے بیٹے' حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام سے افضل قرار دیا گیا ہے یا حضرت اسحاق علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فروتر ظاہر کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے دونوں انبیائے کرام معصوم ہیں اور یکساں عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ مسلمان ان میں سے کسی کی دوسرے پر فضیلت کے قائل نہیں۔

۲ کتاب مقدس، نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۲۰۰۲، کتاب پیدائش ۱۷:۱۵-۱۶۔

۳ پیدائش ۱۷:۱۸-۲۰۔

4. *The Nelson Study Bible*, p. 43.
5. The *Wycliffe Bible Com.* (Chicago: Moody Press, 1987), p. 26.
6. John Fawsett, *The Devotional Family Bible*, London: 1811, no Paging has been recorded in this 2 centuries old book.
7.Marcus Dods, *The Expositor's Bible*, 1:160.
8. *Seventh Day Adventist Bible Dic. Rvd.* 1979 Edn., p. 526.
9. Dr. Cohen, The Jewish Commentary: *The Soncino Chumash*, p. 81.
10. *J. Hastings' Dic. of the Bible*, Rvd, by Frederic C Grant and H. H. Rowley, (NY: Charles Scribner's Sons, 1963), p. 422.
11. William Neil, *Pocket Bible Com.* (HarperSanFrancisco, 1975), 50.

۱۲ پیدائش ۲۱:۱۰-۱۱۔

13. Dr. Cohen, *Soncino Chumash*, 102.
14. *The Torah A Modern Commmentary*, ed. Gunther Plaut, NY: Union of American Hebrew Congregations, 1981, 152.

باب پنجم

مقامِ قربانی (مروہ یا موریاہ) کا محلِ وقوع

بائبل کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو 'پہاڑوں میں سے ایک پر' جو موریاہ کی سرزمین میں' واقع تھا، اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی پیش کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بائبل میں اس واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر ہے:

اور موریاہ کی سرزمین میں جاؤ اور اسے [اپنے اکلوتے بیٹے کو] وہاں ان پہاڑوں میں سے ایک پر جو میں تمھیں بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر پیش کرو۔[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس لڑکے کے قربانی کے طور پر پیش کیے جانے کا مقام کوئی 'سرزمینِ موریاہ کا پہاڑ' تھا۔ لفظ موریاہ پوری بائبل میں صرف دو مقامات پر استعمال ہوا ہے:

(الف) 'اور تو موریاہ کی سرزمین میں جا'۔ (پیدائش ۲۲:۲)

(ب) سلیمانؑ نے موریاہ پہاڑ میں، یروشلم کے مقام پر، خداوند کا گھر تعمیر کرنا شروع کیا، جہاں اللہ تعالیٰ اس کے باپ داودؑ پر نمودار ہوا تھا، جو جگہ داودؑ نے اورنان یبوسی کے کھلیان میں [اس مقصد کے لیے] تیار کی تھی۔ (۲۔تواریخ ۳:۱)

علما کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا بائبل کے ان دونوں مقامات پر موریاہ کا ذکر ایک ہی محلِ وقوع پر دلالت کرتا ہے یا اس سے مختلف مقامات مراد ہیں۔ 'ہارپر کی بائبل ڈکشنری' کے مطابق ان سے موریاہ کے دو مختلف مقام مراد ہیں (صفحہ ۶۵۴)۔ 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' کا دعویٰ ہے:

Modern scholars who distinguish between these two places advance different theories as to the meaning of the word "Moriah."[2]

جدید علما جو ان دو مقامات کے درمیان امتیاز کرتے ہیں، وہ لفظِ 'موریاہ' کے معنی کے بارے میں مختلف نظریات پیش کرتے ہیں۔

بائبل کے مختلف علما اور مذہبی محققین نے موریاہ کے محل وقوع کی مندرجہ ذیل مقامات پر نشاندہی کی ہے:

۱۔ حبرون کے قریب ایک پہاڑ، جیسا کہ ہیسٹنگز کی نظر ثانی شدہ ڈکشنری میں درج ہے:

some scholars have proposed a location for Moriah on a mountain near Hebron.[3]

کچھ علما نے موریاہ کے محل وقوع کے لیے حبرون کے قریب ایک پہاڑ کے اوپر ایک جگہ تجویز کی ہے۔

۲۔ قدیم شکیم سے چار کلومیٹر شمال مغرب میں نابلوس کے جدید شہر کے قریب کوہِ جریزیم[4] شکیم یروشلم سے قریباً ۵۰ کلومیٹر شمال میں اور سامریہ[5] سے نو کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ جہاں ہیکل سامریہ تعمیر کیا گیا تھا۔

۳۔ کوہِ گلوری جہاں بعد میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کو مصلوب کیے جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، جیسا کہ 'ڈیووشنل فیملی تفسیرِ بائبل' میں درج ہے:

There is no improbability in the general opinion, that the very spot was mount Calvary where Christ the great anti-type was afterwards crucified.[6]

عام رائے یہ ہے کہ وہ جگہ (موریاہ) کوہِ گلوری ہی تھی، جہاں بعد میں حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا تھا۔ اور یہ بات کوئی غیر ممکن بھی نہیں۔

۴۔ یروشلم کے قریب ارونا یبوسی (Araunah the Jebosite) کا کھلیان، جسے حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے خرید لیا تھا اور جہاں بعد میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہیکل تعمیر کیا تھا۔

پہلے تین موریاؤں پر اسی باب میں گفتگو کی جا رہی ہے۔ چوتھے موریاہ پر اگلے باب میں گفتگو ہوگی۔

الف۔ حبرون کے نزدیک ایک پہاڑ پر

جہاں تک حبرون کے نزدیک ایک پہاڑی پر واقع پہلے موریاہ کا تعلق ہے، اس پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں، کیونکہ (۱) بائبل کا کوئی ممتاز عالم اسے قابل ذکر تک نہیں سمجھتا۔ (۲) یہ بائبل کے بھی خلاف ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا تو خود حبرون ہی میں رہائش پذیر ہوئے تھے یا ممرے (Mamre) میں[8]، جو حبرون[9] سے چار کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ بائبل کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے موریاہ کے لیے اپنا سفر اپنی رہائش گاہ سے صبح سویرے شروع کیا تھا اور تین دن کی سخت مسافت کے بعد وہ ابھی تک اپنی منزل مقصود سے بہت ہی دور تھے۔ یہ بات کسی طرح قابل تصور نہیں کہ تین دن کے لگاتار سخت سفر کے بعد بھی وہ اتنی مختصر سی مسافت طے نہ کر سکے ہوں۔

ب۔ کوہِ گلگوری پر، جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

جہاں تک دوسرے موریاہ کا تعلق ہے، جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ وہ کوہ گلگوری پر واقع ہے، جہاں بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا تھا، تو اس پر بھی کسی خاص بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں، کیونکہ (۱) اسے بھی بائبل کے کسی ممتاز عالم نے قابلِ ذکر خیال نہیں کیا اور (۲) یہ نظریہ بائبل کے مندرجات سے بھی کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ (کوہ گلگوری) یا تو یروشلم کے جدید شہر کے اندر، مگر قدیم شہر کی دیواروں سے باہر کسی جگہ واقع تھا یا اس کے کہیں قریب ہی واقع تھا[10]۔ یہ مقام یروشلم، بیرسبع، حبرون یا ممرے، کسی سے بھی بیس میل سے زیادہ دور نہیں۔ اس تک پہنچنے میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چند گھنٹے سے زیادہ نہ لگتے۔ تو پھر بھلا یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ تین دن کے لگاتار اور پُر مشقت سفر کے بعد بھی وہ اتنا مختصر سا فاصلہ نہ طے کر سکے ہوں۔

ج۔ کوہِ جریزیم پر

جہاں تک تیسرے موریاہ کا تعلق ہے، جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ شکیم کے قدیم

شہر کے قریب کوہ جریزیم پر واقع تھا تو اسے سامریوں نے اپنے ہیکل (حرم) کی اہمیت وحرمت قائم کرنے کے لیے ہیکل کے محل وقوع سے منسلک کر دیا تھا۔ 'دی السٹریٹڈ بائبل ڈکشنری' میں درج ہے:

The Samaritan tradition identifies the site with Mt. Gerizim (as though Moriah = Moreh; cf. Gn. 12:6)[11]

سامری روایت اس کا محل وقوع کوہ جریزیم سے منسلک قرار دیتی ہے (گویا کہ موریاہ اور مورہ ایک ہی مقام ہو۔ ملاحظہ کیجیے کتاب پیدائش ۱۲:۶)۔

'ڈملو کی تفسیر بائبل' نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے۔[۱۲]

'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ بائبل ڈکشنری' نے اس موضوع پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

The Samaritans, who consider Mount Gerizim the holy mountain of God, place the sacrifice of Isaac on that mountain, and believe that Moriah was Moreh near Shechem; and that it was the site of the first encampment of Abraham in the land of Canaan, where he built an altar to the true God (Gen 12:6,7). Such an identification, they believe, justifies their separation from Jerusalem, and their right to worship God on Mount Gerizim (see Jn 4:20,21). It is, of course, entirely without support.[13]

سامری لوگ جو کوہ جریزیم کو خداوند کا مقدس پہاڑ تصور کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اسحاقؑ کی قربانی اسی پہاڑ پر پیش کی گئی تھی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ موریاہ ہی وہ مورہ ہے جو شکیم کے نزدیک واقع ہے اور یہ کہ یہ مقام ابراہیمؑ کا سرزمینِ کنعان میں پہلا پڑاؤ تھا۔ جہاں انھوں نے سچے خداوند کے لیے ایک چبوترہ تعمیر کیا تھا (پیدائش ۱۲:۶-۷)۔ ان کا ایمان ہے کہ اس کو یہ شناخت دینا ان کی یروشلم سے علیحدگی اور ان کی کوہ جریزیم پر خداوند کی عبادت کے حق کی وجہ جواز ہے (ملاحظہ کیجیے انجیل یوحنا ۴:۲۰-۲۱)۔ یہ بلاشبہ کسی بھی قسم کی تائید سے عاری ہے۔

'ہیسٹنگز کی نظر ثانی شدہ بائبل ڈکشنری' نے بھی اسی طرح کی بات کی ہے:

There is some similarity between the names of Moriah and 'Moreh,' the latter located near Shechem (Gn 12:6, Dt 11:30) and Mount Gerizim. And it may have been owing to this that the Samaritans have claimed Gerizim as Abraham's mountain (cf Jn 4:20). Gn 22:4 has been often cited to suggest

that Gerizim, a mountain visible for some distance, must be the Moriah of Abraham, because he 'lifted up his eyes and saw the place afar off.'[14]

موریاہ اور مورہ کے ناموں میں کسی قدر مشابہت پائی جاتی ہے۔ موخرالذکر شکیم (پیدائش ۶:۱۲، استثنا ۱۱:۳۰) اور کوہ جریزیم کے نزدیک واقع ہے۔ اور یہی وجہ ہوگی کہ سامریوں نے جریزیم کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ابراہیمؑ کا پہاڑ تھا (دیکھیے انجیل یوحنا ۴:۲۰)۔ پیدائش ۲۲:۴ کو اکثر اس مقصد کے لیے پیش کیا جاتا ہے کہ جریزیم جو کچھ فاصلے سے نظر آنے والا ایک پہاڑ ہے، لازماً ابراہیمؑ والا موریاہ ہے، کیونکہ اس نے 'اپنی نگاہ اٹھائی اور اس جگہ کو بہت دور دیکھا'۔

سامریہ کے لوگ یہودیہ کی جنوبی سلطنت کے شدید مخالف تھے۔ جب کتاب تواریخ کے مصنف نے ہیکل سلیمانی کا موریاہ کے نام کے ساتھ تعلق قائم کیا تا کہ یہودی حرم کی اہمیت اور اس کا تقدس قائم ہو سکے تو اس کے جواب میں سامریوں نے موریاہ کا تعلق کوہ جریزیم پر واقع اپنے حرم کے ساتھ جوڑ دیا۔ ہیسٹنگز کی لغات بائبل میں ایس۔ آر۔ ڈرائیور (S.R.Driver) کی تحریر سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

In view of the rivalry which prevailed in later times between the Samaritans and the Jews, the preference of the former for Gerizim does not count for much; and with regard to the other arguments it may be doubted whether, in a narrative which cannot be by an eye-witness or contemporary of the facts recorded, the expressions used are not interpreted with undue strictness.[15]

بعد کے زمانے میں سامریوں اور یہودیوں کے درمیان جو رقابت جاری و ساری تھی، اس کے پیش نظر اول الذکر (سامریوں) کا جریزیم کو ترجیح دینا کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اور جہاں تک دوسرے دلائل کا تعلق ہے، اس بات میں شک کی پوری گنجائش ہے کہ جو کہانی کسی عینی شاہد کی بیان کردہ نہ ہو یا جو حقائق کسی ہم عصر کے لکھے ہوئے نہ ہوں، کہیں ان کی تاویل میں غیر ضروری سختی تو نہیں برتی گئی۔

سامریوں کے زرخیز دماغ نے اپنے دعوے کے حق میں امکانات تلاش کرنے شروع کیے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ کوئی نظریہ، خواہ کتنا ہی مبہم کیوں نہ ہو، کچھ انوکھے اور جدت پسند 'علما' کی

تائید حاصل کر ہی لیتا ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اختراع کرنے والوں کے مذموم عزائم سے بے خبر بعض غیر متعصب اور انصاف پسند علما اس عجیب نظریے کو معروضی طور پر قبول کر لیتے ہیں اور اس کے حق میں کچھ دلائل بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی طرح چند ایک علما اس کے اندر کسی معقولیت کے امکان کو یکسر رد نہیں کر دیتے، لیکن اس کے باوجود علما کی اکثریت اس نظریے کی حماقت کا شعور حاصل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتی۔ پوری بائبل میں کوہ جریزیم کے لیے کبھی بھی 'موریاہ' کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ تاریخ کے اوراق اور علم کی دنیا میں سامریوں کی اس دیدہ ودانستہ اور اپنے مقاصد کے لیے تراشی ہوئی اختراع کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔

مندرجہ بالا تمام گفتگو سے یہ بات واضح ہے کہ سامریوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اکلوتے بیٹے کو کوہِ جریزیم پر قربانی کے لیے پیش کرنے کے محل وقوع کا دعویٰ بعض علاقائی، فرقہ وارانہ مراسمِ عبادت اور نسلی رقابتوں کی وجہ سے تراشا گیا تھا۔ اس کی کوئی حقیقی بنیاد نہ تھی۔ واضح رہے کہ مورہ کوئی بنجر بیابان نہ تھا۔ یہ ایک زرخیز اور خوبصورت پہاڑی علاقہ تھا، جس کے چاروں طرف گھنے جنگل اور بکثرت سبزہ زار تھے۔ بائبل نے اسے شاہ بلوط کے درختوں سے بھی متعلق قرار دیا ہے۔ عظیم سمندر (بحیرۂ روم) اس کے مغرب میں بہت زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ اس کے مشرق میں تھوڑے ہی فاصلے پر دریائے اردن واقع ہے۔ اس کے شمال مشرق اور جنوب مشرق کی طرف کوئی بیس پچیس میل کے دائرے میں گلیلی کا سمندر اور بحیرۂ مردار واقع ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں کافی وقت سے مقیم تھے، اس لیے اس سے وہ ضرور واقف ہوں گے۔ یہ محض سادگی اور بے خبری ہی ہو سکتی ہے کہ وہ کسی نام نہاد سوختنی قربانی کے لیے ایندھن کی لکڑی کا گٹھا مورہ کی طرف اٹھا کر لائیں۔ یہ تو گویا 'الٹے بانس بریلی کو' والی بات ہوئی۔ مندرجہ بالا تمام مبحث کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف یہ اکیلا نکتہ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے اس جگہ [مورہ] لانے کے امکان کو مسترد کر دیتا ہے۔

میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) میں اپنے آبائی وطن سے ہجرت کرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام

شمال مغرب کی طرف روانہ ہوئے اور فدان آرام کے راستے حاران پہنچے۔ وہاں کچھ دیر قیام کے بعد انھوں نے جنوب مغرب کی سمت اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ حلب، حمص، دمشق وغیرہ کے راستے وہ کنعان کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ کنعان میں ان کا پہلا پڑاؤ مورہ میں ہوا۔ یہاں انھوں نے کچھ عرصے کے لیے اپنے کنبے کے قیام کا بندوبست کیا۔ تب وہ مزید آگے مصر[16] کی طرف بڑھے تاکہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے لیے کوئی موزوں مرکز تلاش کریں۔ یہ دیکھ کر کہ مصر ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے لیے کوئی زرخیز میدان نہ تھا، وہ واپس مورہ آگئے اور کچھ دیر وہاں قیام فرمایا تاکہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے لیے نئے آفاق دریافت کریں۔ ان کے اس تبلیغی مرکز کی تلاش کے سفر کے دوران میں ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ اسی مورہ کے مقام پر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی تبلیغی سرگرمیاں مختلف ممالک میں سرانجام دیں گے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی سرگرمیوں کے لیے ادوم (Edom) کا انتخاب کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی تبلیغ کے لیے سالم[17] (اُن دنوں یروشلم کا نام محض 'سالم' تھا) کے جنوب میں قریباً بیس میل کے فاصلے پر اپنا مرکز قائم کیا۔ اور اپنے خاندان کو ممرے (Mamre)، حبرون (Hebron) اور مکفیلا (Machpelah) کے علاقے میں آباد کیا۔ حبرون سے قریباً پچیس میل جنوب مغرب میں بیر سبع ان کے مویشیوں کے لیے چراگاہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کا خاندان مستقل طور پر یہیں آباد ہو گیا تھا اور مورہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا تھا۔

مورہ کے متعلق مندرجہ بالا معلومات بڑی احتیاط سے اٹلسوں، تفسیروں، ڈکشنریوں، انسائیکلوپیڈیاؤں اور بائبل کے اصل متن جیسے مستند مصادر و مآخذ سے جمع کی گئی ہیں۔ ذیل میں صرف دو مختصر اقتباسات دیے جا رہے ہیں۔ ولیم سمتھ اپنی لغات بائبل میں لکھتے ہیں:

The oak of Moreh was the first recorded halting-place of Abram after his entrance into the land of Canaan. Gen. 12:6. It was at the "place of Shechem," ch. 12:6, close to the mountains of Ebal and Gerizim. Deut. 11:30.[18]

سرزمین کنعان میں داخلے کے بعد ابرام کا پہلا ثابت شدہ پڑاؤ مورہ کا شاہ بلوط تھا (کتاب پیدائش ۶:۱۲)۔ یہ کوہ عبال و جریزیم کے قریب ہی شکیم کے مقام (۶:۱۲) پر واقع تھا (کتاب استثنا

۱۱:۳۰)۔

ریورنڈ اے ایچ گنر (Rev.A.H.Gunner) اور ایف۔ایف بروس (F.F.Bruce) 'السٹریٹڈ بائبل ڈکشنری' میں بیان کرتے ہیں:

Dt. 11:30 makes reference to the 'oak of Moreh' in the district of Gilgal (i.e. the Shechemite Gilgal). It is recorded that Abraham pitched his camp there on arriving in Canaan from Harran, and it was there that God revealed himself to Abraham, promising to give the land of Canaan to his descendants.[19]

کتاب استثنا ۱۱:۳۰ میں مورہ کے شاہ بلوط کا جلجال کے ضلعے (شکیم والے جلجال) میں ذکر کرتی ہے۔ درج ہے کہ ابراہیمؑ نے حاران سے کنعان پہنچنے پر وہاں اپنا کیمپ قائم کیا۔ اسی مقام پر خداوند نے ابراہیمؑ پر اپنا آپ ظاہر کیا (وحی نازل کی) اور سرزمینِ کنعان اس کی نسلوں کو دینے کا وعدہ کیا۔

نوٹ: یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ موریاہ (یا المروہ)، مورہ اور ممرے تین الگ الگ الفاظ ہیں۔ موریاہ (یا المروہ) کی یہ حیثیت کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے اپنے 'اکلوتے بیٹے' کی قربانی کا مقام ہے، یہودی، مسیحی اور مسلم روایت میں مُسلَّم متفق علیہ ہے۔ البتہ یہ کہ اس کا محل وقوع کیا ہے، ایک مختلف فیہ بات ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ مقام مکے کا المروہ ہے اور یہود و نصاریٰ کسی ایک بات پر متفق نہیں ہیں۔ اگرچہ کتاب تواریخ کے مصنف کے نزدیک یہ یروشلم میں وہ جگہ ہے جہاں ہیکل سلیمانی تعمیر کیا گیا تھا، لیکن یہ بیان بوجوہ درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مورہ کا تعلق کوہِ جریزیم سے ہے اور ممرے مکفیلہ اور حبرون کے علاقے میں واقع ہے، یعنی مورہ یروشلم کے شمال میں واقع ہے اور ممرے اس کے جنوب میں۔

حواشی باب پنجم

1. کتابِ مقدس، پیدائش ۲۲:۲۔

2. *The Jewish Enc.*, 9:17.

3. *Hastings Dic. of the Bible Rvd.* by Frederick Grant & H. H. Rowley (NY: Charles Scribner's Sons, 1963), pp. 674f.

4. *New Bible Dic.* II, Ed, N. Hellyer Revision Ed, (Leicestor: Inter-Varsity Press, Eng. 1986), p. 415.

5. *New Bible Dic.*, II. Ed, 1099.

6. John Fawcett, *The Devotional Family Bible Com.* (London: Suttaby, Evance & Co, 1811), Vol 1, no paging.

7. انجیل متی ۲۷: ۳۳-۳۴ کے سلسلے میں 'کرسچن تفسیر بائبل' (*Christian Community Bible*, *Catholic Pastoral Edn*, 1995, p. 66f) میں وضاحت کی گئی ہے:

When they reached the place called Golgotha (or Calvary) which means the Skull, they offered him wine mixed with gall. Jesus tasted it but would not take it.

جب وہ اس جگہ پہنچے جسے 'گلگوتھا' (یا 'کال وری') کہا جاتا تھا، جس کے معنی ہیں 'کھوپڑی'، تو انھوں نے اسے پت ملی ہوئی مے پینے کو دی، مگر اس نے چکھ کر پینا نہ چاہا۔

8. 'ممرے' کے مقام کو 'موریاہ' کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دونوں نام الگ الگ مقامات پر دلالت کرتے ہیں۔ 'دی السٹریٹڈ بائبل ڈکشنری' میں (صفحہ ۹۴۰ پر) ایف ایف بروس رقم طراز ہیں:

[Mamre] A place in Hebron district, W from Machpelah (Gen.23:17. 19; 49:30; 50 :13), associated with Abraham (Gen. 13:18; 14:13; 18:1) and Isaac (Gen. 35:27). Abraham resided for considerable periods under the terebinth of Mamre; there he built an altar, there he learnt of the capture of Lot, there he recieved Yahweh's promise of a son and pleaded for Sodom, and from there he saw the smoke of Sodom and its neighbour cities ascend. The site has been identified at Rametel-Khalil, 4 km N of Hebron.

[ممرے] مکفیلہ سے مغرب میں حبرون کے ضلعے میں ایک مقام [ہے]، جس کا ابراہیمؑ اور اسحاقؑ سے

ایک تعلق ہے۔ ابراہیم قابلِ ذکر عرصے تک ممرے کے بلوط کے زیر سایہ قیام پذیر رہے۔ یہاں انھوں نے قربانی کا ایک چبوترہ تعمیر کیا، یہیں انھیں لوطؑ کی مغلوبیت کا پتا چلا، یہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بیٹے کا وعدہ ہوا اور انھوں نے سدوم کے حق میں (اللہ تعالیٰ سے) گفتگو کی اور یہیں سے انھوں نے سدوم اور اس کے پڑوسی شہروں کا دھواں اٹھتے دیکھا۔ اس مقام کے محل وقوع کی حبرون سے چار کلو میٹر شمال میں رامۃ الخلیل کے مقام پر نشان دہی کی گئی ہے۔

یہی مصنف اپنی کتاب 'Places Abraham Knew' میں صفحات ۴۱، ۴۳ اور ۴۶ پر لکھتا ہے:

In so far as Abraham had a place in Canan which could be called his home, it was at Mamre. His family and household could stay here while he was leading caravans or taking part in pastoral activity elsewhere. (...). To Jews, Christians and Muslims, however, its fame is based on the fact that is was here that Abraham stayed and had those dealings with God which have won for him the name 'The Friend of God'.

اگر ابراہیم کی کنعان میں کوئی ایسی جگہ تھی جسے وہ اپنا گھر کہہ سکتے تو وہ ممرے میں تھی۔ جب وہ کاروانوں کی قیادت کر رہے ہوتے یا کسی اور جگہ اپنے جانوروں کی گلہ بانی کر رہے ہوتے تو ان کا کنبہ اور ان کے گھر والے یہاں قیام کرتے تھے۔ (...)۔ تاہم یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک اس کی شہرت کی بنیاد اس حقیقت پر قائم ہے کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں ابراہیم قیام پذیر ہوئے تھے اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے وہ معاملات ہوئے تھے جن کی وجہ سے انھیں 'خلیل اللہ' کے لقب سے سرفراز کیا گیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ التفات ہے کہ یہ ممرے کسی شاہ بلوط کے درخت کے ساتھ منسلک ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ کوئی ناقابلِ کاشت یا بنجر زمین نہ تھی۔ سوختنی ایندھن وہاں بکثرت دستیاب تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہاں سوختنی قربانی کے لیے لکڑیاں لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس ممرے کا اُس موریاہ سے کوئی تعلق نہیں، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا اور بعض علما کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے۔

9. *New Bible Dic. II Ed.*, 730.

۱۰۔ ہارپر بائبل ڈکشنری میں لفظ 'کال وری' کو (صفحہ ۱۵۰ پر) حضرت یسوع علیہ السلام کے سولی چڑھائے جانے کا مقام قرار دیا گیا ہے:

the site of Jesus' crucifixion. Three gospels recorded both the Semitic name of this site, "Golgotha," and a translation, "Place of the Skull" (Matt. 27:33; Mark

15:22; John 19:17). Luke 23:33 records only a shorter and more accurate translation, "Skull." The name "Calvary" derives from the Vulgate's Latin translation of this word (calvaria). It is likely that the site was so named because of its habitual use for executions. Less likely is an explanation rooted in the physical appearance of the place. Apart from the name very little is confidently known about Calvary. John 19:20 and Jewish and Roman execution customs indicate that it was located outside Jerusalem's city walls. Roman crucifixion customs and the reference to passers-by (Matt. 27:39) also suggest it was near a thoroughfare, while the fact that the cross was visible from afar (Matt. 27:55) could indicate an elevated location. Nevertheless its precise location remains in dispute.

یہ [گلوری] عیسیٰؑ کی [نام نہاد] سولی دیے جانے کی جگہ ہے۔ تین انجیلیوں نے اس مقام کا سامی نام 'گلگوتھا' اور اس کا ترجمہ 'کھوپڑی کی جگہ' دونوں درج کیے ہیں۔ لوقا کی انجیل (۲۳:۳۳) نے صرف ایک مختصر اور نسبتاً زیادہ صحیح ترجمہ 'کھوپڑی' نقل کیا ہے۔ لفظ گلوری بائبل کے لاطینی ترجمے ولگیٹ سے ماخوذ ہے۔ ممکن ہے کہ اس جگہ کا یہ نام اس لیے پڑا ہو کہ یہاں بالعموم سزائے موت پر عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ ایک کم تر امکان یہ بھی ہے کہ اس مقام کی ظاہری صورت کھوپڑی سے ملتی جلتی ہو۔ نام کے علاوہ گلوری کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ انجیل یوحنا (۱۹:۲۰) سے اور یہودیوں اور رومیوں کی سزائے موت دینے کی رسوم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جگہ شہر یروشلم کی دیواروں سے باہر واقع تھی۔ رومیوں کی سولی پر لٹکانے کی رسوم اور انجیل متی (۲۷:۳۹) میں راہ گیروں کے ذکر سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جگہ ایک شارع عام کے قریب واقع تھی۔ اور اس حقیقت سے کہ صلیب دور دراز سے بھی نظر آ رہی تھی (متی ۲۷:۵۵)، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک اونچی جگہ پر واقع تھی، تاہم اس کا صحیح محل وقوع ایک متنازع بات ہی ہے۔

11. *The Illustrated Bible Dic.*, (Inter-Varsity Press, 1980), 2:1025.

۱۲ ڈملو لکھتا ہے:

The Samaritans assert that Mt. Gerizim was the scene of the event, regarding Moriah as Moreh in Shechem (J.R. Dummelow, *A Com. on The Holy Bible*, NY, The Macmillan Co, 1956, 30)

سامریوں کا دعویٰ ہے کہ کوہ جریزیم ہی اس واقعہ کا مقام ہے۔ وہ موریاہ کو شکیم کا مورہ تصور کرتے ہیں۔

13. *Seventh-Day Adventist Bible Dic., Revised Edn.*, Ed. by Siegfried H. Horn (Hagerstown: Review and Herald Publg. Association, 1979), p. 760.

14. *Hastings Dic. of the Bible* Rvd. by Frederick Grant & H. H. Rowley (NY: Charles Scribner's Sons, 1963), pp. 674f.

15. *Hastings Dic of the Bible*, s.v. 'Moriah' by S. R. Driver, 3:437.

۱۶۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خاص مصر نہ ہو۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ جزیرہ نمائے سینا ہو۔

۱۷۔ مکینزی کی لغات بائبل میں بیان کیا گیا ہے:

(Gn 14:18), identified with Jerusalem in Ps 76:3 and in early Jewish tradition, which is accepted by modern interpreters. (J. L McKenzie's Dic. of Bible, 759).

(کتاب پیدائش ۱۴:۱۸)۔ زبور ۷۶:۳ اور قدیم یہودی روایات اس [سالم] کو یروشلم قرار دیتی ہیں اور جدید مفسرین بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔

18. *W. Smith's A Dic. of the Bible*, p. 416.

19. *The Illustrated Bible Dic.*, 2:1025.

باب ششم

یروشلم کے موریاہ ہونے کا دعویٰ

(مقامِ قربانی)

بائبل کے علما کا یروشلم کو موریاہ (مقام قربانی) کا محلِ وقوع قرار دینے کا دعویٰ قدرے تفصیلی بحث کا طالب ہے۔ اصل میں اسے موریاہ کا نام خداوند کے گھر کو، جسے عام طور پر ہیکل کہا جاتا ہے، اہمیت اور تعظیم عطا کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ میکنزی کی لغات بائبل (*McKenzie's Dic. of the Bible*) میں وضاحت کی گئی ہے:

The hill on which Solomon's temple was built is called Moriah (2 Ch 3:1), the only other incidence of the name; but this is in all probability due to the theological invention, which identified the Temple, the place of Yahweh's dwelling and of Israel's worship, with the site of the sacrifice of Isaac.[1]

وہ پہاڑی جس پر ہیکل سلیمانی تعمیر کیا گیا تھا، موریاہ کہلاتی ہے (۲۔تواریخ ۳:۱)۔ بائبل میں صرف یہی وہ دوسرا مقام ہے جس میں یہ نام آیا ہے، لیکن غالب امکان یہی ہے کہ یہ سب کچھ دینیاتی اختراع ہے جس نے خداوند کی جائے قیام اور اسرائیل کے مقامِ پرستش، یعنی ہیکل کو اسحاقؑ کی قربانی کا مقام قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس مقام پر ہیکل تعمیر کیا گیا، پہلے اس کا سرے سے کوئی نام ہی نہ تھا۔ اسے محض شناخت کے لیے 'ارنان یبوسی کا کھلیان' کہا جاتا تھا۔ 'موریاہ' کا نام اس کے ساتھ دھاندلی سے منسوب کیا گیا ہے تاکہ اسے تقدس اور اہمیت دی جائے۔ جی اے برواکس (G.A. Barrois) نے 'انٹرپریٹرز ڈکشنری آف بائبل' (*Interpreter's DB*) میں اس نکتے کی یوں وضاحت کی ہے:

Since the name Moriah appears nowhere else in the texts relative to the topography of Jerusalem, there is good reason to suspect that the author of Chronicles intended to ascribe an early origin to the royal sanctuary, by identifying the unnamed hilltop formerly used as a threshing floor with the mountain in the land of Moriah, where Abraham had made ready to sacrifice his son.[2]

کیونکہ موریاہ کا نام یروشلم کی سرحدوں سے متعلق متون میں کسی اور جگہ نہیں آیا۔ اس لیے یہ شک کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ کتاب تواریخ کے مصنف کی یہ خواہش تھی کہ اس شاہی حرم مقدس کی کوئی پرانی بنیاد ظاہر کی جائے۔ اس طرح اس نے بے نام پہاڑی چوٹی کو جو پہلے ایک کھلیان کے طور پر استعمال ہوتی تھی، مرزمین موریاہ کے پہاڑ سے مشابہ قرار دیا، جہاں ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو قربانی کے لیے تیار کیا تھا۔

کتاب تواریخ کا مصنف، جس نے اس جگہ کے لیے موریاہ کا لفظ استعمال کیا ہے، بذاتِ خود بھی اس جگہ کے لیے یہ نام اپنے بیانات میں کسی اور جگہ استعمال نہیں کرتا، جبکہ اس نے اس جگہ کا متعدد مرتبہ حوالہ دیا ہے۔ اگر اس جگہ کی شناخت موریاہ کے اسم معرفہ کے ساتھ منسلک ہوتی تو کتاب تواریخ کا مصنف دوسرے مقامات پر بھی اسے استعمال کرتا۔ مزید براں اس کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ یروشلم کے شہر میں واقع ہے جو یہودی قوم کے لیے انتہائی اہم شہر تھا۔ پھر اس کے متعلق یہ بھی دعویٰ کیا جاتا تھا کہ یہ ہیکل سلیمانی کا محل وقوع ہے۔ یہ ہیکل قوم یہود کے لیے اپنی تعمیر کے روزِ اول ہی سے ہمیشہ ایک انتہائی اہم عمارت رہا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ پوری بائبل میں اس تحریف شدہ مقام کے علاوہ یہ کسی جگہ بھی موریاہ کے نام سے مذکور نہ ہوتا۔ ذیل میں بائبل سے اس واقعے کا قدرے تفصیلی متن درج ہے تاکہ قاری اس کے پس منظر سے آگاہ ہو سکے:

اور خدا نے ایک فرشتہ یروشلیم کو بھیجا کہ اسے ہلاک کرے اور جب وہ ہلاک کرنے ہی کو تھا تو خداوند دیکھ کر اس بلا سے ملول ہُوا اور اس ہلاک کرنے والے فرشتہ سے کہا بس اب اپنا ہاتھ کھینچ اور خداوند کا فرشتہ یبُوسی اُرنان کے کھلیان کے پاس کھڑا تھا۔ اور داؔؤد نے اپنی آنکھیں اٹھا کر آسمان و زمین کے بیچ خُداوند کے فرشتہ کو کھڑے دیکھا اور اسکے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی جو یروشلیم پر بڑھائی ہوئی

تھی۔تب داؤد اور بزرگ ٹاٹ اوڑھے ہوئے منہ کے بل گرے۔اور داؤد نے خُدا سے کہا کیا میں ہی نے حکم نہیں کیا تھا کہ لوگوں کا شمار کیا جائے؟ گناہ تو میں نے کیا اور بڑی شرارت مُجھ سے ہُوئی پر اِن بھیڑوں نے کیا کیا ہے؟ اَے خُداوند میرے خُدا تیرا ہاتھ میرے اور میرے باپ کے گھرانے کے خِلاف ہو، نہ کہ اپنے لوگوں کے خِلاف کہ وہ وبا میں مُبتلا ہوں۔تب خُداوند کے فرِشتہ نے جاد کو حُکم کیا کہ داؤد سے کہے کہ داؤد جا کر یبُوسی اُرنان کے کھلیہان میں خُداوند کے لیے ایک قُربان گاہ بنائے۔اور داؤد جاد کے کلام کے مُوافق جو اُس نے خُداوند کے نام سے کہا تھا گیا۔اور اُرنان نے مُڑ کر اُس فرِشتہ کو دیکھا اور اُسکے چاروں بیٹے جو اُس کے ساتھ تھے چھپ گئے۔اُس وقت اُرنان گیہُوں داؤتا تھا۔اور جب داؤد اُرنان کے پاس آیا تب اُرنان نے نِگاہ کی اور داؤد کو دیکھا اور کھلیان سے باہر نکل کر داؤد کے آگے جُھکا اور زمین پر سرنگون ہو گیا۔تب داؤد نے اُرنان سے کہا کہ اِس کھلیہان کی یہ جگہ مُجھے دے دے تاکہ مَیں اِس میں خُداوند کے لیے ایک قُربان گاہ بناؤں۔تُو اِس کا پُورا دام لے کر مُجھے دے تاکہ وبا لوگوں سے دُور کر دی جائے۔اُرنان نے داؤد سے کہا تُو اِسے لے لے اور میرا مالِک بادشاہ جو کُچھ اُسے بھلا معلوم ہو کرے۔دیکھ! میں اِن بَیلوں کو سوختنی قُربانیوں کے لیے اور داؤنے [گاہنے] کے سامان ایندھن کے لیے اور یہ گیہُوں نذر کی قُربانی کے لیے دیتا ہوں۔میں یہ سب کُچھ دِیے دیتا ہوں۔داؤد بادشاہ نے اُرنان سے کہا نہیں نہیں بلکہ میں ضرور پُورا دام دے کر تُجھ سے خریدُوں گا کیونکہ مَیں اُسے جو تیرا مال ہے خُداوند کے لیے نہیں لینے کا اور نہ بغیر خرچ کیے سوختنی قُربانی چڑھاؤں گا۔سو داؤد نے اُرنان کو اُس جگہ کے لیے چھ سَو مِثقال سونا تول کر دیا۔اور داؤد نے وہاں خداوند کے لیے مذبح بنایا اور سوختنی قُربانیاں اور سلامتی کی قُربانیاں چڑھائیں اور خداوند سے دُعا کی اور اس نے آسمان پر سے سوختنی قُربانی کے مذبح پر آگ بھیج کر اُس کو جواب دیا۔اور خداوند نے اُس فرِشتہ کو حُکم دیا۔تب اُس نے اپنی تلوار پھر میان میں کر لی۔اُس وقت جب داؤد نے دیکھا کہ خُداوند نے یبُوسی اُرنان کے کھلیہان میں اُس کو جواب دیا تھا تو اس نے وہیں قُربانی چڑھائی۔[۳]

مندرجہ بالا بیان میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ ان چند سطور میں موریاہ کے متنازعہ محلِ وقوع کا گیارہ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔یہاں اس مقام کے لیے جو مختلف نام استعمال کیے گئے ہیں، وہ ہیں (۱) اورنان یبوسی کا کھلیان، یا محض (۲) کھلیان، (۳) اس کھلیان کی جگہ، (۴) جگہ، (۵) یہ، (۶)

وہاں اور (۷) اس میں، لیکن پورے بیان میں ایک مرتبہ بھی اس کو 'موریاہ' کے اسم معرفہ کے ساتھ منسوب نہیں کیا گیا۔ مزید یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اس مقام کے لیے یہ مختلف الفاظ مختلف لوگوں نے استعمال کیے ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے (اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی فریق بھی یہ نہیں جانتا کہ اس مقام کا 'موریاہ' نامی کوئی اسم معرفہ بھی ہے):

الف 'اورنان یبوسی کا کھلیان' کے الفاظ (۱) ایک مرتبہ کتاب کے مدیر نے (۲) ایک مرتبہ حضرت داوٗدؑ نے اور (۳) ایک مرتبہ خداوند کے فرشتے نے [اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند کا فرشتہ بھی (اور کیونکہ وہ خداوند کی طرف سے بول رہا تھا، اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے خداوند خود بھی) نہیں جانتا تھا کہ ہیکل کے اس محل وقوع کا نام 'موریاہ' تھا] (کل تین مرتبہ)،

ب 'کھلیان' کا لفظ صرف ایک مرتبہ، اور وہ کتاب کے مدیر نے،

ج 'اس کھلیان کی جگہ' کے الفاظ صرف ایک مرتبہ، اور وہ حضرت داوٗدؑ نے،

د 'اس میں' کے الفاظ صرف ایک مرتبہ، اور وہ بھی حضرت داوٗدؑ نے،

ہ لفظ 'یہ': (۱) دو مرتبہ حضرت داوٗدؑ نے اور (۲) ایک مرتبہ ارنان یبوسی نے (کل تین مرتبہ)،

و لفظ 'وہاں' صرف ایک مرتبہ، اور وہ کتاب کے مدیر نے،

ز 'جگہ' کا لفظ صرف ایک مرتبہ، اور وہ بھی کتاب کے مدیر نے استعمال کیا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اس بات کا علم نہ تو کتاب کے مؤلف کو تھا، نہ حضرت داوٗد علیہ السلام کو تھا، نہ اورنان یبوسی کو تھا اور نہ خداوند کے فرشتے کو اور چونکہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام کر رہا تھا تو گویا نعوذ باللہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کو بھی اس کا علم نہ تھا کہ اس جگہ کا نام، جہاں بعد میں ہیکل سلیمانی نے تعمیر ہونا تھا، 'موریاہ' تھا۔ یہ بات قطعی طور پر ناقابلِ یقین ہے۔

اگر اس مقام کا نام 'موریاہ' ہوتا اور وہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام یا اس سے بھی پہلے کے زمانے سے اور وہ بھی ان کے اس مقام پر اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی جیسے عظیم الشان واقعے کے سلسلے

میں، تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ خداوند کا فرشتہ اور حضرت داؤد علیہ السلام اور کتاب کا مؤلف اور اس جگہ کا مالک اورنان یبوسی، سب لوگ اس مقام کے بارے میں ایسی حقارت اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے کہ اس پورے بیان میں کسی جگہ اس کے نام کا ذکر تک گوارا نہ کرتے۔

جوزیفس نے بھی اپنی کتاب 'Antiquities' میں یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس سے اس نکتے پر مزید روشنی پڑتی ہے:

When God heard his [David's] supplication, he caused the pestilence to cease; and sent Gad the prophet to him, and commanded him to go up immediately to the threshing-floor of Araunah the Jebosite, and build an altar there to God, and offer sacrifices. When David heard that, he did not neglect his duty, but made haste to the place appointed him. Now Araunah was threshing wheat; and when he saw the king and all his servants coming to him, he ran before, and came to him (...). Now Araunah inquired, Wherefore is my lord come to his servant? He answered, To buy of him the threshing-floor, that he might therein build an altar to God, and offer a sacrifice. He replied, That he freely gave him both the threshing-floor, and the ploughs and the oxen for a burnt offering; and he besought God graciously to accept his sacrifice; (...); and when Araunah said he would do as he pleased, he bought the threshing-floor of him for fifty shekels; and when he had built an altar, he performed divine service, and brought a burnt offering, and offered peace-offerings also. (...). Now when king David saw that God had heard his prayer, and had graciously accepted of his sacrifices, he resolved to call that entire place The Altar of all the People, and to build a temple to God there;[4]

جب خداوند نے اس [حضرت داؤد علیہ السلام] کی التجا سنی تو اس نے اس وبا کے ختم ہونے کا حکم فرمایا اور جد نامی پیغمبر کو اس کے پاس بھیجا اور اسے [حضرت داؤد علیہ السلام کو] حکم دیا کہ وہ فوری طور پر اروناہ یبوسی کے کھلیان پر جائیں اور وہاں خداوند کے لیے ایک چبوترہ تیار کریں اور قربانیاں پیش کریں۔ جب حضرت داؤدؑ نے یہ سنا تو اس نے اپنے فریضے میں کوئی کوتاہی نہ کی، بلکہ فوری طور پر مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب اروناہ وہاں گندم کی گہائی کر رہا تھا۔ جب اس نے بادشاہ [حضرت داؤد علیہ السلام] اور اس کے تمام خدم و حشم کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ آگے دوڑا اور اس کے پاس آیا۔ (...)۔ اب اروناہ نے دریافت کیا میرا آقا اپنے غلام کی طرف کس لیے تشریف لایا ہے؟

اس [حضرت داؤدؑ] نے جواب دیا کہ تم سے یہ کھلیان خریدنے کے لیے [آیا ہوں]۔ تاکہ یہاں خداوند کے لیے ایک چبوترہ تعمیر کروں اور قربانی پیش کروں۔ اس نے جواب دیا کہ وہ خوشی سے یہ کھلیان اور ہل اور یہ بیل سوختنی قربانی کے لیے پیش کرتا ہے۔ اور اس نے خداوند سے التجا کی کہ وہ اپنے فضل سے اس کی (یہ) قربانی قبول فرمائے۔ (...)؛ اور جب اروناً نے کہا کہ جیسے آپ کی خواہش ہے میں ویسے ہی کروں گا تو انھوں [حضرت داؤدؑ] نے اس سے یہ کھلیان پچاس شیکل میں خرید لیا۔ اور جب اس نے ایک چبوترہ تیار کر لیا تو اس نے خدا کی عبادت کی اور ایک سوختنی قربانی لایا اور امن کی قربانیاں بھی پیش کیں۔ (...)۔ اب جب بادشاہ داؤدؑ نے دیکھا کہ خداوند نے اس کی دعا سن لی اور اپنے فضل سے اس کی قربانیاں قبول کر لیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس تمام جگہ کا نام 'تمام لوگوں کا (عبادت و قربانی کا) چبوترہ' (The Alter of all the People) رکھے گا اور وہاں خداوند کا ایک ہیکل تعمیر کرے گا۔

پچھلی عبارت کی طرح اس مندرجہ بالا عبارت میں بھی اس مقام کا، جسے کتاب تواریخ کے مصنف نے متنازع طور پر 'موریاہ' کا نام دیا ہے، سات مرتبہ ذکر آیا ہے، لیکن کسی ایک جگہ بھی اس نے اس کا ذکر 'موریاہ' کے نام سے نہیں کیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب بادشاہ حضرت داؤدؑ خود اس جگہ کے لیے کوئی نام تجویز کرتے ہیں تو وہ اسے 'تمام لوگوں (کی عبادت و قربانی) کا چبوترہ (The Alter of all the People)' کا نام دیتے ہیں۔ اگر یہ وہ مقدس جگہ ہوتی جس کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی پہلے سے 'موریاہ' ہوتا اور جس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے پہلونٹے، اکلوتے اور پیارے بیٹے کی قربانی جیسی عظیم الشان روایت منسوب ہوتی تو حضرت داؤد علیہ السلام کو اس نام کا لازماً علم ہوتا اور وہ اس جگہ کے لیے یقیناً یہی نام استعمال کرتے۔ وہ اس اہم نام کے ذکر کو ہرگز نظر انداز نہ کرتے اور اسے 'تمام لوگوں (کی عبادت و قربانی) کا چبوترہ' جیسے ادنیٰ قسم کے نام میں تبدیل کرنے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی قابل لحاظ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ یا تو حبرون (جسے آج کے دور میں الخلیل کہتے ہیں) میں رہتے تھے یا ممرے میں جو حبرون سے قریباً تین کلومیٹر شمال میں

واقع تھا۔ ان کے مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی چراگاہیں بیر سبع کے مقام پر تھیں جو حبرون سے قریباً پچیس میل جنوب میں واقع ہے۔ یروشلم اور حبرون کے درمیان بیس میل سے زیادہ کا فاصلہ نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صبح سویرے سفر کے لیے نکلے تھے جس سے ان کی مستعدی، اشتیاق، ذوقِ عمل اور پرہیزگاری ظاہر ہوتی ہے۔ اگر انھوں نے اپنا سفر حبرون سے شروع کیا ہوتا تو انھیں صرف بیس میل کا سفر طے کرنا تھا۔ اگر وہ ممرے سے روانہ ہوتے تو ان کے سامنے صرف اٹھارہ میل کا سفر تھا۔ اگر وہ بیر سبع سے چلے تھے تو انھیں قریباً چالیس میل کا سفر طے کرنا تھا۔ ان کے سفر کا نقطۂ آغاز جو کچھ بھی ہو، کیونکہ وہ گدھے پر سفر کر رہے تھے اور انھوں نے اپنے سفر کا آغاز صبح سویرے ہی کر دیا تھا اور وہ یہ سفر بڑے ذوق وشوق اور جذبے سے سرانجام دے رہے تھے[5]، تو اگر ان کی منزل مقصود یروشلم ہوتی (جو ان کی ہر ممکن رہائش گاہ سے اٹھارہ سے پتالیس میل کے اندر اندر واقع تھی) تو انھیں اس تک پہنچنے میں ایک یا دو دن لگتے، لیکن بائبل کا بیان یہ ہے کہ تین دن کے سفر کے بعد بھی وہ ابھی تک مقررہ مقام سے بہت ہی دور تھے۔ اس کا مطلب ہوا کہ، جیسا کہ 'نیو جیروم ببلیکل تفسیر' میں بیان کیا گیا ہے، انھیں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں قریباً سات دن لگے ہوں گے[6]۔ اس طرح کسی صورت میں بھی یہ منزل یروشلم نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو مقام حقیقت میں منزلِ مقصود تھا، وہ اتنے طویل فاصلے پر واقع تھا کہ وہاں تک پہنچنے میں اتنا لمبا عرصہ درکار تھا (جبکہ یروشلم کسی طرح بھی ایک دو دن کے فاصلے سے زیادہ دور نہ تھا)۔ کوئی شخص 'نیو جیروم تفسیر بائبل' سے اتفاق کرے یا نہ کرے، لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ لگاتار تین دن[7] کے ذوق وشوق اور جذبے کے ساتھ کیے گئے سفر کے بعد بھی اپنی منزل تک نہیں پہنچے تھے اور ابھی تک اپنی منزل مقصود سے بہت دور تھے۔ اس طرح یہ نظریہ کہ موریاہ یروشلم کی پہاڑی چوٹی پر واقع تھا، باطل قرار پاتا ہے، کیونکہ یروشلم ایک دو دن کے سفر سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ یہ ابہام اور پیچیدگی بائبل کے علما کی نظر سے بھی اوجھل نہیں رہی۔ 'السٹریٹڈ بائبل ڈکشنری' میں درج ہے:

The only other mention of the name occurs in 2 Ch. 3:1, where the site

of Solomon's Temple is said to be on mount Moriah, on the threshingfloor of Ornan the Jebusite where God appeared to David (...). It should be noted that no reference is made here to Abraham in connection with this site. It has been objected that Jerusalem is not sufficiently distant from S Philistia to have required a 3 day's journey to get there [not to say of three days, the actual journey which is allegedly claimed to be undertaken, was of not less than a week, as observed by the New Jerome B.C whereas, in view of the earnestness of Abraham and the distance to be covered being small, it could not have taken him more than one day, had the destination been Jerusalem.], and that one of the characteristics of Jerusalem is that the Temple hill is not visible until the traveler is quite close, so that the correctness of the Biblical identification is called in question.[8]

اس نام کا واحد دوسرا ذکر ۲۔تواریخ ۳:۱ میں آیا ہے، جہاں ہیکل سلیمانی کا محل وقوع 'ارنان یبوسی کے کھلیان' پر واقع کوہ 'موریاہ' پر بتایا گیا ہے، [اور یہ وہی جگہ ہے] جہاں خداوند داؤدؑ پر نمودار ہوا تھا۔ (...)۔ یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس محل وقوع کے سلسلے میں ابراہیمؑ کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یروشلم جنوبی فلسطیہ سے اتنا زیادہ دور نہیں کہ وہاں پہنچنے میں تین دن درکار ہوں[9]، اور یہ کہ یروشلم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب تک کوئی مسافر ہیکل کی پہاڑی کے بالکل قریب نہ پہنچ جائے، وہ اسے دکھائی نہیں دیتی۔ اس طرح بائبل کی اس مقام کی نشان دہی کا درست ہونا محل نظر ہے۔

پیک (Peake) کی تفسیر بائبل میں بھی اس موضوع پر معقول انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ اُس کا بیان ہے:

In v. 2 the scene of the episode is said to be a mountain 'in the land of Moriah', and it is possible that these words and the obscure phrase in v. 14, 'in the Mount (i.e the Temple Mount) where Yahweh is seen.' (where the Hebrew text has evidently suffered some corruption), may have been inserted by the Priestly editor to carry back the sanctity of the Temple site to the age of Abraham. But it is impossible that the Temple Mount at Jerusalem could have been the scene of the incident for various reasons.[10]

دوسری آیت میں اس واقعے کا منظر 'موریاہ کی سرزمین میں ایک پہاڑ' بیان کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ الفاظ اور آیت نمبر ۱۴ کے مبہم سے الفاظ 'اُس پہاڑ (یعنی ہیکل والے پہاڑ) میں جہاں

اللہ تعالیٰ کو دیکھا گیا' (جہاں عبرانی متن میں صریحاً تحریف واقع ہوئی ہے)، پریسٹلی ایڈیٹر کی طرف سے اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ جس سے اُس کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہیکل کے محلِ وقوع کا تقدس [حضرت] ابراہیمؑ کے عہد سے جوڑا جا سکے، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر یہ بات ناممکن نظر آتی ہے کہ یروشلم کے مقام پر واقع ہیکل کی پہاڑی وہی جگہ ہو جہاں یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔

مندرجہ بالا معلومات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہاڑ کی اُس چوٹی کا نام، جس پر ہیکل سلیمانی تعمیر کیا گیا تھا' ارنان یبوسی کا کھلیان' تھا، نہ کہ موریاہ۔ کتاب تواریخ کے مصنف نے دیدہ ودانستہ غلط طور پر ہیکل کے محلِ وقوع کو تقدس اور اہمیت دینے کے لیے اسے ہیکل کے ساتھ منسوب کر دیا ہے۔ ہیکل سلیمانی کے محلِ وقوع پر کسی 'موریاہ' کے موجود ہونے کا تصور زمینی حقائق کے قطعی طور پر خلاف ہے اور محض جعل سازی پر مبنی ہے۔ ایس آر ڈرائیور نے 'ہیسٹنگز بائبل ڈکشنری' میں صاف لکھا ہے کہ موریاہ کے یروشلم پر واقع ہونے کا نظریہ صرف کتاب تواریخ کے مصنف کی اختراع ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دعویٰ صریحاً ایک مشکوک نوعیت کا معاملہ ہے۔ وہ یروشلم کے 'موریاہ' کا مقام ہونے کے امکان کو اس حقیقت کی بنا پر رد کر دیتا ہے کہ یہ کسی دور دراز مقام سے نظر نہیں آ سکتا، جبکہ بائبل کا بیان ہے کہ 'تب تیسرے دن [حضرت] ابراہیمؑ نے اپنی نگاہ اٹھائی اور اس مقام کو بہت دور دیکھا'۔ اس کے ملاحظات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

What was originally denoted by this designation is very obscure. It is indeed evident that in 2Ch 3:1 the Temple hill is referred to; but this does not settle the sense of the expression 'land of Moriah' in Gn 22:2: the Chronicler may, in common with the later Jews, have supposed that that was the scene of the sacrifice of Isaac, and borrowed the expression from Gn 22:2- perhaps to suggest that the spot was chosen already by 'J' in the patriarchal age. (...). It is remarkable that, though it is here implied that it is well known to Abraham, the region is not mentioned elsewhere in the OT. It is difficult, under the circumstances, not to doubt the originality of the text; (...); Gerizim, moreover, is an elevation which a traveler approaching from the S. might 'lift up his eyes' (22:4) and see conspicuously at a distance, which is not the case with Jerusalem.[لے]

یہ نام ابتدا میں کس چیز کی طرف دلالت کرتا تھا، اس کا جواب بہت مبہم ہے۔ یہ بات تو یقینی

طور پر ظاہر ہے کہ ۲۔تواریخ ۳:۱ میں ہیکل کی پہاڑی کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن اس سے کتاب پیدائش ۲۲:۲ کے الفاظ 'سرزمینِ موریاہ' کا مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ بعد کے یہودیوں کی طرح کتاب تواریخ کے مصنف نے بھی یہ فرض کر لیا ہوگا کہ اس سے [حضرت] اسحاقؑ کی قربانی کا منظر مراد ہے۔ اور اس نے یہ الفاظ کتاب پیدائش ۲۲:۲ کے الفاظ سے مستعار لیے ہوں گے۔ اس سے اس کی غرض شاید اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہو کہ یہ محلِ وقوع پہلے ہی سے بزرگ آبا کے دور سے اللہ تعالیٰ نے چن رکھا تھا۔ (...)۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ اس عبارت میں یہ بات مضمر ہے کہ [حضرت] ابراہیمؑ اس (جگہ) سے بخوبی آشنا تھے، [لیکن] عہد نامہ قدیم میں اس خطے کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ ان حالات کے تحت اس متن کی صداقت پر شک نہ کرنا بہت مشکل ہے۔ (...)۔ مزید براں جریزیم ایک بلند جگہ ہے جسے جنوب کی طرف سے آنے والا مسافر، 'اپنی نگاہ اٹھائے' (۲۲:۴) تو نمایاں طور سے ایک فاصلے پر دیکھ سکتا تھا، جبکہ یروشلم کے معاملے میں یہ صورت حال نہیں۔

ہیسٹنگز کی نظر ثانی شدہ لغاتِ بائبل میں ایل ریڈ اور اے ایچ میکیلیل 'موریاہ' پر اپنے مقالے میں بیان کرتے ہیں کہ موریاہ کے ہیکل سلیمانی کے محلِ وقوع سے تعلق کی روایت کا کوئی ثبوت نہیں:

The Chronicler (2 Ch 3:1) leaves no doubt concerning the Jewish tradition that Mount Moriah was the Temple hill where Solomon built the house of the Lord in Jerusalem and the place of David's theophany. Efforts to identify the source of this tradition have been unsuccessful. [12]

کتاب تواریخ کا مصنف (۲۔تواریخ ۳:۱) اس یہودی روایت کے بارے میں کوئی شک باقی نہیں چھوڑتا کہ موریاہ ہیکل کی وہ پہاڑی تھی جہاں سلیمانؑ نے خداوند کا گھر تعمیر کیا تھا اور جہاں داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ کی تجلی نصیب ہوئی تھی۔ اس روایت کے ماخذ کی نشان دہی کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔

مائیکل ایوی یونا 'انسائیکلوپیڈیا جوڈائیکا' میں بیان کرتا ہے کہ موریاہ کو یروشلم میں اورنان یبوسی کا کھلیان قرار دینا ایک دور کی کوڑی ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ ہیکل سلیمانی کی اہمیت اجاگر کی جائے:

The assumption that Abraham intended to sacrifice Isaac on the threshing floor of Jebus (Jerusalem), in full view of the Canaanite city, is farfetched; nor is the Temple Mount visible from afar, as it is hidden by the higher mountains around it. It seems more probable that the biblical story left the location of Moriah deliberately vague; the importance of the

sacrifice of Isaac in the series of covenants between God and Israel made it natural [to the later redactors of the Bible] that at an early time this supreme act of faith was located on the site destined to become the most holy sanctuary of Israel, the Temple of Solomon, just as the Samaritans transferred the act to their holy mountain, Mt. Gerizim.[۱۱]

یہ مفروضہ کہ [حضرت] ابراہیمؑ کا ارادہ اسحاقؑ کو جیبوس (یروشلم) کے کھلیان پر قربان کرنا تھا، اس کنعانی شہر کے پورے منظر کے پیشِ نظر، ایک دور کی کوڑی ہے۔ ہیکل کی پہاڑی دور سے نظر نہیں آتی، کیونکہ اس کے اردگرد جو اونچے اونچے پہاڑ ہیں، انھوں نے اسے چھپا رکھا ہے۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے کہ بائبل نے اس کہانی کے بیان میں موریاہ کے محل وقوع کو جان بوجھ کر مبہم رکھا ہے۔ خداوند اور بنی اسرائیل کے مابین متعدد معاہدوں کے تسلسل میں اسحاقؑ کی قربانی کی اہمیت کے پیشِ نظر [بائبل کے بعد کے مؤلفین کو] یہ بات فطری محسوس ہوئی کہ ایمان کا یہ انتہائی عظیم الشان عمل پرانے زمانے میں کسی ایسی جگہ رونما ہوا ہو جسے بعد میں بنی اسرائیل کا انتہائی مقدس حرم یعنی ہیکلِ سلیمانی بننا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے، جس طرح سامریوں نے یہ عمل اپنے مقدس پہاڑ کوہِ جریزیم کی طرف منتقل کر دیا تھا۔

'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ بائبل انسائیکلوپیڈیا' میں وضاحت ہے:

This land is mentioned only here [Gen. 22:2], and there is little to guide us in trying to identify it. A late writer (2 Chronicles 3:1) applies the name of Moriah to the mount on which Solomon's Temple was built, possibly associating it with the sacrifice of Isaac. A similar association with this mountain may have been in the mind of the writer of Genesis 22 (see 22:14), who, of course, wrote long after the events described (Driver). (...). The description could hardly apply to Jerusalem in any case, as it could not be seen 'afar off' by one approaching either from the South or the West. (...). With our present knowledge we must be content to leave the question open (W. Ewing).[۱۴]

اس سرزمین کا صرف یہیں ذکر کیا گیا ہے [پیدائش ۲۲:۲] اور اس کے تعین کی کوششوں میں کوئی چیز ہماری رہنمائی نہیں کرتی۔ بعد کا ایک مصنف (۲۔تواریخ ۳:۱) موریاہ کے نام کا اطلاق اُس پہاڑ پر کرتا ہے جس پر ہیکلِ سلیمانی تعمیر کیا گیا تھا۔ ممکن یہ ہے کہ وہ اسے اسحاقؑ کی قربانی سے متعلق قرار دیتا ہے۔ امکان یہ ہے کہ کتاب پیدائش باب ۲۲ (دیکھیے ۲۲:۱۴) کے مصنف کے ذہن

میں بھی، جس نے بیان کردہ یہ واقعات یقیناً طویل عرصے کے بعد لکھے، اس پہاڑ کے ساتھ اسی طرح کا تعلق موجود ہو (ڈرائیور)۔ (...)۔ بہر صورت اس بیان کا اطلاق یروشلم پر مشکل ہی سے کیا جاسکتا تھا، کیونکہ اس کے متعلق جنوب یا مغرب کی طرف سے آنے والا کوئی ایسا شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُس نے اسے 'بہت دور' سے دیکھا۔ (...)۔ اپنے موجودہ علم کی روشنی میں ہمیں اس سوال کو کھلا ہی چھوڑ دینے پر مطمئن ہو جانا چاہیے (ڈبلیو ای ونگ)۔

پوری بائبل میں صرف کتاب تواریخ ہی ہے جو 'موریاہ' کو ہیکل سلیمانی کا محلِ وقوع قرار دیتی ہے (۲۔ تواریخ ۳:۱)۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کتاب تواریخ کا یہی مؤلف جب پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کی اور نان یبوسی سے اس مقام کی خرید کا ذکر کرتا ہے (۱۔ تواریخ ۲۱: ۱۵ تا ۲۸) تو اس مقام کے لیے جہاں بعد میں ہیکل سلیمانی نے تعمیر ہونا تھا، 'موریاہ' کا نام نہیں لیتا۔ وہ اپنے پورے بیان میں متعدد مرتبہ اس مقام کے لیے محض 'اورنان یبوسی کا کھلیان' کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اگر اس جگہ کا نام 'موریاہ' ہوتا تو وہ لازمی طور پر صراحت سے یہ نام استعمال کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قصے کے سلسلے میں کتاب تواریخ کے مؤلف کا ماخذ ۲۔ سموئیل ہے۔ اور وہ یہ قصہ ۲۔ سموئیل ۲۴: ۱۶۔ ۲۵ سے نقل کرتا ہے۔ وہاں بھی اس مقام کے لیے لفظ 'موریاہ' کا کسی جگہ بھی ذکر نہیں ہے، مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی یہی ظاہر ہے:

اور جب فرشتہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ یروشلیم کو ہلاک کرے تو خداوند اس وبا سے ملول ہوا اور اس فرشتہ سے جو لوگوں کو ہلاک کر رہا تھا کہا بس ہے، اب اپنا ہاتھ روک لے۔ اس وقت خداوند کا فرشتہ یبوسی ارو ناہ کے کھلیہان کے پاس کھڑا تھا۔ اور داؤد نے جب اس فرشتہ کو جو لوگوں کو مار رہا تھا، دیکھا تو خداوند سے کہنے لگا، دیکھ گناہ تو میں نے کیا اور خطا مجھ سے ہوئی پر ان بھیڑوں نے کیا کیا ہے؟ سو تیرا ہاتھ میرے اور میرے باپ کے گھرانے کے خلاف ہو۔

اسی دن جاد نے داؔؤد کے پاس آکر اس سے کہا، جا اور یبوسی اروؔناہ کے کھلیہان میں خداوند کے لیے ایک مذبح بنا۔ سو داؔؤد جاد کے کہنے کے موافق، جیسا خداوند کا حکم تھا، گیا۔ اور اروناہ نے نگاہ کی اور بادشاہ اور اس کے خادموں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ سو اروؔناہ نکلا۔ اور اروؔناہ کہنے لگا میرا

مالک بادشاہ اپنے بندہ کے پاس کیوں آیا؟ داؤد نے کہا یہ کھلیہان تجھ سے خریدنے اور خداوند کے لیے ایک مذبح بنانے آیا ہوں تاکہ لوگوں میں سے وبا جاتی رہے۔ اروناہ نے داؤد سے کہا میرا مالک بادشاہ جو کچھ اسے اچھا معلوم ہو لے کر چڑھائے۔ دیکھ سوختنی قربانی کے لیے بیل ہیں اور دائیں چلانے کے اوزار اور بیلوں کا سامان ایندھن کے لیے ہیں۔ یہ سب کچھ اے بادشاہ اروناہ بادشاہ کی نذر کرتا ہے اور اروناہ نے بادشاہ سے کہا کہ خداوند تیرا خدا تجھ کو قبول فرمائے۔ تب بادشاہ نے اروناہ سے کہا نہیں، بلکہ میں ضرور قیمت دے کر اس کو تجھ سے خریدوں گا اور میں خداوند اپنے خدا کے حضور ایسی سوختنی قربانیاں نہیں گذرانوں گا جن پر میرا کچھ خرچ نہ ہوا ہو۔ سو داؤد نے وہ کھلیہان اور وہ بیل چاندی کی پچاس مثقالیں[15] دے کر خریدے۔ اور داؤد نے وہاں خداوند کے لیے مذبح بنایا اور سوختنی قربانیاں اور سلامتی کی قربانیاں چڑھائیں اور خداوند نے اس ملک کے بارے میں دعا سنی اور وبا اسرائیل میں سے جاتی رہی۔[16]

ہیکل کے خاکے کی تفصیلات، تفصیلی نقشے، پیمائشوں اور عمارت کی دیگر تفاصیل اور تعمیر کا اسلوب اور اس کے مراحل کتاب تواریخ سے پہلے ۱۔ملوک ۶-۸ اور حزقی ایل ۴۰-۴۷ میں درج ہو چکے تھے۔ ان دونوں مقامات پر کسی جگہ بھی موریاہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ کتاب تواریخ کا مؤلف اس واقعہ کا عینی شاہد نہیں تھا، جیسا کہ کتاب ہذا کے آخر میں دیے گئے ضمیمہ ۲ سے ظاہر ہے، اس نے یہ تفصیلات تعمیر کے واقعے سے سات صدیاں گزر جانے کے بعد لکھی تھیں۔ اُس نے اس جگہ کا نام 'موریاہ' ہیکل کے محل وقوع کو مقدس قرار دینے کے لیے رکھا تھا۔ اُس سے پہلے کبھی کسی اور مصنف نے ہیکل کے محل وقوع کے لیے 'موریاہ' کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد اگر کسی اور نے ہیکل کے محل وقوع کے لیے 'موریاہ' کا نام استعمال کیا تو اس نے اسے 'کتابِ تواریخ' ہی سے نقل کیا۔ بعد کے تمام نام نہاد 'کتب تواریخ' کے خوش عقیدہ مصنفین، جنھوں نے اس قصے اور اس کے ماخذ کے کسی معروضی اور تنقیدی جائزے کے بغیر اسے بڑے شوق سے قبول کیا ہے، ان سب کا واحد ماخذ یہی کتاب تواریخ تھی، لیکن اسے 'تاریخ' نہیں کہا جا سکتا۔ من پسند خیالات اور تخیلاتی تخلیق کاری کسی ادبی شہ پارے کے مصنف کے اچھے اوصاف تو ہو سکتے ہیں، لیکن ایک سنجیدہ اور

حقیقی مورّخ کے لیے صریحاً ایک عیب ہیں اوران سے اس کی استنادی حیثیت لازماً مجروح قرار پائے گی۔

بعض مقامات پر بائبل ہیکل کا محل وقوع موریاہ کے بجائے کوہِ صیہون کو قرار دیتی ہے، لیکن یہ کوئی متفقہ رائے نہیں ہے[17]

پوری بائبل میں واحد جگہ، جہاں ہیکل سلیمانی کو موریاہ سے منسلک قرار دیا گیا ہے، وہ کتاب تواریخ (۲۔تواریخ ۳:۱) ہے۔اوپر اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ اس کی بنیاد کسی معروضی حقیقت یا تاریخی واقعات پر نہ تھی۔ یہ ایک 'دینیاتی اختراع' تھی اور اسے اس لیے گھڑا گیا تھا تا کہ 'خداوند کے گھر' کو مقدس اور اہم قرار دیا جا سکے[18]

توقع ہے کہ کتاب کے اس باب اور اس سے متعلقہ کتاب کے آخر میں دیے گئے ضمیمہ ۲ کا قاری یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرے گا کہ:

(الف) مصنفِ کتاب 'تواریخ' کا یہ بیان کہ ہیکلِ سلیمانی موریاہ کے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا، ایک صریح غلط بیانی ہے۔

(ب) کتاب 'تواریخ' کی استنادی و تاریخی حیثیت اور اس کا قابلِ اعتماد ہونا مشکوک ہے۔

یہ دعویٰ کہ موریاہ ہیکلِ سلیمانی کا محلِ وقوع تھا، قطعی طور پر بے بنیاد، لایعنی اور تحکمانہ ہے۔ ۲۔تواریخ (۳:۱) میں موریاہ کا ذکر کالعدم تصور کیا جانا چاہیے، کیونکہ یہ مصنفِ کتابِ تواریخ کی ایک بے بنیاد اختراع ہے۔

کیونکہ (مندرجہ بالا درجہ بندی کے مطابق) جن چار مقامات کے متعلق علماے بائبل اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ وہ مقام ہیں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا، وسیع دلائل کی بنیاد پر مسترد قرار پاتا ہے، اس لیے پوری بائبل (پیدائش ۲۲:۲) میں صرف ایک مقام باقی رہ جاتا ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ وہی حقیقی موریاہ ہے

جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے (اکلوتے بیٹے) کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا۔ اگلے باب میں اس سے متعلق تفصیلی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

حواشی باب ششم

1. *John L. McKenzie's Dic. of the Bible* (London: Geoffrey Chapman, 1984), p. 586.
2. *The Interpreter's Dic. of the Bible*, 3:438-39.

۳۔ کتاب مقدس، ۱۔تواریخ ۲۱: ۱۵ تا ۲۸۔

اصل میں یہ قصہ ۲۔سموئیل ۲۴: ۱۶-۲۵ پر درج کیا گیا تھا جو کتاب تواریخ کے مؤلف کا ماخذ ہے۔ اس کے بعض اقتباسات اسی باب میں آگے بیان کیے گئے ہیں تا کہ قاری تقابلی مطالعہ کر سکے۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ ۲۔سموئیل نے اس جگہ کا متعدد مرتبہ حوالہ دیا ہے، لیکن اس نے کبھی اس کے لیے 'موریاہ' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

4. *The Works of Flavius Josephus*, Tr. William Whiston (Boston: D Lothrop & Co., na): Antiquities XIII: 4, pp. 203-4.
5. W. Gunther Plaut, *The Torah, A Modern Com.* (NY: Union of Am. Hebrew Congregations, 1981), p. 154 asserts:

Abraham and his followers rose "early in the morning" and "went unto" the place of which God had told him; (...); it is as if, while he traveled on, Abraham had looked neither to the right nor to the left, had suppressed any sign of life in his followers and himself save only their footfalls.

ابراہیم اور ان کے ساتھ کے لوگ 'صبح سویرے' اٹھے اور اس جگہ گئے جو اللہ تعالیٰ نے انھیں بتائی تھی۔ (...)۔ یوں لگتا ہے جیسے جب ابراہیم مسافت طے کر رہے تھے تو انھوں نے دائیں بائیں کسی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور سوائے قدموں کی چاپ کے اپنے اندر اور اپنے شرکائے سفر کے اندر سے زندگی کی تمام علامات دبا دی تھیں۔

6. Raymond E. Brown, *The New Jerome Biblical Com.* (Bangalore: TPI, India, 1994), P. 25:

This may be the halfway point of a seven-day journey ending in the arrival at the mountain.

یہ اس سات روزہ سفر کا نصف ہو سکتا ہے جو اس پہاڑ پر پہنچ کر ختم ہوتا تھا۔

7. John Fawcett, *The Devotional. Family Bible.*, 1811, Vol. I, no paging, says:

and after that long journey (...) the place was far distant: Mount Moriah; (...). He travels three successive days.

اور اس طویل سفر کے بعد وہ جگہ یعنی کوہ موریاہ، ابھی بہت دور دراز فاصلے پر تھی۔ وہ لگاتار تین دن تک سفر کرتا رہا تھا۔

8. T. C. Mitchell, *The Illustrated Bible Dic.* (Inter-Versity Press, nd), 2:1025.

۹ تین دن کا تو کیا ذکر جس حقیقی سفر کے سرانجام دینے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، وہ ایک ہفتے سے کم کا نہ تھا، جیسا کہ 'نیو جیروم تفسیر بائبل' (صفحہ ۲۵) میں بیان کیا گیا ہے، جبکہ اگر منزلِ مقصود یروشلم تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذوق وشوق اور طے کیے جانے والے فاصلے کی کمی کے پیش نظر اس میں ایک دن سے زیادہ نہیں لگنے چاہییں تھے۔

10. *Peake's Com. on the Bible*, 193.

11. *Hastings Dic. of the Bible* 3:437 s.v. 'Moriah' by S.R. Driver.

12. *Hastings Dic. of the Bible* (Rvd. by Frederick Grant & H. H. Rowley), pp. 674-75.

13. *Enc Judaica (Second Edn.)*, Fred Scolnik (NY: Thomson Gale, 2007), 14:491 s.v. 'Moriah'.

14. *International Standard Bible Encyclopedia*, OR USA: Books For The Ages, AGES Software, Versioin 1.0 © 1997, 7:924-25.

۱۵ مصنفِ کتابِ تواریخ لکھتا ہے: 'سو داؤد نے ارنان کو اُس جگہ کے لیے چھ سو مثقال سونا تول کر دیا' (۱۔تواریخ ۲۱:۲۵)۔ جو صریحاً مصنفِ کتابِ تواریخ کی مبالغہ آرائی ہے اور یہ اس کے ہاں ایک عام بات ہے۔ دونوں بیانات میں اختلاف بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

۱۶ کتاب مقدس، ۲۔سموئیل ۲۴:۱۶ تا ۲۵۔

۱۷ ہیسٹنگز کی 'لغات بائبل' (۴:۹۸۳) میں بیان کیا گیا ہے:

Throughout the OT there are passages which have no meaning, if Zion and the temple hill were two separate topographical features. Zion is the holy hill or mountain (Ps26), the chosen habitation of Jahweh (Ps 911 742 762 847 13213, Is 818 6014, Jer 810, Zec 83). There He manifests Himself (Ps 147202 536 1285 1343, Am 12); and there He must be worshipped and praised (Ps 651,2, Jer 316). (....). In 1 Maccabees, written c. BC 100 by some one who was well acquaited with the localities, Zion is identified with the temple hill (437,38 534 733 etc), and so it

is in 1Es 881 2Es525 Sir2410, and Jth 913 [See also Ps 78 68,69 and Jer 50 28].

عہد نامہ قدیم میں جگہ جگہ ایسی عبارتیں ہیں کہ اگر صیہون اور ہیکل کی پہاڑی کو دو الگ الگ جگہیں قرار دیا جائے تو ان عبارتوں کا کوئی مفہوم نہیں بنتا۔ صیہون مقدس پہاڑی یا پہاڑ ہے (مزامیر ۲:۶)، اللہ تعالیٰ کی چنی ہوئی آبادی ہے (مزامیر ۹:۱۱، ۷۴:۲، ۷۶:۲، ۸۴:۷، ۱۳۲:۱۳، یسعیاہ ۸:۱۸، ۶۰:۱۴، یرمیاہ ۸:۱۰، زکریاہ ۸:۳)۔ وہاں وہ (اللہ تعالیٰ) اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے (مزامیر ۱۴:۷، ۲۰:۲، ۵۳:۶، ۱۲۸:۵، ۱۳۴:۳، عاموس ۱:۲)؛ اور وہاں اُس (اللہ تعالیٰ) کی عبادت اور تعریف کی جانی چاہیے (مزامیر ۶۵:۱-۲، یرمیاہ ۳۱:۶)۔ (....)۔ ا۔ مکابیون میں جو قریباً ۱۰۰ ق م میں کسی ایسے شخص نے لکھی تھی جو مختلف مقامات کے محلِ وقوع سے بخوبی باخبر تھا، صیہون کو ہیکل کی پہاڑی سے تعبیر کیا گیا ہے (۴:۳۷-۳۸، ۵:۳۴، ۷:۳۳ وغیرہ)، اور ا۔عزرا ۸:۸۱، ۲۔عزرا ۵:۲۵، سِراق ۲۴:۱۰، اور جودت ۹:۱۳ میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے [مزامیر ۷۸:۶۸-۶۹ اور یرمیاہ ۵۰:۲۸ بھی ملاحظہ کیجیے]۔

۱۸ یہاں یہ بات بڑی برمحل نظر آتی ہے کہ کتاب کی تاریخی اور استنادی حیثیت کا معروضی جائزہ لے لیا جائے۔ کتاب کے آخر میں 'کتاب تواریخ کی حیثیت' کے عنوان سے ضمیمہ ۲ میں اس پر گفتگو کی گئی ہے۔

باب ہفتم

موریاہ یا المروہ کا حقیقی محلِ وقوع

جہاں تک اس 'موریاہ' کا تعلق ہے جس کا عربوں کے نزدیک تلفظ 'المروہ' ہے تو اصلی موریاہ صرف یہی ہے (کتاب پیدائش ۲:۲۲)۔ یہی وہ حقیقی مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا 'اکلوتا بیٹا' قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ بائبل کے علما کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا اکلوتا بیٹا کس جگہ قربانی کے لیے پیش کرنے کو کہا گیا تھا۔

آیندہ سطور میں اس موضوع کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے ایک معروضی اور بے لاگ تنقیدی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

بائبل کے علما موریاہ کے حقیقی محلِ وقوع سے بے خبر ہیں

ذیل میں بائبل کے چند مستند علما کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل کے یہ علما اس حقیقی جگہ کی نشان دہی سے قاصر ہیں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے 'اکلوتے بیٹے' کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا۔

ا۔ ڈبلیو گنتھر پلاٹ کا خیال ہے:

The original name is obscure and the actual location unknown.[1]

اصل نام مبہم ہے اور اس کا حقیقی محل وقوع نامعلوم ہے۔

۲۔ ایل ریڈ اور اے ایچ میک نیل (L.Reed and A.H.McNeile) 'ہیسٹنگز کی نظر ثانی شدہ لغاتِ بائبل' میں اپنے مضمون 'موریاہ' میں رقم طراز ہیں کہ 'ابراہیمؑ کے عہد کے موریاہ کی نشان دہی کے لیے کوئی شہادت دستیاب نہیں':

Because the place of origin of the journey is not stated in Genesis, it is best to conclude that evidence is not available for locating Moriah of Abraham's time.[2]

کیونکہ کتاب پیدائش میں آغازِ سفر کی جگہ بیان نہیں کی گئی، اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مناسب ہے کہ ابراہیمؑ کے زمانے کے موریاہ کے محلِ وقوع کی کوئی شہادت موجود نہیں۔

۳۔ 'دی نیو جیروسلم بائبل' کا بھی یہی بیان ہے کہ موریاہ کا محلِ وقوع نامعلوم ہے:

But the text speaks of a 'land of Moriah', of which the name is otherwise unattested: the site of the sacrifice is unknown.[3]

لیکن متن ایک 'سرزمینِ موریاہ' (land of Moriah) کا ذکر کرتا ہے جس کے نام کی کسی اور حوالے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ قربانی کی یہ جگہ نامعلوم ہے۔

۴۔ 'اے نیو کمنٹری آن ہولی سکرپچر' کا بیان ہے:

The land of Moriah is an unknown locality.[4]

سرزمینِ موریاہ ایک نامعلوم مقام ہے۔

۵۔ 'دی سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ بائبل کمنٹری' نے وضاحت کی ہے:

The name seems to have been rather uncommon.[5]

بلکہ یہ نام تو اجنبی اور انوکھا سا دکھائی دیتا ہے۔

۶۔ 'دی نیو آکسفرڈ اینوٹیٹڈ بائبل' کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک نامعلوم مقام ہے:

The mountain in the land of Moriah is unknown.[6]

'سرزمینِ موریاہ میں ایک پہاڑ' ایک نامعلوم مقام ہے۔

۷۔ ڈملو کی تفسیر دونوں مقامات کے تعین کے سلسلے میں بے یقینی کا اظہار کرتی ہے:

The land of Moriah] only mentioned again 2 Ch 3:1, 'Then Solomon began to build the house of the Lord at Jerusalem in Mount Moriah.' It is uncertain whether the two places are to be identified.[7]

سرزمینِ موریاہ۔ اس کا دوبارہ ذکر صرف ۲۔ تواریخ ۳:۱ میں ہے: 'تب سلیمان نے یروشلم میں کوہِ موریاہ پر خداوند کے گھر کی تعمیر کا آغاز کیا'۔ یہ بات غیر یقینی ہے کہ آیا یہ دونوں مقامات ایک ہی ہیں۔

۸۔ 'دی نیو بائبل کمنٹری' کا بیان ہے کہ ایسے کوئی زمینی شواہد موجود نہیں جن سے اس جگہ کا متعین محلِ وقوع ثابت ہو سکے:

The land of Moriah (2). There is nothing in ancient topography to certify the exact location of this place, nor yet the mountain itself.[8]

سرزمین موریاہ (۲) قدیم جغرافیائی خدوخال میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جس سے اس جگہ کا متعین محلِ وقوع ثابت ہو سکے، نہ اب تک خود اس پہاڑی کا (محلِ وقوع معلوم ہے)۔

۹۔ 'وکلف کی تفسیر بائبل' کا بیان ہے:

The place of the sacrifice cannot be positively identified.[9]

قربانی کی جگہ کی مثبت طور پر نشان دہی ممکن نہیں۔

۱۰۔ 'انٹر پریٹرز ڈکشنری آف دی بائبل' میں بیان کیا گیا ہے:

The location is otherwise unspecified.[10]

بصورتِ دیگر اس کے محلِ وقوع کی نشان دہی ممکن نہیں۔

۱۱۔ 'ہارپرز بائبل ڈکشنری' نے بھی اس کے متعلق اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

An unidentified site in rugged terrain three day's travel from Beersheba where Abraham was to sacrifice Isaac.[11]

سطحِ مرتفع میں ایک غیر متعین مقام، بیر سبع سے تین دن کی مسافت پر، جہاں ابرہام نے اسحاق کی قربانی دینا تھی۔

۱۲۔ ٹی کے چینی 'انسائیکلوپیڈیا ببلیکا' میں رقم طراز ہے:

Great obscurity hangs about this name.[12]

اس نام کے بارے میں بہت زیادہ ابہام پایا جاتا ہے۔

۱۳۔ ریورنڈ بی واوٹر، پروفیسر آف سیکرڈ سکرپچر، ڈی پال یونیورسٹی، شکاگو اپنی 'اے نیو کیتھولک کنسٹری' میں بیان کرتے ہیں:

The land of Moriah' has never been identified.[13]

سرزمین موریاہ کی کبھی نشان دہی نہیں کی جا سکی۔

۱۴۔ میخائیل ایوی یونا نے بھی 'انسائیکلوپیڈیا جوڈائیکا' میں انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے:

MORIAH, an unidentified locality mentioned in the Bible.[14]

موریاہ، بائبل میں مذکورہ ایک غیر متعین مقام۔

۱۵۔ 'دی انسائیکلوپیڈیا آف جوڈائزم' نے بھی اسی طرح کے ملاحظات پیش کیے ہیں:

Moriah; a place, originally unidentified, to which God sent Abraham[15]

موریاہ: ایک مقام، اصلاً غیر متعین، جہاں خداوند نے ابراہام کو بھیجا تھا۔

۱۶۔ 'جیروم کی تفسیر بائبل' کا خیال ہے:

The 'district of Moriah' is unknown.[16]

'موریاہ کا ضلع' نامعلوم ہے۔

۱۷۔ پیٹر آر ایکرائیڈ اور سموئیل ڈیوڈسن (Peter R. Ackroyd, Samuel Davidson) پروفیسر آف اوٹی اسٹڈیز، کنگز کالج، لنڈن یونیورسٹی اپنے مقالے 'دی اوٹی اِن دی میکنگ' (*The OT in the Making*) میں لکھتا ہے:

So we have sanctuary legends (...) and a high place at Jebus (Jerusalem, 2 Sam. 24) subsequently rightly or wrongly identified with the site of the Jerusalem temple (I Chrn. 21-22:1).

اس طرح ہمارے پاس اس حرم کے متعلق افسانے ہیں۔(...)۔اور جبوس (یروشیلم) کے مقام پر ایک بلند مقام جو بعد میں صحیح یا غلط طور پر ہیکل یروشیلم کے محل وقوع کی نشان دہی کا آئینہ دار بنا۔

اس نے یہاں ایک ذیلی حاشیہ درج کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

The identification must remain uncertain, and indeed suspect, since the Chronicler also identifies the same site with Moriah (2 Chron. 3:1, cf. Gen. 22).[17]

اس کی نشان دہی لازماً غیر یقینی رہے گی، بلکہ حقیقت میں مشکوک، کیونکہ کتاب تواریخ کا مؤلف اسی مقام کو موریاہ بھی قرار دیتا ہے۔

۱۸۔ یہی مصنف مزید بیان کرتا ہے:

What is clear, however, is that the Chronicler sees this narrative in I Chron. 21 as providing an appropriate introduction to his account of how David prepared for the building of the Temple by Solomon (I Chron. 22:2-19; 28:-29:9. The intervening section, chs. 23-7, may well be a later insertion, but it too illuminates the ideas concerning David's organising of the worship of the Temple). Whereas the 2 Sam. narrative makes no link with the building of the Solomonic Temple--and this strongly suggests that the narrative originally had to do with another sacred place--the Chronicler identifies the site precisely (22:1), explains why David could not go to Gibeon where the Tabernacle was (21:29-30), and subsequently also identifies this site explicitly with the Mount Moriah of Gen. 22 (2 Chron. 3:1), an even more improbable identification.[18]

تاہم جو بات واضح ہے، وہ یہ ہے کہ کتاب تواریخ کا مؤلف اپنے اس '۱۔ تواریخ ۲۱' والے

بیان کو اس انداز میں دیکھتا ہے کہ یہ اس امر کا موزوں تعارف ہے کہ داؤدؑ نے سلیمانؑ سے ہیکل تعمیر کرائے جانے کے لیے کیا کیا تیاری کی۔ (۱۔تواریخ ۲۲:۲ تا ۱۹؛ باب ۲۸ تا باب ۲۹: ۹۔ درمیانی فصل، ابواب ۲۳ تا ۲۷ بعد کا اضافہ لگتا ہے، لیکن اس سے بھی اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ داؤدؑ نے ہیکل کی عبادت کو منظم کیا)، جبکہ ۲۔سموئیل کے بیان سے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ اور اس سے مضبوط اشارہ ملتا ہے کہ یہ بیان ابتداءً کسی اور مقدس مقام سے تعلق رکھتا تھا۔ کتاب تواریخ کا مؤلف اس مقام کی معین طور پر نشان دہی کرتا ہے (۲۲:۱)، وہ اس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ داؤد جبعون[19]، جہاں خیمۂ عبادت تھا نہیں جا سکا (۲۹:۲۱، ۳۰)۔ نتیجۃً وہ اس مقام کو واضح طور پر کتاب پیدائش باب ۲۲ (۲۔تواریخ ۳:۱) والا کوہِ موریاہ ہی قرار دیتا ہے۔ یہ اور بھی زیادہ ناممکن نشان دہی ہے۔

۱۹۔ 'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ بائبل انسائیکلوپیڈیا' نے بھی اس موضوع پر بات کی ہے۔ یہ اس کے محلِ وقوع کی ان الفاظ میں وضاحت کرتا ہے:

> This land is mentioned only here Gen 22:2, and there is little to guide us in trying to identify it. A late writer (2 Chronicles 3:1) applies the name of Moriah to the mount on which Solomon's Temple was built, possibly associating it with the sacrifice of Isaac. A similar association with this mountain may have been in the mind of the writer of Genesis 22 (see 22:14), who, of course, wrote long after the events described (Driver). (...). The description could hardly apply to Jerusalem in any case, as it could not be seen "afar off" by one approaching either from the South or the West. (...). With our present knowledge we must be content to leave the question open. W. Ewing.[20]

اس سرزمین کا صرف یہی ذکر کیا گیا ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کے ذریعے سے ہم اس کی شناخت کرنے کی کوشش کر سکیں۔ بعد کے ایک مصنف (۲۔تواریخ ۳:۱) نے، غالباً اسے حضرت اسحاق کی قربانی سے جوڑتے ہوئے، موریاہ کے نام کا اُس پہاڑ پر اطلاق کیا ہے جس پر ہیکلِ سلیمانی تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پہاڑ کے ساتھ اسی طرح کا ایک تعلق کتاب پیدائش (۲۲:۱۴) کے مصنف کے ذہن میں بھی ہو سکتا ہے جس نے بلاشبہ یہ واقعات بہت بعد میں بیان کیے ہیں (ڈرائیور)۔ (...)۔ اس بیان کا یروشلیم پر اطلاق کسی بھی حالت میں بہت مشکل ہی سے کیا جا سکتا

ہے، کیونکہ اسے جنوب یا مغرب کی طرف سے پہنچنے والا کوئی شخص بہت دور سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ (...)۔ اپنی زمانہ حال کی معلومات کی موجودگی میں ہمیں اسی بات پر اکتفا کر لینا چاہیے کہ اس سوال کو کھلا [بے جواب] ہی چھوڑ دیں (ڈبلیو ای ونگ)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک موضوع پر اتنے زیادہ مستند حوالے پیش کرنا ایک غیر دلچسپ عمل ہے، لیکن یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی تا کہ یہ ظاہر ہو کہ جو بات پیش کی گئی ہے، وہ کوئی انوکھی یا اقلیت کی رائے پر مبنی نہیں۔ چنانچہ تقریباً ہر مکتبِ فکر کے علما کے حوالے سے وسیع شہادت پیش کر دی گئی ہے۔ یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ جو لوگ اس بات کے قائل نہیں کہ موریاہ کا محلِ وقوع نامعلوم ہے، وہ بھی اس کے متعلق ابہام اور تشکیک کا شکار ہیں اور اس کے لیے مختلف مقامات تجویز کرتے ہیں۔ بائبل کے غیر متعصب اور صاحبِ تحقیق علما کی اکثریت کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنا اکلوتا بیٹا قربانی کے لیے پیش کرنے کی جگہ کی متعین اور یقینی طور پر نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔

بائبل سے متعلق تاریخ کے تحریری مواد میں قربانی کے مقام کی نشان دہی میں ناکام ہونے کے بعد، اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے متعلقہ اقوام اور موضوعات سے متعلق زمینی حقائق یا متواتر روایات، یادگاروں، تقریبات، تہواروں، مراسمِ عبادت، مقامات، عمارات وغیرہ کی چھان بین کر کے تلاش کیا جائے۔

حواشی باب ہفتم

1. W. Gunther Plaut, *The Torah, A Modern Commentary*, 146.
2. Hastings *Dic. of the Bible* (Revise by Frederick Grant & H. H. Rowley), 674-75.
3. Henry Wansbrough, *The New Jerusalem Bible* (London: Darton, Longman & Todd Ltd., 1993), 41.
4. Charles Gore, Goudge, A Guillaume, *A New Com. on H. Scripture*, (London: Society for Promoting Christian knowledge, 1928), 53.
5. *7th Day Adventist BCom.*, (Hagerstown: Review & Herald Publg. Association, 1978), 1:349.
6. *The New Oxford Annotated Bible*, (NY: Oxf. Univ. Press, 1989), Footnote on p. 27.
7. J. R. Dummelow, CHB, (NY: The Macmillan Co, 1956), 30.
8. *New Bible Com.*, Ed F. Davidson (Michigan: W M B. Eerdmans Publishing Co. Grand Rapids, 1953), 94.
9. *The Wycliffe Bible Com.*, Charles F. Pfeiffer (Chicago: Moody Press, 1983), 27.
10. *Interpreter's Dic of the Bible*, 3:438.
11. *Harper's Bible Dic*, 654.
12. *Enc. Biblica*, 3:3200.
13. *A New Catholic Commentary on Holy Scripture*, revised and updated 1975, Ed. Rev. Reginald. C. Fuller, (Hong Kong: Thomas Nelson Ltd, 1981), 195.
14. *Enc Judaica (Second Edn.)*, Fred Scolnik (NY: Thomson Gale, 2007), 14:491 s.v. 'Moriah'.
15. *The Judaic CD ROM Reference Library* Vol. I, Contents. The Enc. of Judaism Copyright 1989-G. G. the Jerusalem Publishing House, 1993, DAVKA Corporation and the Institute for Computers in Jewish Life, s.v. 'Moriah'.
16. *The Jerome Biblical Com.*, ed. R. E. Brown, etc (Bangalore: TPI, 1987), 23.
17. *The Cambridge History of the Bible*, ed. P. R. Ackroyd. (Cambridge: at the University Press, 1970), 1:69.
18. *The Cambridge History of the Bible*, ed. P. R. Ackroyd (Cambridge: at the University Press, 1970), 1:89.
19. جبعون، حضرت داؤد کی فلسطین پر فتح کا مقام ہے۔ ہیکل کی تعمیر سے پہلے خیمہ اجتماع اور کانسی کا چبوترہ یہاں نصب تھا۔
20. *International Standard Bible Encyclopedia*, 1997, 7:924.

باب ہشتم

'موریاہ' کے حقیقی محل وقوع کے تعیّن کے سلسلے میں

چند سوالات اور ان کے جوابات

ذیل میں پہلے چند ایسے سوالات درج کیے جاتے ہیں جو 'موریاہ' کا حقیقی محل وقوع دریافت کرنے کے سلسلے میں مددگار ثابت ہوسکیں:

۱۔ کیا ابراہیم کا کوئی ایسا بیٹا تھا جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ وہ اس عمر کو پہنچنے تک، جو تاریخی مواد کے اعتبار سے قربانی کے لیے پیش کیے جانے سے مناسبت رکھتی ہو، اس کا 'اکلوتا بیٹا' کہلا سکے؟

۲۔ کیا وہ 'اکلوتا بیٹا' مستقل طور پر اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہتا تھا یا وہ کسی اور جگہ مستقل سکونت کے لیے منتقل ہو چکا تھا؟ اس مقام کا نام اور محل وقوع کیا تھا؟

۳۔ کیا اس اکلوتے بیٹے کی نسل کے اس نئے مقام سکونت [فاران/بیر سبع] پر عرصہ دراز سے سکونت اختیار کرنے کے کوئی شواہد موجود ہیں؟

۴۔ کیا اس اکلوتے بیٹے کے اس جگہ اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی کوئی روایت موجود ہے؟

۵۔ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے 'اکلوتے بیٹے' کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی یہ روایت موریاہ کے اس علاقے میں کسی پہاڑ سے منسلک ہے؟

۶۔ کیا بائبل میں مذکور اس کوہ موریاہ کے قریب قربانی کے عمل سے متعلق کوئی واقعی آثار موجود ہیں؟

۷۔ کیا اس موریاہ کے مقام پر حضرت اسماعیل علیہ السلام، ان کی والدہ ہاجرہ اور ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موجودگی کے کوئی ٹھوس، عملی اور مادی شواہد موجود ہیں؟

۸۔ کیا وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کرنے کے اس عظیم واقعے کی یاد منانے کے لیے قدیم زمانے سے کوئی تقریبات یا رسوم منائی جاتی رہی ہیں اور کیا یہ تقریبات اس موریاہ کے اردگرد کچھ مقامات سے منسلک ہیں؟

۹۔ کیا عربوں میں کچھ اور ایسے رسم و رواج یا روایات بھی پائی جاتی ہیں جن سے ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے رشتہ ثابت ہوتا ہو؟

۱۰۔ کیا اس 'مروہ' کے قرب و جوار میں کوئی ایسی مقدس عمارت یا جگہ بھی موجود رہی ہے جس کی تعمیر بزرگ آبا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے منسوب ہو؟

۱۱۔ کیا کوئی ایسے نشانات بھی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ الکعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی تھی؟

۱۲۔ کیا کوئی ایسے شواہد بھی پائے جاتے ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام یا ان کی نسل کے لوگ حضرت اسحاق علیہ السلام کے قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی یاد منانے کی غرض سے کسی 'مروہ' کے مقام پر قربانی پیش کرنے کے لیے جایا کرتے تھے؟

۱۳۔ جس طرح بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی زوجہ حضرت سارہ اور ان کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کے بارے میں بیان ہے کہ ان کا کہاں انتقال ہوا تھا، اور انھیں کس جگہ دفن کیا گیا تھا۔ کیا اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کے بارے میں بھی ان تفصیلات کا کوئی ذکر ہے؟ اگر ہے تو کس جگہ ہے اور اگر نہیں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

۱۴۔ کیا عربوں میں، جو تاریخی اعتبار سے مسلمہ طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل ہیں، ایسی کوئی مسلمہ روایت موجود ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہ کو کہاں دفن کیا گیا تھا؟

۱۵۔ بائبل کے مؤلفین نے یہ ابہام کیوں پیدا کیا؟

ان سوالوں کے جواب

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوئی ایسا بیٹا تھا جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ اس عمر کو پہنچنے تک، جو تاریخی مواد کے اعتبار سے قربانی کے لیے پیش کیے جانے سے مناسبت رکھتی ہو، اس کا اکلوتا بیٹا کہلا سکے؟' تو اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'پہلوٹھے بیٹے' تھے اور قریباً چودہ سال کی عمر تک ان کے 'اکلوتے بیٹے' بھی رہے۔ تیرہ سال کی عمر اُن کے قربانی کے لیے پیش کیے جانے کے سلسلے میں حالات وواقعات کے لحاظ سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور تمام مناسبتوں سے مطابقت رکھتی ہے۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا وہ "اکلوتا بیٹا" مستقل طور پر اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہتا تھا یا وہ کسی اور جگہ مستقل سکونت کے لیے منتقل ہو چکا تھا؟ اس مقام کا نام اور محلِ وقوع کیا تھا؟'، تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ان کی والدہ ہاجرہ سمیت ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سرزمینِ موریاہ میں بیر سبع (سات کے کنوئیں)[1] کے نزدیک فاران کے بیابان میں منتقل کر دیا تھا اور وہ وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ کے ساتھ جنوبی کنعان میں حبرون اور بیر سبع (عہد یا قسم کے کنوئیں)[2] میں آباد ہو گئے تھے۔ ضمیمہ ا میں 'بیر سبع' پر ایک مفصل مقالہ شاملِ کتاب ہے۔ 'فاران کے بیابان' پر بھی کتاب ہٰذا کے مصنف نے کسی اور مقام پر مفصل روشنی ڈالی ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ جہاں تک 'موریاہ' کا تعلق ہے تو وہ اسی کتاب کے ابواب ۵، ۶، ۷ اور ۸ میں بیان ہو چکا ہے۔

جہاں تک تیسرے سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا اس اکلوتے بیٹے کی نسل کے اس نئے مقامِ سکونت [فاران / بیر سبع] پر عرصہ دراز سے سکونت اختیار کرنے کے کوئی شواہد موجود ہیں؟'، تو صورت حال

یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل مکہ اور عرب کے دیگر مقامات پر قدیم زمانے سے آباد رہی ہے اور آج بھی وہاں مقیم ہے۔ بائبل کا دعویٰ ہے کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فاران کے بیابان اور بیر سبع کے مقام پر آباد کیا تھا۔ بائبل کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ دونوں مقامات صحرائے سینا میں واقع ہیں، لیکن بائبل ہی کے بیان کے مطابق صحرائے سینا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کی کسی شاخ کے نشانات موجود نہیں۔ یہ بات کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سرزمینِ عرب میں مکے کے اردگرد زمانہ قدیم سے آباد چلی آرہی ہے، اس کتاب کے اگلے باب میں تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔

جہاں تک چوتھے سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا اس اکلوتے بیٹے کے اس جگہ اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی کوئی روایت موجود ہے؟'، تو یہ ایک زمینی اور واقعاتی حقیقت ہے کہ لاکھوں حجاج کرام ذوالحجہ کے قمری مہینے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی یادگار کے طور پر مکے کی طرف سفر کرتے ہیں۔ انھی ایام میں کروڑوں لوگ یہی قربانی اپنے گھروں پر سرانجام دیتے ہیں۔ یہ رسم وروایت آغازِ اسلام سے بھی صدیوں پہلے سے موجود چلی آرہی ہے۔ روے زمین پر کسی جگہ بھی حضرت اسحاق علیہ السلام کے اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی یادگار میں کبھی کوئی تہوار یا رسم ورواج منائے جانے کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

جو دنبہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیے کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اس کے سینگ اس وقت تک خانہ کعبہ میں موجود و محفوظ رہے جب ۶۴ ہجری (۶۸۳ء) میں عبداللہ ابن زبیر نے اس کی دوبارہ تعمیر کرائی تھی۔ 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' میں درج ہے:

The two horns of Abraham's ram did not crumble to dust until the rebuilding of the Ka'bah by 'Abd Allah b. al-Zubayr.[3]

ابراہیمؑ کے اس دنبے کے دو سینگ عبداللہ ابن زبیر کی خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر تک مٹی میں مل کر مٹی نہ ہوئے تھے۔

بائبلی اور اسلامی روایات میں درج ہے کہ جس بیٹے کو قربان کیا جانا تھا، اُسے فدیے میں ایک دنبہ دے کر چھڑا لیا گیا تھا۔ ایک نام ور مسلمان صاحب علم اور مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی بے مثال تفسیر 'تدبر قرآن' میں قرآنی آیت (وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۷) کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

> فرمایا کہ ہم نے اسماعیلؑ کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس بیٹے کی جگہ ایک مینڈھے کی قربانی کر دیں اور یہ قربانی ایک عظیم قربانی کی شکل میں ہمیشہ ہمیش آئندہ نسلوں میں اس واقعہ کی یادگار کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ یہی قربانی ہے جو مناسکِ حج میں شامل ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے آج تک برابر چلی آ رہی ہے اور قیامِ قیامت تک باقی رہے گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قربانی اگرچہ تمام ادیان میں حضرت آدمؑ کے وقت سے چلی آ رہی ہے لیکن دنیا میں کسی قربانی نے یہ عظمت و اہمیت اور یہ وسعت و ہمہ گیری نہیں حاصل کی جو حضرت ابراہیمؑ کی اس قربانی نے حاصل کی۔[۲۳]

بائبل میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> اور ابرہام نے ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے۔ تب خداوند کے فرشتے نے اُسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام، اے ابرہام! اُس نے کہا میں حاضر ہوں۔ پھر اُس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اُس سے کچھ کر کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لیے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔ اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابرہام نے جا کر اُس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا۔ اور ابرہام نے اُس مقام کا نام یہوواہ یری رکھا چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا۔ اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دوں گا

اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔[۵]

جہاں تک پانچویں سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی یہ روایت موریاہ کے اس علاقے میں کسی پہاڑ سے منسلک ہے؟' تو یہ صرف سرزمین موریاہ کے پہاڑی علاقے میں مکہ ہی کا مقام ہے جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی روایت منسلک ہے۔ 'موریاہ' کے لیے عربی زبان میں 'مروہ' کا لفظ آتا ہے۔ عبرانی[۶] میں 'موریاہ' پانچ حروف سے مل کر بنا ہے، جبکہ عربی زبان کا 'مروہ' چار حروف سے مل کر بنتا ہے۔ پہلے اور آخری حروف، یعنی 'م' اور 'ہ' دونوں لفظوں میں مشترک ہیں۔ درمیانی حروف 'ر' اور 'و' عبرانی زبان میں ہم شکل حروف ہیں۔ عبرانی حروف ابجد میں انھیں دیکھ کر اس کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کاتب حضرات سے عام طور پر لکھتے وقت ان کو آپس میں ایک دوسرے سے بدل دینے کی غلطی ہو جایا کرتی تھی۔ جہاں تک حرف 'ی' کا تعلق ہے، یہ عبرانی حروف ابجد میں ایک بہت چھوٹا سا حرف ہے اور کسی کاتب کی معمولی سی بے احتیاطی یا غلط فہمی کی وجہ سے حذف بھی ہوسکتا ہے اور بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔ اس بات کا غالب امکان ہے کہ بائبل میں بھی اصل لفظ 'مروہ' تھا جو کسی کاتب کی غلطی سے 'موریاہ' درج ہو گیا، کیونکہ موریاہ/مروہ کوئی ایسا لفظ نہ تھا جو بائبلی ادب میں بار بار آیا ہو۔ ایک اور امکان یہ بھی ہے کہ 'موریاہ' اور 'مروہ' کا اختلاف تلفظ عبرانی زبان اور عربی زبان میں جغرافیائی حالات کی تبدیلی کے باعث رونما ہونے والے اختلاف تلفظ کی وجہ سے ہو۔ اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن سے ایک باشعور قاری بے خبر نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک چھٹے سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا بائبل کے اس کوہ موریاہ (اہل عرب کا المروہ) کے نزدیک قربانی کے عمل سے متعلق کوئی واقعی آثار موجود ہیں؟' تو اس سلسلے میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جو دنبہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ قربانی کے لیے پیش کیا گیا تھا، اس کے سینگ کعبہ

میں محفوظ تھے اور وہ ۶۴ھ (۶۸۳ء) تک وہاں موجود رہے۔ 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' میں ونسنک اور جومیئر (Wensinck and Jomier) اپنے مقالے 'کعبہ' میں رقم طراز ہیں کہ اگست ۶۲۹ء میں فتح مکہ کے موقع پر:

All the pagan trappings which had adhered to the Ka'ba were now thrust aside. (...). The two horns of Abraham's ram did not crumble to dust until the rebuilding of the Ka'ba by 'Abd Allah b. Zubayr.[7]

وہ تمام مشرکانہ اشیا جو خانہ کعبہ میں آویزاں تھیں، اکھاڑ پھینکی گئیں۔(...)۔ ابراہیمؑ کے دنبے کے دوسینگ [حضرت] عبداللہ ابن زبیر کی خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر تک پیوندِ خاک نہ ہوئے تھے۔

جہاں تک ساتویں سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا اس موریاہ کے مقام پر حضرت اسماعیل علیہ السلام، ان کی والدہ ہاجرہ اور ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موجودگی کے کوئی ٹھوس، عملی اور مادی شواہد موجود ہیں؟' تو اس طرح کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں، مثلاً حجرِ اسود، معجن، مقامِ ابراہیم، چاہِ زم زم، اور حطیم میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبریں، یہ سب چیزیں کعبہ کے قرب و جوار میں واقع ہیں۔

حجرِ اسود، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے بزرگ آبا (حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام) نے کعبہ کے کونے میں نصب کیا تھا۔ اس کے متعلق 'انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین' (Encyclopedia of Religion) کا بیان ہے:

The Black stone is of unknown pre-Islamic origin, possibly meteoric.[8]

حجرِ اسود اسلام سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی اصل حقیقت معلوم نہیں۔ غالباً یہ کسی شہابیے کا ٹکڑا ہے۔

معجن کعبہ کے بالکل قریب واقع ہے۔ اے جے ونسنک نے اس کے متعلق مندرجہ ذیل تفصیل بیان کی ہے:

(...); a depression in it [the Ka'bah] just opposite the door has still to be mentioned; it is called al-mi'djan "the trough"; according to legend, Ibrahim and Isma'il here mixed the mortar used in building the Ka'bah.[9]

دروازے کے عین مقابل اس [کعبہ] میں ایک نشیب [ہے] جس کا ذکر ابھی باقی ہے۔ اسے المعجن یا 'نانڈ' بھی کہتے ہیں۔ روایت کے مطابق اس جگہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کعبے کی تعمیر میں استعمال ہونے والا گارا اور مسالہ ملایا کرتے تھے۔

مقامِ ابراہیمؑ کے متعلق 'انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن' کا بیان ہے:

Near the Ka'bah stands a gilded glass case (replacing an earlier simple wooden framework) that contains a stone marking the station of Ibrahim (Abraham). This stone is said to have miraculously preserved the footprint of Ibrahim, Who stood on it in order to complete the construction of an earlier Ka'bah: it is, as it were, the builders mark.[10]

کعبے کے قریب شیشے کا ایک مُرصّع و مُطلّا چوکھٹا ہے (پہلے اس کی جگہ لکڑی کا ایک سادہ سا فریم ہوتا تھا)۔ اس کے اندر ایک پتھر ہے جس پر ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کے نشانات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پتھر پر معجزانہ طریق سے ابراہیمؑ کے قدموں کے نشانات ثبت ہو گئے جو پہلے والے کعبہ کی تعمیر کی تکمیل کے لیے اس پتھر پر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ اس طرح لگتا ہے جیسے یہ معمار کا نشان ہو۔

اے جے ونسنک نے مقامِ ابراہیمؑ کی تشریح اس طرح بیان کی ہے:

Between this archway [al-Hatim] and the facade (N.E.) is a little building with a small dome, the makam Ibrahim. In it is kept a stone bearing the prints of two human feet. The patriarch Ibrahim, father of Isma'il, is said to have stood on his feet when building the Ka'bah and the marks of his feet were miraculously preserved.[11]

اس قوس نما راستے [الحطیم] اور [شمال مشرقی سمت] خالی میدان کی طرف والے حصے کے درمیان ایک مختصر سے گنبد والی ایک چھوٹی سی عمارت مقامِ ابراہیمؑ ہے۔ اس میں ایک پتھر رکھا ہے، جس پر انسانی قدموں کے دو نشان موجود ہیں۔ اسماعیلؑ کے والد ابراہیمؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کعبہ تعمیر کرتے وقت اس پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہوتے تھے۔ اور ان کے پیروں کے نشانات اس پر معجزانہ طریق سے نقش ہو گئے تھے۔

زمزم کا کنواں خانہ کعبہ کے بالکل قریب ہی واقع ہے۔ 'انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن' اگرچہ اسے ایک خرافات ہی قرار دیتا ہے، لیکن مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی وضاحت بھی کرتا ہے:

Opposite the corner of the Black Stone is a small building housing the sacred well of Zamzam, from which pilgrims drink water at the conclusion of their circumambulations and prayers. Its origin is mythically associated with Hajar (Hagar) and Ismail (Ishmael), for whom God provided water in this desert place after commanding Ibrahim to abandon mother and child and promising to care for them in his place.[12]

حجر اسود والے کونے کے بالمقابل ایک چھوٹی سی عمارت ہے، جس میں 'زم زم' کا مقدس کنواں واقع ہے، جس سے حاجی اپنا طواف اور دعائیں مکمل کرنے کے بعد، پانی پیتے ہیں۔ اس کی اصل بنیاد کو افسانوی انداز میں ہاجرہ اور اسماعیلؑ کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس صحرائی مقام پر پانی فراہم کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو حکم دیا تھا کہ وہ ماں اور بچہ کو یہاں چھوڑ جائیں اور اس [ابراہیمؑ] سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ [اللہ تعالیٰ] اس [ابراہیمؑ] کی جگہ ان [ماں بیٹے] کی دیکھ بھال کرے گا۔

حطیم میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبریں ہیں۔ اے۔ جے ونسنک 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' میں اپنے مقالے 'کعبہ' میں اسلامی حج کے رسوم و مقامات کی وضاحت کرتا ہے۔ اس نے اس کے متعلق مندرجہ ذیل تفاصیل دی ہیں:

Opposite the north-west wall, but not connected with it, is a semi-circular wall (al-hatim) (...). The semi-circular space between the hatim and the Ka'bah enjoys an especial consideration, because for a time it belonged to the Ka'bah; (...) The space bears the name al-hidjr or hidjr Isma'il [lap of Ishma'el]. Here are said to be the graves of the patriarch [Isma'il] and his mother Hagar.[13]

شمال مغربی دیوار کے بالمقابل ایک نیم دائرے کی شکل میں دیوار [الحطیم] ہے، لیکن وہ اس کے ساتھ ملحق نہیں ہے۔ (...)۔ کعبہ اور حطیم کے درمیان یہ نیم دائرے جیسی جگہ خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ ایک عرصے تک یہ جگہ خانہ کعبہ کا حصہ تھی۔ (...)۔ اس جگہ کا نام الحجر یا حجر اسماعیلؑ [اسماعیلؑ کی گود] ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں بزرگ باپ [اسماعیل] اور ان کی والدہ ہاجرہ کی قبریں ہیں۔

جہاں تک آٹھویں سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا اُس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کرنے کے اس عظیم واقعے کی یاد منانے کے لیے قدیم زمانے سے کوئی تقریبات یا رسوم منائی جاتی رہی ہیں اور کیا یہ تقریبات اس موریاہ کے اردگرد کچھ مقامات سے

منسلک ہیں؟'، تو اس قربانی سے متعلق متعدد ایسی تقریبات ہیں جو عرب کے لوگ آغازِ اسلام سے صدیوں پہلے سے مستقلاً مناتے چلے آ رہے ہیں۔ ان تقریبات کا تعلق اس موریاہ کے اردگرد کے متعدد مقامات سے ہے۔ ان میں سے ایک تو صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر ہیں، جنھیں 'سعی' کہتے ہیں۔ یہ 'سعی' لاکھوں کی تعداد میں ایسے حاجی سرانجام دیتے ہیں جو ذوالحجہ کے مہینے میں حج ادا کر رہے ہوں یا وہ کروڑوں زائرین جو پورے سال کے دوران میں کسی بھی وقت عمرہ کر رہے ہوں۔ یہ 'سعی' حضرت ہاجرہ کی اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں کی جانے والی اسی طرح کی 'سعی' کی یادگار کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ 'سعی' کی رسم میں اس واقعے کی تفصیلات اتنی باریک بینی سے محفوظ کی گئی ہیں کہ اپنی 'سعی' کے دوران میں حجاج کرام بھی اسی جگہ تیز تیز چلنا شروع کر دیتے ہیں، جہاں حضرت ہاجرہ تیز تیز چلی تھیں۔ اس جگہ پر آج کل سبز روشنیوں کے ذریعے سے نشان دہی کی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ مقام 'مسعیٰ' کے نشیب میں واقع ہے، کیونکہ اس جگہ حضرت ہاجرہ کو اپنا بیٹا نظر نہیں آتا تھا، اس لیے وہ اس جگہ اپنی رفتار تیز کر دیتی تھیں۔ پھر اسی قربانی کی یادگار کی ایک شکل یہ ہے کہ عیدالاضحیٰ کے تہوار پر پوری دنیا کے کروڑوں مسلمان اپنے اپنے گھروں میں بکریوں، بھیڑوں، دنبوں، گائیوں اور اونٹوں کی قربانیاں کرتے ہیں اور لاکھوں مسلمان حاجی حج کے دوران میں یہ قربانی مکے میں پیش کرتے ہیں۔ پھر آبِ زم زم ہے جسے حاجی ایک متبرک مشروب کے طور پر پیتے ہیں۔ یہ وہی چشمہ ہے جو اس بے آب خطے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے پھوٹ نکلا تھا۔ یہ پورے سال کے دوران میں ایک بہت بڑی آبادی کو حیرت انگیز طور پر پانی فراہم کرتا ہے۔ اور دنیا بھر کے کروڑوں زائرین اور حجاج کرام اس کا پانی ایک تبرک کے طور پر اپنے گھروں کو بھی لے جاتے ہیں۔ اسلامی حج کے سلسلے میں ایک اور رسم بھی ہے جسے تلبیہ کہتے ہیں۔ حجاج کرام جب حج کا خصوصی لباس، جسے احرام کہا جاتا ہے، پہن لیتے ہیں تو وہ مسجدِ حرام میں داخل ہونے تک یہ تلبیہ پڑھتے رہتے ہیں:

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ.

حاضر ہوں اے اللہ، میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔
سب تعریف اور نعمت تیرے ہی لیے ہے اور بادشاہی بھی تیری ہی ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے اکلوتے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق قربانی کے لیے پیش کرنے پر آمادگی کی یادگار ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس کام کے لیے پکارا تو اس نے کہا:

لبیک، یعنی: 'میں حاضر ہوں'۔[14]

جہاں تک نویں سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا عربوں میں کچھ اور ایسے رسم و رواج یا روایات بھی موجود ہیں جن سے ان (عربوں) کا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے رشتہ ثابت ہوتا ہو؟' تو اس سلسلے میں عربوں میں ختنہ کی رسم پائی جاتی ہے جس کی وہ بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ اور یہ ان کے بزرگ آبا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ان کے تعلق کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسلام نے اپنے پیروکاروں کے درمیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے میثاق کی علامت کے طور پر اس رسم کو اسی طرح جاری رکھا جس طرح یہودیوں نے رکھا ہوا ہے۔ اگر ابتدائی عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے نہ ہوتے تو ان کی اس روایت کی پابندی اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے منسوب کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ 'انسائیکلو پیڈیا ببلیکا' کے خیال کے مطابق ختنہ کی رسم 'پہلوٹھے بیٹے' کی قربانی کی علامت کے طور پر ادا کی جاتی ہے:

Indeed, the evidence goes to show that in exceptional cases the offering was actually made. However, just as the first-fruits were offered as a part of the whole, it is conceivable that originally the rite of circumcision was instituted upon the same principle to typify the offering of the firstborn.[15]

درحقیقت شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیر معمولی حالات میں [انسانی] قربانی فی الواقع بھی پیش کی جاتی تھی، تاہم عین اس طرح، جیسے پہلے پہلے پھل پوری پیداوار کے ایک حصے کے طور پر نذر کیے جاتے تھے، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ابتدائی طور پر ختنے کی رسم اسی اصول کے تحت ادا کی جاتی تھی، تاکہ یہ پہلوٹھے کی قربانی کی قائم مقام بن سکے۔

جوزیفس نے اپنی کتاب 'Antiquities' میں، جو آغازِ اسلام سے پانچ سو سال سے بھی زیادہ پہلے لکھی گئی تھی، بیان کیا ہے کہ عربوں میں ختنہ کی رسم ان کی قوم کے بانی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ختنہ کی یاد میں ادا کی جاتی ہے:

And they circumcised him upon the eighth day. And from that time the Jews continue the custom of circumcising their sons within that number of days. But as for the Arabians, they circumcise after the thirteenth year, because Ismael, the founder of their nation, who was born to Abraham of the concubine, was circumcised at that age;[16]

اور انھوں نے آٹھویں دن اس کا ختنہ کیا اور اس وقت سے یہودیوں میں اپنے بیٹوں کی اتنے دنوں کے اندر اندر ختنہ کرنے کی رسم چلی آ رہی ہے، لیکن جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، وہ تیرھویں سال کے بعد ختنہ کرتے ہیں، کیونکہ ان کی قوم کے بانی اسماعیلؑ جو ابراہیمؑ کے ہاں باندی سے پیدا ہوئے تھے، ان کا ختنہ اس عمر میں کیا گیا تھا۔

جہاں تک دسویں سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا اس 'مروہ' کے قرب و جوار میں کوئی ایسی مقدس عمارت یا جگہ بھی موجود رہی ہے جس کی تعمیر بزرگ آبا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے منسوب ہو؟' تو اس 'المروہ یا موریاہ' کے قریب ہی الکعبہ کا حرم موجود ہے، جس کی تعمیر بزرگ آبا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے منسوب ہے اور اس روایت کے قدیم ہونے کی معقول شہادت موجود ہے۔ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے والے مشہور مترجم جارج سیل نے اپنے مقالے 'The Preliminary Discourse' میں مکہ کے مقام پر حرم الکعبہ کی موجودگی کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے:

The temple of Mecca was a place of worship, and in singular veneration with the Arabs from great antiquity, and many centuries before Mohammed (...) the Mohammedans are generally persuaded that the Caaba (...) was rebuilt by Abraham and Ismael, at God's command, (...). After this edifice had undergone several reparations, it was a few years after the birth of Mohammed, rebuilt by the Koreish on the old foundation, (...). Before we leave the temple of Mecca, two or three particulars deserve further notice. One is the celebrated black stone, which is set in silver, and fixed in the south-east corner of the Caaba, (...). Another thing observable in this temple

is the stone in Abraham's place, wherein they pretend to show his footsteps, telling us he stood on it when he built the Caaba,' and that it served him for scaffold. (...). The last thing I shall take notice of the temple is the well Zem-zem, on the east side of the Caaba, (...). The Mohammedans are persuaded that it is the very spring which gushed out for the relief of Ismael, when Hagar his mother wandered with him in the desert, and some pretend it was so named from her calling to him, when she spied it, in the Egyptian tongue, Zem, zem, that is, "Stay, stay,"[47]

مکہ کا معبد عبادت کی جگہ تھی اور عرب کے لوگ محمد [ﷺ] سے صدیوں پہلے قدیم زمانے سے اس کی بے مثال تعظیم کرتے تھے۔ (...)۔ مسلمان بالعموم اس بات کے قائل ہیں کہ یہ کعبہ (...) ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے اللہ کے حکم سے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ (...)۔ یہ عمارت متعدد مرتبہ کی مرمت کے بعد محمد [ﷺ] کی پیدائش کے چند سال بعد قریش نے پرانی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کی تھی۔ (...)۔ مکہ کے معبد کا بیان ختم کرنے سے پہلے مزید دو یا تین خاص باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو وہ مشہور و معروف حجرِ اسود ہے جو چاندی سے جڑا ہوا ہے اور خانہ کعبہ کے جنوب مشرقی کونے میں نصب ہے۔ (...)۔ اس معبد میں ایک اور قابلِ دید شے مقامِ ابراہیم میں وہ پتھر ہے جس میں ان [عربوں] کا دعویٰ ہے کہ ان [حضرت ابراہیم علیہ السلام] کے قدموں کے نشان نمایاں ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جب وہ کعبہ تعمیر کر رہے تھے تو اس کے اوپر کھڑے ہوتے تھے اور یہ کہ یہ پتھر ان کے لیے ایک گو (scaffold) کا کام دیتا تھا۔ (...)۔ اس ہیکل کی آخری چیز جس کا میں ذکر کروں گا، وہ کعبے کے مشرقی جانب زم زم کا کنواں ہے۔ (...)۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہی وہ چشمہ ہے جو اسماعیلؑ کی مدد کے لیے اس وقت، جب اس کی ماں ہاجرہ اس کو لے کر صحرا میں گھوم رہی تھی، پھوٹ بہا تھا۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ اس کا نام 'زم زم' اس لیے پڑا کہ جب اس [ہاجرہ] نے یہ دریافت کیا تو اس نے مصری زبان میں اسے کہا 'زم زم'، جس کا مطلب ہے 'ٹھہر ٹھہر'۔

قرآن کے انگریزی زبان کے ایک مشہور مترجم پروفیسر پامر نے اپنے مقدمہ قرآن میں لکھا ہے:

The traditions of Abraham the father of their race and the founder of Muhammad's own religion, as he always declared him to be, no doubt gave the ancient temple a peculiar sanctity in the Prophet's eyes, and although he had first settled upon Jerusalem as his Qiblah, he afterwards reverted to the Kaabah itself. Here, then, Muhammad found a shrine, to which, as well as at which, devotion had been paid from time immemorial; it was one thing

which the scattered Arabian nation had in common, the one thing which gave them even the shadow of a national feeling; and to have dreamed of abolishing it, or even of diminishing the honours paid to it, would have been madness and ruin to his enterprise. He therefore did the next best thing, he cleared it of idols and dedicated it to the service of God.[18]

عربوں کی نسل کے مورثِ اعلیٰ اور محمد [ﷺ] کے دین کے بانی، جیسا کہ وہ [محمد ﷺ ان کے بارے میں] ہمیشہ دعویٰ کرتے تھے، ابراہیمؑ کی روایت نے بلاشبہ اس قدیم معبد کو رسول اللہ [ﷺ] کی نظروں میں ایک مخصوص تقدس عطا کیا۔ اگرچہ انھوں نے پہلے یروشلم کو اپنا قبلہ بنایا تھا، لیکن بعد میں وہ کعبے ہی کی طرف رخ کرنے لگے۔ اس طرح یہاں محمد [ﷺ] نے ایک ایسی مقدس عمارت پائی جسے قدیم ایام سے تقدس حاصل تھا۔ یہ وہ واحد چیز تھی جو منتشر عرب قوم کی مشترک میراث تھی: وہ واحد چیز، جو اُن میں ایک قومی احساس کی جھلک بھی پیدا کرتی تھی، اسے ترک کر دینے، یا جو احترام اسے حاصل تھا، اس میں کمی کر دینے کا خواب بھی ایک دیوانگی اور آپؐ کی تحریک کے لیے تباہی کا موجب ہوتی۔ اس لیے آپؐ نے اس کے بجائے وہ کام کیا جو سب سے بہتر تھا۔ آپؐ نے اس [خانہ کعبہ] کو بتوں سے پاک صاف کر دیا اور اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیا۔

ذیل میں کچھ مزید شہادتیں بھی نقل کی جاتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکہ میں کعبہ کی عمارت زمانہ قدیم سے موجود تھی۔ سی ای بوسورتھ (C. E. Bosworth) 'انسائیکلوپیڈیا امریکانا' میں مندرجہ ذیل الفاظ میں خانہ کعبہ کی قدامت کی تصدیق کرتا ہے:

The Kaaba was almost certainly an important shrine of a well attested Semitic pattern, in pre-Islamic times. It is not clear when it was first associated with the rites of the Pilgrimage, which itself must be of pre-Islamic origin. Muslim tradition traces it to Abraham and Ishmael. The Prophet Mohammed cleansed the Kaaba of its idols and its pagan features in 630.[19]

خانہ کعبہ قریباً یقینی طور پر زمانہ قبل اسلام میں مسلمہ سامی طرز تعمیر کی ایک اہم عبادت گاہ تھی۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ زمانہ قبل اسلام سے جاری مراسم حج سے پہلی دفعہ کب منسلک ہوئی۔ مسلمانوں کی روایت اسے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے منسلک کرتی ہے۔ محمد رسول اللہ [ﷺ] نے ۶۳۰ء میں اس کے مشرکانہ خدوخال اور اس کے بتوں سے اسے پاک کیا۔

ایڈورڈ جے جرجی 'کولیئرز انسائیکلوپیڈیا' میں بیان کرتا ہے کہ قریش کعبہ کے متولی اور روایت نسلِ اسماعیلؑ کے محافظ تھے:

As custodians of Kaaba and preservers of the Ishmaelite tradition, the Quraysh tribe presided over its pagan worship until Mohammed appropriated it for his new faith.[20]

قبیلہ' قریش کعبے کے متولی اور نسلِ اسماعیل کی روایت کے محافظ ہونے کی حیثیت سے اس (کعبہ) میں ادا کی جانے والی مشرکانہ عبادات کی رہنمائی کرتا تھا۔ حتیٰ کہ محمد [ﷺ] نے اسے اپنے نئے دین کے لیے مخصوص کرلیا۔

'انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن' کا بیان ہے کہ کعبہ بلاشبہ محمد ﷺ کی پیدائش کے صدیوں پہلے سے موجود تھا:

The historical origin of the Ka'bah is uncertain, but it had undoubtedly existed for several centuries before the birth of Muhammad (c. 570 CE). By his time it was the principal religious shrine of central Arabia and, located at the centre of a sacred territory (haram), had the characteristic of a Semitic sanctuary.[21]

یہ بات غیر یقینی ہے کہ تاریخی طور پر خانہ کعبہ کی بنیاد کب پڑی، لیکن اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ عمارت محمد [ﷺ] کی پیدائش (قریباً ۵۷۰ء) سے کئی صدیاں پہلے موجود تھی۔ اس [محمد ﷺ] کے زمانے تک یہ مرکزی عرب کی سب سے بڑی مذہبی عبادت گاہ تھی۔ یہ ایک مقدس خطے (حرم) کے مرکز میں واقع تھی اور سامی حرم کی خصوصیات کی حامل تھی۔

قدیم زمانے کے مشہور مصری جغرافیہ دان کلاڈیس بطلیموس (جو عام طور پر ٹالمی کے نام سے مشہور ہے اور تقریباً ۹۰ء تا ۱۶۸ء کے زمانے کا ہے) نے بھی مکہ کے نزدیک ایک عبادت گاہ کی موجودگی کا ذکر کیا ہے جس کے لیے وہ 'میکورابہ' کا لفظ استعمال کرتا ہے:

It is to be noted that Ptolemy (Geography, vi.7) in place of Mecca mentions Macoraba, which is probably to be interpreted, as does Glaser, as the South Arabian or Ethiopic mikrab, "temple". From this one may conclude that the Ka'ba already existed in the second century A. D.[22]

واضح رہے کہ ٹالمی (جغرافیہ ۶:۷) مکے کے بجائے 'میکورابہ' کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی وضاحت،

جیسا کہ گلیزر بیان کرتا ہے، غالباً یہ ہے کہ یہ جنوبی عرب یا ایتھوپیا کا لفظ 'مقرب' یعنی 'ہیکل' ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خانہ کعبہ دوسری صدی عیسوی سے بھی پہلے سے موجود چلا آ رہا تھا۔

'شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' نے اس کے متعلق ایک اور شہادت بھی بیان کی ہے:

The information available regarding the distribution of the offices among the sons of Kuṣaiy shows that the worship of the sanctuary had developed into a carefully regulated cult several generations before Muḥammad.[23] (...). The Ka'ba had offerings dedicated to it in the heathen as well as the Muslim period. Al-Azrak devotes a detailed chapter to this subject (ed. Wustenfeld, p. 155 sqq.).[24]

قصی کے بیٹوں کے درمیان مناصب کی تقسیم کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حرم میں ادا کی جانے والی عبادت محمد [ﷺ] سے کئی نسلوں پہلے ہی ایک احتیاط سے ترتیب دی ہوئی باقاعدہ عبادت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ (...)۔ خانہ کعبہ میں مشرکین کے دور میں بھی، اور مسلمانوں کے دور میں بھی، باقاعدہ قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ الازرقی نے اس موضوع کے لیے ایک مفصل باب مختص کیا ہے۔ (ed. Wustenfeld, p. 155 sqq.)

جہاں تک گیارھویں سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا کوئی ایسے نشانات بھی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ الکعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی تھی؟'، تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ خانہ کعبہ کے دروازے کے عین بالمقابل مطاف میں ایک نشیب تھا، جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ گارا اور مسالا ملایا کرتے تھے جو کعبے کی تعمیر میں استعمال ہوتا تھا۔ 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' میں اسے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

The pavement on which the ṭawaf is performed is called maṭaf; a depression in it just opposite the door has still to be mentioned; it is called al-mi'djan "the trough"; according to legend, Ibrahim and Isma'il [q.v.] here mixed the mortar used in building the Ka'ba.[25]

وہ راستہ جس پر طواف کیا جاتا ہے، مطاف کہلاتا ہے۔ اس میں دروازے کے عین بالمقابل ایک نشیب کا ذکر ابھی باقی ہے۔ اسے المعجن، یعنی 'ناند' کہا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کعبے کی تعمیر میں استعمال ہونے والا مسالا یہاں ملایا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک نشانی مقامِ ابراہیم بھی ہے جو اس بات کی ایک اور شہادت ہے کہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' کا بیان ہے:

Between this archway and the facade (N.E.) is a little building with a small dome, the maḳam Ibrahim. In it is kept a stone bearing the prints of two human feet. The patriarch Ibrahim, father of Isma'il, is said to have stood on this stone when building the Ka'ba and the marks of his feet were miraculously preserved.[26]

اسی قوسی راستے اور شمال مشرقی حصے کی پیشانی کے درمیان ایک مختصر سے گنبد والی ایک چھوٹی سی عمارت مقامِ ابراہیم ہے۔ اس میں ایک پتھر ہے جس پر انسانی پاؤں کے دو نقش ثبت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسماعیل کے والد ابراہیم کعبہ تعمیر کرتے وقت اس پر کھڑے ہوا کرتے تھے اور ان کے قدموں کے نشانات معجزانہ انداز میں اس پر ثبت ہو گئے تھے۔

جہاں تک بارھویں سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا کوئی ایسے شواہد بھی پائے جاتے ہیں کہ اسحاق یا ان کی نسل کے لوگ اسحاق علیہ السلام کے قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی یاد منانے کی غرض سے کسی 'مروہ' کے مقام پر قربانیاں پیش کرنے کے لیے لے جایا کرتے تھے؟' تو بائبل یا عربوں کی روایات میں نہ تو اس بات کی کوئی شہادت موجود ہے کہ اسحاق علیہ السلام کبھی کسی 'موریاہ' نامی مقام پر گئے ہوں اور نہ بائبل یا تاریخ کے اوراق میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل کے حق میں کوئی ایسی شہادت موجود ہے جس سے ثابت ہو کہ وہ قربانیاں پیش کرنے کے لیے 'موریاہ' جایا کرتے تھے یا کوئی مراسمِ حج ادا کیا کرتے تھے۔ البتہ، دوسری طرف، زمانہ قبل اسلام کے عرب قبائل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی یاد میں زمانہ قدیم سے مروہ کے مقام پر قربانیاں پیش کرتے چلے آرہے تھے اور بعد میں پورا عالمِ اسلام بھی آج تک اس پر عمل پیرا ہے۔ بلاشبہ اہلِ عرب، جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، صدیوں بلکہ ہزاروں سال قبلِ اسلام سے اپنے بزرگ آبا کی قربانیوں کی رسم ادا کرتے آئے ہیں۔

جہاں تک تیرھویں سوال کا تعلق ہے کہ 'جس طرح بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی

زوجہ حضرت سارہ اور ان کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کے بارے میں بیان ہے کہ ان کا کہاں انتقال ہوا تھا اور انھیں کس جگہ دفن کیا گیا تھا۔ کیا اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کے بارے میں بھی ان تفصیلات کا کوئی ذکر ہے؟ اگر ہے تو کس جگہ ہے اور اگر نہیں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟'، تو یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ بائبل حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کی جائے تدفین کے بارے میں مکمل طور پر خاموش ہے، جبکہ اس میں یہ بات واضح طور پر درج ہے کہ کنعان میں حبرون کے مقام پر مکفیلہ کا غار حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی بیوی حضرت سارہ[28] اور ان کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام[29] کی جائے تدفین ہے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو بس یہ فرض ہی کیا جا سکتا ہے کہ ایسا اسرائیلیوں کی اپنے کزن بنو اسماعیل سے عدم دلچسپی، اظہارِ لاتعلقی، نظر اندازی اور بے رحمی، بلکہ حسد اور رقابت کی وجہ ہی سے تھا۔

جہاں تک چودھویں سوال کا تعلق ہے کہ 'کیا عربوں میں، جو تاریخی اعتبار سے بدیہی طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل ہیں، ایسی کوئی مسلمہ روایت موجود ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہ کو کہاں دفن کیا گیا تھا؟' تو اس کا جواب اثبات میں، یعنی 'ہاں' ہے۔ اے جے ونسنک اور جے۔ جومیئر 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' میں اپنے مقالے 'کعبہ' میں لکھتے ہیں:

The space (al-hatim) bears the name al-hidjr or hidjr Isma'il. Here are said to be the graves of the patriarch and his mother Hagar.[30]

اس جگہ (الحطیم) کا نام الحجر یا حجر اسماعیل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسماعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہ کی قبریں یہاں پر واقع ہیں۔

'دی نیو اسٹینڈرڈ انسائیکلوپیڈیا' میں وضاحت ہے:

Ishmael Son of Abraham and Hagar. He was exiled with his mother to the wilderness on account of Sarah's jealousy of him. He married an Egyptian, was famed as an archer and was buried in Mecca. Mahomet claimed him as an ancestor.[31]

ابراہیمؑ اور ہاجرہ کے فرزند، اسماعیلؑ: ان [اسماعیلؑ] کو سارہ کے ان سے حسد کی وجہ سے ان کی والدہ [ہاجرہ] کے ساتھ بیابان میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے ایک مصری عورت سے شادی کر

لی تھی۔ وہ ایک تیر انداز کے طور پر مشہور ہوئے اور انھیں مکے میں دفن کیا گیا۔ محمد [ﷺ] کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کے آباواجداد میں سے تھے۔

جہاں تک پندرھویں سوال کا تعلق ہے کہ بائبل کے مؤلفین نے یہ ابہام کیوں پیدا کیا ہے، تو اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگ باپ حضرت اسحاق علیہ السلام کو عزت واحترام اور تقدس دینا چاہتے تھے۔ کتاب تواریخ کے مؤلف نے غیر منصفانہ طور پر ارونا یبوسی کے کھلیان کے محلِ وقوع کا نام 'موریاہ' رکھ کر ان کی اس ناروا خواہش کے لیے ایک بنیاد گھڑ دی۔ یہ ابہام کبھی جڑ نہ پکڑتا اگر کتاب تواریخ کا مؤلف ہیکل سلیمانی کو تقدس فراہم کرنے کے لیے اسے گھڑ کر اپنی کتاب تواریخ میں داخل نہ کر لیتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب تواریخ عرصۂ دراز تک ایک مسترد اور غیر مستند کتاب سمجھی جاتی تھی۔[32] اس مضمون کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بیٹے کو قربانی کے سلسلے میں اعتماد میں نہ لیا گیا ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کو بیٹے کے لیے کوئی اعزاز یا خوبی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کو آخری وقت تک بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ انھیں قربانی کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ لکڑی اور آگ تو یہ موجود ہے، لیکن سوختنی قربانی کے لیے برہ کہاں ہے؟[33] پھر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان پر یہ ظاہر کر دیں کہ وہ انھی (حضرت اسحاق علیہ السلام) کی قربانی پیش کرنے کے لیے جا رہے ہیں، بلکہ وہ کہتے ہیں: 'میرے بیٹے، اللہ تعالیٰ خود ہی سوختنی قربانی کے لیے برہ مہیا کر دے گا۔'[34] اس طرح قربانی کا عمل صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے لیے موجب افتخار ہو سکتا تھا، جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش مطلوب تھی۔ اس سلسلے میں حضرت اسحاق علیہ السلام کو کوئی اعزاز نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ انھیں تو اس بات کا علم تک نہ تھا کہ ان کے والد انھیں قربان کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں، لیکن جہاں تک حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تعلق ہے تو نہ صرف یہ کہ انھیں ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پورے اعتماد میں لیا تھا، بلکہ انھوں نے قربانی کے تصور کی تائید کی تھی، اللہ کے حکم کے آگے خوشی سے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا اور اپنے آپ کو اپنے والد کے ہاتھوں قربان ہونے

کے لیے پیش کر دیا تھا۔ قرآن نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ . فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ . وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ . رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ . فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ . فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ . فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ . وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ . قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ . إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ . وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ . وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ . سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ . كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ . إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ . وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ . وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِنَفْسِهِ مُبِينٌ .[35]

انھوں نے آپس میں کہا کہ 'اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔' انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی، مگر ہم نے انھی کو نیچا دکھا دیا۔

ابراہیم نے کہا، 'میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اے میرے پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحین میں سے ہو۔' (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔ وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا، 'بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟' اس نے کہا، 'ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔' آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ 'اے ابراہیمؑ، تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیمؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی: ایک نبی صالحین میں سے۔ اور اسے اور اسحاقؑ کو برکت دی۔ اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔[36]

حواشی باب ہشتم

1. Entry No. 875, p. 18: 'be-ayr; from 874; a pit; espec. a well.' Entry No. 874, p. 18: 'ba'ar, baw-ar ; a prim. Root; to dig'; + Entry No. 7650, p. 112: 'shaba shaw-bah ; a prim. Root; to seven oneself, i.e. swear (as if by repeating a declaration seven times).'

2. Beer Sheba. 'be-ayr' sheh-bah; from 875 and 7651 (in the sense of 7650); well of an oath. :-adjure, charge (by an oath, with an oath), take an oath.' (*A Concise Dic. of the words in The Heb. Bible* by J. Strong, NY: The Methodist Book Concern, 1984, Entry No. 884, p. 18).

3. *The Enc of Islam New Edition*, ed E. Van Donzel, B. Lewis and ch. Pellat, C. E. Bosworth (Leiden: E. J. Brill, 1978), 4:320.

۴۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۷۷ء، (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۰۷)، ۵:۴۸۵۔

۵۔ بائبل، کتاب پیدائش ۲۲:۱۱–۱۸۔

۶۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ عبرانی زبان اپنی ہم جنس دوسری سامی زبانوں (سریانی، ارامی، عربی، وغیرہ) کے رسم الخط کی طرح دائیں سے بائیں طرف لکھی جاتی ہے۔

7. *Enc. of Islam, New* (1997) edn., s.v. 'Ka'ba', 4:320.

8. *The Enc. of Religion* (NY: Macmillan Publishing Co, 1987), 8:225ff.

9. *Enc. of Islam, New* (1997) edn., s.v. 'Ka'ba', 4:318-20.

10. *The Enc. of Religion* (NY: Macmillan Publishing Co, 1987), 8:225-26.

11. *Enc. of Islam, New* (1997) edn., s.v. 'Ka'ba', 4:318-20.

12. *The Enc. of Religion* (NY: Macmillan Publishing Co, 1987), 8:225-26.

13. *Enc. of Islam, New* (1997) edn., s.v. 'Ka'ba', 4:318-20.

۱۴۔ بائبل، کتاب پیدائش ۲۲:۱۔

15. *Enc. Biblica*, 2:1525-26.

16. Flavius Josephus, *Antiquities*, Book I, Ch. xii: 2, 4, p.41.

17. George Sale, *'The Preliminary Discourse' to the 'ALKORAN OF MOHAMMED'* (London: Frederick Warne & Co.), na., p. 90.

18. *The QUR'AN, Tr.* by E. H. Palmer (Delhi: Motilal Banarsidass, 1988), p. liii.

19. *The Enc. Americana International Edn.* in 30 Vols. (Connecticut: Grolier Incorporated, Danbury: 1987), 16:254.

20. *Colliers Enc.* In 24 Vols. (NY, 1995), 13:695.

21. *The Enc. of Religion*, 8:225-26.

22. H.A.R. Gibb and J.H.Krammers, *Shorter Enc. Of Islam*, (Karachi: South Asian Publishers, 1981), s.v. "Ka'ba", p.193.

23. *Shorter Enc.* Of Islam, p. 193.

24. *Shorter Enc. Of Islam*, p. 193.

25. *The Enc. of Islam*, 4:318.

26. *The Enc. of Islam*, 4:318.

۲۷۔ بائبل، کتاب پیدائش ۲۵: ۹-۱۰۔

۲۸۔ بائبل، کتاب پیدائش ۲۵: ۱۰۔

۲۹۔ بائبل، کتاب پیدائش ۴۹: ۲۹-۳۰۔

30. *The Enc. of Islam*, 4:318.

31. *The New Standard Enc. and World Atlas* (London: Odhams Press Ltd., W. C. 2, 1932), p. 699.

۳۲۔ ملاحظہ کیجیے ضمیمہ ۲۔

۳۳۔ بائبل، کتاب پیدائش ۲۲: ۷۔

۳۴۔ بائبل، کتاب پیدائش ۲۲: ۸۔

۳۵۔ قرآن کریم، سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷: ۹۷-۱۱۳

۳۶۔ ترجمہ قرآنِ مجید مع مختصر حواشی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۱۱۳۳، ۱۱۳۵۔

باب نہم

مکہ اور عرب بطور مسکنِ نسلِ اسماعیل علیہ السلام

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل زمانہ قدیم سے مکہ اور سرزمین عرب کے دوسرے خطوں میں رہتی چلی آ رہی ہے اور وہ ابھی تک وہاں رہ رہی ہے۔ بائبل کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو فاران کے بیابان اور بیر سبع کے پاس آباد کیا تھا۔ بائبل کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ دونوں مقام صحرائے سینائی میں واقع تھے، لیکن اس بات کا بائبل میں بھی کوئی نشان موجود نہیں کہ سینائی میں کبھی بنو اسماعیل آباد رہے ہوں۔

'دی نیو انگلش بائبل' میں درج ہے:

Ishma'el's sons inhabited the land from Havilah to Shur, which is east of Egypt on the way to Asshur, having settled to the east of his brothers.[1]

اور اُس (اسماعیلؑ) کی اولاد حویلہ سے شور تک، جو مصر کے مشرق میں (سامنے) اُس راستے پر ہے جس سے اشور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے مشرق میں (سامنے) بسے ہوئے تھے۔

'کنگ جیمز ورشن' میں یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

And they dwelt from Havilah unto Shur, that is before Egypt, as thou goest toward Assyria and he died in the presence of all his brethren.[2]

اور وہ (اولادِ اسماعیلؑ) حویلہ سے شور تک، جو مصر کے مشرق میں (سامنے) اُس راستے پر ہے، جس سے اشور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ اور اس (اسماعیلؑ) نے اپنے سب بھائیوں کی موجودگی

میں وفات پائی۔

بائبل کے تقریباً تمام تراجم اور ایڈیشنوں میں نسلِ اسماعیلؑ کی آبادکاری کے متعلق یہی بیان درج ہے۔ ان کی آبادکاری کے لیے کوئی دوسرا بیان کہیں موجود نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بائبل کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل 'حویلہ سے شور تک' کے علاقے میں آباد ہوئی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کی جائے سکونت کے تعین کے لیے 'حویلہ' اور 'شور' کا محلِ وقوع ٹھیک ٹھیک طور پر معلوم کرنا ضروری ہے۔ 'حویلہ' کا لفظ سرزمین یمن کے لیے استعمال ہوتا تھا اور 'شور' کا مقام بحیرۂ قلزم کے شمال مشرقی سرے پر خلیج عقبہ کے نزدیک کسی جگہ واقع تھا۔ اس طرح یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بائبل کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل الحجاز کے علاقے میں آباد ہوئی تھی۔ حجاز یمن کے شمال میں سرزمین عرب کا مغربی خطہ ہے۔ 'حویلہ' اور 'شور' کے محلِ وقوع کا مختصر بیان درج ہے۔

حویلہ

جہاں تک 'حویلہ' کا تعلق ہے، تو یہ جنوبی عرب یا یمن کا نام ہے۔ اسکندریہ کے مشہور جغرافیہ دان بطلیموس (متوفی ۱۴۰ء) کے مطابق قدیم زمانے میں اس کا نام 'عربیا فیلکس' (Arabia Falix) تھا۔ 'ایسٹن کی بائبل ڈکشنری' میں درج ہے:

A district in Arabia-Felix [3] (...). It is the opinion of Kalisch, however, that Havilah "in both instances, designates the same country, extending at least from the Persian to the Arabian Gulf, and on account of its vast extent easily divided into two distinct parts." This opinion may be well vindicated. [4]

عربیا فیلکس میں ایک ضلع۔ (...)۔ تاہم کالش کی رائے یہ ہے کہ یہ حویلہ دونوں مقامات پر ایک ہی ملک کی نشان دہی کرتا ہے، جو کم از کم خلیج فارس سے خلیج عرب تک پھیلا ہوا ہے اور اپنے اس وسیع پھیلاؤ کی بنا پر بآسانی دو ضلعوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ اس رائے کی تصدیق کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

ولیم سمتھ نے بھی تقریباً اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

A district in Arabia Felix, Gen. 10:7, named from the second son of Cush; probably the district of Kualan, in the northwestern part of Yemen.[5]

یہ عربیا فیلکس کا ایک ضلع ہے (کتاب پیدائش ۱۰:۷) جس کا نام کوش کے دوسرے بیٹے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ غالباً یہ یمن کے شمال مغربی علاقے میں کیوآلان کا ضلع ہے۔

'انسائیکلوپیڈیا جوڈائیکا' نے لکھا ہے کہ حویلہ کا محل وقوع جنوبی عرب ہے:

The latter Havilah, the son of Joktan, apparently stands for a locality in South Arabia as do Hadoram (Gen. 10:27), Sheba (Gen. 10:28), and Ophir (Gen. 10:29).[6]

بعد والا حویلہ، یعنی یقطان کا بیٹا، بظاہر جنوبی عرب میں کسی مقام کو ظاہر کرتے ہیں، جیسا کہ حدورام (پیدائش ۱۰:۲۷)، شیبا (پیدائش ۱۰:۲۸) اور اوفیر (کتاب پیدائش ۱۰:۲۹)۔

'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' نے مندرجہ ذیل وضاحت کی ہے:

HAVILAH: Name of a district, or districts, in Arabia. (...); the Ishmaelites are also placed in the same locality (Gen. xxv.18), (...). In Gen. x.29 and I Chron. i.23, Havilah is a son of Joktan, associated with Sheba and Ophir in the southern portion of the peninsula. (...). Havilah was identified by Bochart Niebuhr with Khaulan in Tehamah, between Mecca and Sana;[7]

حویلہ عرب کے ایک ضلع یا ضلعوں کا نام: (...) نسلِ اسماعیل کی سکونت اسی مقام پر بتائی گئی ہے (کتاب پیدائش ۲۵:۱۸)، (...)۔ کتاب پیدائش ۱۰:۲۹ اور پہلی کتاب تواریخ ۱:۲۳ میں حویلہ یقطان کا بیٹا ہے۔ یہ جزیرہ نما کے جنوبی حصے میں شیبا اور اوفیر سے منسلک ہے۔ (...) بوخرت نیبوہر نے حویلہ کی مکہ اور صنعا کے درمیان تہامہ میں خولان کے مقام پر نشان دہی کی ہے۔

مندرجہ بالا تمام حقائق سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حویلہ یمن کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا محل وقوع جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مغرب میں ہے۔

شُور

شور کے محل وقوع کی نشان دہی بحیرۂ قلزم کے شمال مشرقی سرے، یعنی خلیج عقبہ کے قریب کسی

جگہ کی جاسکتی ہے۔ ڈبلیو سمتھ نے اس کی مندرجہ ذیل الفاظ میں وضاحت کی ہے:

Shur may have been a fortified town east of the ancient head of the Red Sea; and from its being spoken of as a limit, it was probably the last Arabian town before entering Egypt.[8]

امکان یہ ہے کہ شور بحیرۂ احمر کے قدیم سرے کے مشرق میں ایک قلعہ بند شہر تھا اور کیونکہ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ ایک آخری حد تھی تو امکان یہ ہے کہ یہ مصر میں داخل ہونے سے پہلے عرب کا آخری شہر تھا۔

اکثر علما کے خیال میں اس کا محل وقوع خلیج سویز کے جنوب مشرق میں صحرائے سینائی میں تھا۔ صورتِ حال جو بھی ہو، یہ بات پورے اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ شور یا بیابانِ شور کنعان کے جنوب مغربی کونے سے باہر ہی کسی جگہ واقع ہو سکتا ہے۔ امکان یہ ہے کہ یہ سرزمین عرب کے شمال مغربی سرے کے قریب ہوگی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بائبل کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل عرب میں شور (سرزمین عرب کے شمال مغربی کونے) اور حویلہ (سرزمین عرب کے جنوبی ساحلی علاقے، یعنی یمن اور حضرموت) کے درمیان آباد ہوئی تھی۔ عرب کے لوگ اس خطے کو الحجاز کہتے ہیں۔ مکہ، مدینہ اور طائف کے شہر اسی الحجاز میں واقع ہیں۔ اکثر نسلِ اسماعیل کے قبیلے (اہل عرب) اسی الحجاز میں یا اس کے اردگرد آباد ہوئے تھے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بائبل کے مطابق حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فاران اور بیر سبع کے بیابان میں آباد کیا تھا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متعلق فاران اور بیر سبع کا بیابان اور سرزمین موریاہ عرب میں واقع ہوں نہ کہ سینا میں۔

یہ بات کہ بیش تر قبائلِ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں، عالمی طور پر تسلیم شدہ تاریخی حقیقت ہے اور اس پر کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں۔ ذیل میں جوزیفس کی "Antiquities" سے چند لائنیں نقل کی جاتی ہیں:

(...). And they circumcised him upon the eighth day. And from that time the Jews continue the custom of circumcising their sons within that number of days. But as for the Arabians, they circumcise after the thirteenth year, because Ismael, the founder of their nation, who was born to Abraham of the concubine, was circumcised at that age; (...). Of this wife were born to Ismael twelve sons; Nabaiot, Kedar, Abdeel, Mabsam [or Mibsam], Idumas, Masmaos, Massaos, Chadad, Theman, Jetur, Naphesus, Cadmas. These inhabited all the country from Euphrates to the Red Sea, and called it Nabatene. They are an Arabian nation and name their tribes from these, both because of their own virtue, and because of the dignity of Abraham their father.[9]

اور انھوں نے آٹھویں دن اس کا ختنہ کیا۔ اس وقت سے یہودیوں کے ہاں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ وہ دنوں کی اتنی تعداد کے اندر اندر اپنے بیٹوں کا ختنہ کرتے ہیں، لیکن جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، وہ تیرھویں سال کے بعد ختنہ کرتے ہیں[10]، کیونکہ ان کی قوم کے بانی اسماعیلؑ، جو ابراہیمؑ کے ہاں ایک لونڈی سے پیدا ہوئے تھے، ان کا ختنہ اس عمر میں کیا گیا تھا۔ (...)۔ اس بیوی سے اسماعیلؑ کے ہاں بارہ بیٹے پیدا ہوئے: نبایوت[11]، قیدار[12]، عبدئیل[13]، مبسام (مبسام)، ادوماس[14]، مسماوس[15]، مساوس[16]، حدد[17]، تیمان[18]، جیتر، نفیسس[19]، قدماس[20]۔ یہ دریائے فرات سے بحیرۂ احمر کے سارے ملک میں آباد ہوئے اور وہ اسے نباتین کہتے تھے۔ وہ ایک عربی قوم ہیں اور ایک تو ان کی اپنی نیکی کی وجہ سے اور دوسرے اپنے باپ ابراہیمؑ کے بلند مرتبہ ومقام کی وجہ سے اپنے قبیلوں کے نام ان کے نام پر رکھتے ہیں۔

'کتاب جوبلیز' میں بھی یہ بات ثبت ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل عرب سے تعلق رکھتی ہے۔ ذیل میں اس مفہوم کا اقتباس درج ہے:

And Ishma'el and his sons, and the sons of Keturah, and their sons, went together and dwelt from Paran to the entering of Babylon in all the land which is towards the East facing the desert. And these mingled with each other, and their name was called Arabs, and Ishma'elites.[21]

اور اسماعیلؑ اور ان کے بیٹے، اور قطورہ کے بیٹے، اور ان (بیٹوں) کے بیٹے، اکٹھے گئے اور فاران سے بابل کے داخلے تک ساری سرزمین میں، جو مشرق کی طرف صحرا کے بالمقابل ہے، آباد ہو گئے۔ اور یہ ایک دوسرے سے مل گئے اور وہ اہل عرب اور بنی اسماعیل کے نام سے مشہور ہوئے۔

بائبل کی کتاب پیدائش ۲۵:۱-۱۸ کی وضاحت کرتے ہوئے لارنس بوط لکھتا ہے:

These names also represent a variety of Arabian Tribes.[22]

یہ نام مختلف عرب قبائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

'نیو جیروسلیم بائبل' میں وضاحت ہے:

Ishmael's descendents are the North Arabian tribes.[23]

شمالی عرب کے قبائل اسماعیلؑ کی نسل سے ہیں۔

میکنزی اپنی لغاتِ بائبل میں لکھتا ہے:

He is the ancestor of a number of Arabian tribes.[24]

وہ متعدد عرب قبائل کا جدُّ الاجداد ہے۔

یہ بات عربوں کی شاعری اور اُن کے قصے کہانیوں میں بھی بڑی کثرت سے بیان ہوئی ہے۔ قریش حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دوسرے بیٹے قیدار کی نسل سے ایک نہایت اہم قبیلہ ہے اور یہ آغازِ اسلام سے سینکڑوں، بلکہ ہزاروں سال پہلے سے مکے میں آباد تھا۔

حواشی باب نہم

1. NEB-Gen. 25:18.
2. KJV-Gen. 25:18.

۳۔ 'عربیا فیلکس' جنوبی عرب یا یمن کا قدیم نام ہے۔ جے۔اے تھامپسن نے 'انٹرپریٹرز بائبل ڈکشنری'۱:۱۷۹میں وضاحت کی ہے:

Classical geographers, following Ptolemy (2nd century A.D.), divided the country into three parts: [1] Arabia Patrea, whose main city was Petra and which included Sinai, Edom, Moab, and E. Trans-Jordan; [2] Arabia Deserta, the Syrian Desert; and [3] Arabia Felix, "Fortunate Arabia," the S portion.

بطلیموس (دوسری صدی عیسوی) کی پیروی میں کلاسیکل جغرافیہ نویسوں نے اس ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔(۱) عربیا پیٹریا، جس کا اہم شہر پیٹرا تھا اور جس میں صحرائے سینائی، ادوم، موآب اور شرق اردن شامل تھے، (۲) عربیا ڈیزرٹا، یا صحرائے شام اور (۳) عربیا فیلکس، یعنی خوش نصیب عرب، جس سے جنوبی حصہ مراد ہے۔

4. *Easton's 1897 Bible Dic.* in "Power Bible" CD, ROM Version.
5. *W. Smith's Bible Dic.*, p. 235.
6. *Enc. Judaica*, CD-ROM Version.
7. *The Jewish Enc.*, 6:266.
8. *W. Smith's Bible Dic.*, p. 627.
9. Flavius, *Antiquities*, Book I, Ch. xii: 2, 4, p. 41.

۱۰۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ اس 'Antiquities' کا مصنف فلیویس جوزیفس (قریباً ۳۷ تا قریباً ۱۰۰ء) آغاز اسلام سے پانچ صدی سے بھی زیادہ قبل وفات پا چکا تھا۔ ایف ایل کراس 'اوکسفرڈ ڈکشنری آف دی کرسچن چرچ' میں لکھتا ہے:

He brought out c. 94 his second great work, the 'Antiquities of the Jews', the 20 books of which trace the history of the Jews from the creation of the world to the beginning of the Jewish war. (*Oxf. Dic. of the Christian Church'* (London: Oxf. Univ. Press, 1974, p. 759).

اس نے قریباً ۹۴ء میں اپنی عظیم کتاب 'Antiquities of the Jews' شائع کی۔ اس کی بیس کتابیں آغاز آفرینش سے جنگ یہود تک یہودیوں کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔

یہ جو اُس نے لکھا ہے کہ 'جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، وہ تیرھویں سال کے بعد ختنہ کرتے ہیں' اگر یہ بات واقعہ کے اعتبار سے درست ہو تو اس کا مطلب ہے کہ ختنہ کی یہ رسم زمانۂ قبلِ اسلام کے عربوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مسلمانوں کا معاملہ یہ نہیں۔ وہ تو اپنے بچوں کا ختنہ اُن کے ابتدائی دنوں میں خاص طور پر ساتویں دن کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نواسوں حسن اور حسین کے ختنے اُن کی پیدائش کے ساتویں دن کیے تھے۔ (مستدرک حاکم والبیہقی بروایت حضرت عائشہ)

۱۱۔ نبایوت حضرت اسماعیل علیہ السلام کا پہلوٹا بیٹا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ پیٹرا کے نباتیوں کا جدِ اعلیٰ ہو۔ اسی کی وجہ سے بطلیموس جیسے قدیم جغرافیہ نویس شمالی عرب کو عربیا پیٹریا کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

۱۲۔ قیدار عرب کے عظیم قبیلے قریش کا جدِ امجد تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ (ملاحظہ کیجیے 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' ۷: ۴۶۳، لفظ 'قیدار')

۱۳۔ 'عبدیل' کے معنی ہیں 'اللہ کا بندہ'، جسے عربی میں 'عبداللہ' کہتے ہیں، لیکن بائبل نے اسے 'عدبئیل' کا نام دیا ہے (کنگ جیمز ورشن، کتاب پیدائش ۲۵: ۱۳)۔ ہوسکتا ہے کہ کاتب کی غلطی کی وجہ سے ایسا ہوگیا ہو۔

۱۴۔ بائبل میں اسے 'دُوماہ' لکھا گیا ہے (کنگ جیمز ورشن، کتاب پیدائش ۲۵: ۱۴)۔ اسی کی وجہ سے عرب کا ایک مشہور شہر 'دومۃ الجندل' کے نام سے منسوب ہے۔ تبوک کی مہم کے دوران رسول اللہ ﷺ نے اس کا محاصرہ کیا تھا۔

۱۵۔ بائبل میں اسے 'مشماع' کا نام دیا گیا ہے (کتاب پیدائش ۲۵: ۱۴)۔

۱۶۔ بائبل میں اسے 'مساع' کا نام دیا گیا ہے (کتاب پیدائش ۲۵: ۱۴)۔

۱۷۔ بائبل میں اسے 'حدر' کا نام دیا گیا ہے (کتاب پیدائش ۲۵: ۱۵)۔

۱۸۔ بائبل میں اسے 'تیما' کا نام دیا گیا ہے (کتاب پیدائش ۲۵: ۱۵)۔

۱۹۔ بائبل میں اسے 'نفیش' کا نام دیا گیا ہے (کتاب پیدائش ۲۵: ۱۵)۔

۲۰۔ بائبل میں اسے 'قیدماہ' کا نام دیا گیا ہے (کتاب پیدائش ۲۵: ۱۵)۔

21. *The Apocrypha and Pseudepigrapha of the OT*, Vol. II *Pseudepigrapha*, Ed. Dr. R. H. Charles (Oxford: at the Clarendon Press, 1968), p. 43.

22. *International Bible Com.*, Ed. William R. Farmer (Bangalore: TPI, 2004), 431.

23. Footnote 'b' on Gen 25:18 *New Jerusalem Bible*, p.47

24. McKenzie, *Dic. of Bible*, 1984, s.v. 'Ishmael', p.403.

باب دہم

کتاب یسعیاہ میں
مکہ کے مقام پر قربانیاں پیش کرنے کا ذکر

بائبل کی کتاب یسعیاہ[1] کے باب ساٹھ میں بیان کردہ پیشین گوئی آگے درج کی جارہی ہے۔ ایک شہرہ آفاق مسلم صاحبِ علم قاضی سلیمان منصور پوریؒ نے اسے اس مقصد کے لیے اپنی کتاب میں نقل فرمایا ہے اور وہاں چند سطروں میں اس کی وضاحت کی ہے۔[2] ان کی نقل کردہ پیشین گوئی کا تفصیلی مطالعہ مفید، برمحل اور ضروری ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی حواشی، جو وافر حوالوں اور متعلقہ اقتباسات پر مشتمل ہیں، موقع ہی پر درج کر دیے گئے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی ہے کہ کوئی ناکافی شہادت کا الزام نہ لگا سکے۔ متن کے ساتھ ساتھ ان حواشی کا بھی احتیاط سے مطالعہ ضروری ہے تاکہ عبارت کے آخر میں جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، ان کی اہمیت واضح ہو سکے۔ بعض حالات میں یہ موضوع سے براہِ راست متعلق محسوس نہیں ہوتے، لیکن تصور واضح کرنے کے لیے ان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اس پورے باب کے مکمل مطالعے کے بعد یہ آیات مع اپنے حواشی کے ایک دفعہ پھر پڑھ لی جائیں۔ اس طرح اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ ان آیات سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، وہ مکمل طور پر برمحل اور مناسب ہیں:

اُٹھ[3]، منور ہو، کیونکہ تیرا نور آ گیا[4]، اور خداوند کا جلال تجھ پر ظاہر ہوا، کیونکہ دیکھ تاریکی زمین پر چھا جائے گی، اور تیرگی امتوں پر، لیکن خداوند تجھ پر طالع ہوگا، اور اس کا جلال تجھ پر نمایاں ہوگا۔ اور

قومیں[5] تیری روشنی کی طرف آئیں گی[6]، اور سلاطین[7] تیرے طلوع کی تجلی[8] میں چلیں گے۔ اپنی آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھ۔ وہ سب کے سب اکٹھے ہوتے ہیں اور تیرے پاس آتے ہیں[9]۔ تیرے بیٹے دور سے آئیں گے، اور تیری بیٹیوں کو گود میں اٹھا کر لائیں گے[10]۔ تب تو دیکھے گی اور منور ہوگی۔ ہاں تیرا دل اچھلے گا اور کشادہ ہوگا، کیونکہ سمندر کی فراوانی تیری طرف پھرے گی[11]، اور قوموں کی دولت تیرے پاس فراہم ہوگی۔ اونٹوں کی قطاریں[12] اور مدیان[13] اور عیفہ[14] کی سانڈنیاں آکر تیرے گرد بے شمار ہوں گی۔ وہ سب سبا[15] سے آئیں گے، اور سونا اور لبان لائیں گے، اور خداوند کی حمد کا اعلان کریں گے[16]۔ قیدار [قریش جو حضرت اسماعیلؑ کے بیٹے قیدار کی نسل سے ہیں] کی سب بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نبایوت[17] کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے[18]۔ وہ میرے مذبح[19] پر مقبول ہوں گے[20] اور میں اپنی شوکت کے گھر کو جلال بخشوں گا[21]۔ یہ کون ہیں جو بادل کی طرح اڑے چلے آتے ہیں[22]، اور جیسے کبوتر اپنی کابک کی طرف؟ یقیناً جزیرے میری راہ دیکھیں گے، اور ترسیس[23] کے جہاز پہلے آئیں گے کہ تیرے بیٹوں کو ان کی چاندی اور ان کے سونے سمیت دور سے خداوند تیرے خدا اور اسرائیل کے قدوس کے نام کے لیے لائیں۔ (...)۔ اور تیرے پھاٹک ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ وہ دن رات کبھی بند نہ ہوں گے[24] تاکہ قوموں کی دولت اور ان کے بادشاہوں کو تیرے پاس لائیں، کیونکہ وہ قوم اور وہ مملکت جو تیری خدمت گزاری نہ کرے گی، برباد ہو جائے گی۔ ہاں وہ قومیں بالکل ہلاک کی جائیں گی[25] (...)۔ اور تیرے غارت گروں کے بیٹے تیرے سامنے جھکتے ہوئے آئیں گے، اور تیری تحقیر کرنے والے سب تیرے قدموں پر گریں گے، اور وہ تیرا نام خداوند کا شہر[26]، صیہون، اور اسرائیل کا قدوس[27] رکھیں گے۔ اس لیے کہ تو ترک کی گئی[28] اور تجھ سے نفرت ہوئی، ایسا کہ کسی آدمی نے تیری طرف گزر بھی نہ کیا۔ میں تجھے ابدی فضیلت اور پشت در پشت[29] کی شادمانی کا باعث بناؤں گا۔ (...)۔ پھر کبھی تیرے ملک میں ظلم کا ذکر نہ ہوگا، اور نہ تیری حدود کے اندر خرابی یا بربادی کا، بلکہ تو اپنی دیواروں کا نام نجات اور اپنے پھاٹکوں کا حمد رکھے گی۔ (...)۔ تیرا سورج پھر کبھی نہ ڈھلے گا[30] اور تیرے چاند کو زوال نہ ہوگا، کیونکہ خداوند تیرا ابدی نور ہوگا، اور تیرے ماتم کے دن ختم ہو جائیں

گے۔ اور تیرے لوگ سب کے سب راستباز ہوں گے۔ وہ ابد تک ملک کے وارث ہوں گے، یعنی میری لگائی ہوئی شاخ[31] اور میری دستکاری ٹھہریں گے، تا کہ میرا جلال ظاہر ہو۔[32]

ذیل میں چند ملاحظات درج ہیں جن سے قاری کو مندرجہ بالا آیات کے صحیح مقام اور ان کے مضمرات کے ادراک میں مدد ملے گی:

ا۔ مندرجہ بالا عبارت میں بائبل کے مؤلفین کی طرف سے بڑی آزادی کے ساتھ تبدیلیاں کی گئی ہیں، جیسا کہ 'نیو جیروسلم بائبل' کی آیت ۱۲، ۱۴ پر دیے گئے ملاحظات سے ظاہر ہے جو اوپر متعلقہ ذیلی حاشیہ میں نقل کیے گئے ہیں۔ اس لیے ہر ہر آیت کو اس کی اپنی حیثیت کے مطابق قبول یا رد کیا جانا چاہیے۔

۲۔ بائبل کے اکثر مفسرین ان آیات کا تعلق ہیکل سلیمانی کی تعمیر ثانی سے متعلق قرار دیتے ہیں جسے عام طور پر دوسرا ہیکل یا ذرُبابل کا ہیکل[33] کہتے ہیں۔ (ہیکل سلیمانی کی تاریخ کا مختصر حال کتاب کے آخر پر درج شدہ ضمیمہ ۳ میں بیان کیا گیا ہے)۔

۳۔ بائبل کے اکثر علما کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا عبارت کے مطابق یہ دوسرا 'ہیکل' پہلے ہیکل سے زیادہ شان دار ہونا چاہیے تھا۔[34] 'دی نیو اوکسفرڈ اینوٹیٹڈ بائبل' کا خیال ہے:

The new Jerusalem will surpass Solomon's city in beauty and tranquillity.[35]

نیا یروشلم خوبصورتی اور امن و سکون میں سلیمان کے شہر سے بڑھ کر ہوگا۔

حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ جے۔ ایل میکنزی اپنی لغت بائبل میں کہتا ہے:

It [The Second Temple] was no doubt of the same dimensions and structure as the temple of Solomon but much inferior in the richness of its decorations (Ezr 3:12; Hg 2:3).[36]

یہ [دوسرا ہیکل] اپنی پیمائشوں اور ڈھانچے کے اعتبار سے بلاشبہ ہیکل سلیمانی جیسا ہی تھا، لیکن زیبائش و آرائش کی شان و شوکت کے لحاظ سے اس کی نسبت بہت گھٹیا تھا (کتاب عزرا ۳:۱۲؛ کتاب حجی ۲:۳)۔

ڈبلیو سمتھ اپنی لغت بائبل میں لکھتا ہے:

From these dimensions we gather that if the priests and Levites and elders of families were disconsolate at seeing how much more sumptuous the old temple was than the one which on account of their poverty they had hardly been able to erect, Ezra 3:12, it certainly was not because it was smaller; but it may have been that the carving and the gold and the other ornaments of Solomon's temple far surpassed this, and the pillars of the portico and the veils may all have been far more splendid; so also probably were the vessels; and all this is what a Jew would mourn over far more than mere architectural splendor.[37]

ان پیمائشوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کاہن اور لاوی اور خاندانوں کے بزرگ یہ دیکھ کر غیر مطمئن تھے کہ پرانا ہیکل نئے ہیکل کی نسبت جو اُن کی غربت کی وجہ سے بڑی مشکل سے تعمیر ہو سکا تھا (عزرا ۳:۱۲)، کتنا عظیم الشان اور قیمتی تھا تو اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ یہ سائز میں چھوٹا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ ہیکل سلیمانی کے نقش و نگار اور سونا اور دوسرے زیورات اس سے کہیں زیادہ شان و شوکت والے تھے اور غلام گردش کے ستون اور پردے کہیں زیادہ شان دار تھے۔ برتن بھی غالباً ایسے ہی تھے۔ اور یہی وہ سب کچھ ہے جس پر ایک یہودی، محض تعمیراتی شان کی نسبت، کہیں زیادہ ماتم اور افسوس کر سکتا ہے۔

آر جے میک کلوی کہتا ہے: 'لیکن بنیادیں بھی یہ ظاہر کرتی تھیں کہ یہ [دوسرا ہیکل] ہیکل سلیمانی سے گھٹیا ہوگا۔'[38] 'دی سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ بائبل ڈکشنری'[39] میں ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کے مقابلے میں تعمیر کے لحاظ سے گھٹیا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر جارج اے بارٹن بیان کرتا ہے:

The dimensions of the building were probably the same as those of Solomon's Temple, though the edifice was apparently at first lacking in ornament. It was probably because the building was less ornate that the old men who had seen the former Temple wept at the sight of its successor.[40]

اس عمارت کی پیمائشیں غالباً ویسی ہی تھیں، جیسی ہیکل سلیمانی کی۔ عمارت پہلی نظر میں آرائش و زیبائش سے محروم دکھائی دیتی تھی۔ وہ بڑے بوڑھے آدمی، جنھوں نے 'پہلے ہیکل' کو دیکھا تھا، اس کے 'جانشین ہیکل' کو دیکھ کر روتے تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ عمارت اتنی آراستہ و پیراستہ نہ تھی۔

۴۔ اگر کوئی شخص ان آیات کا مفہوم و مدعا متعین کرنے کے لیے مخلصانہ اور معروضی (غیر جانب دارانہ) تنقیدی مطالعہ کرے تو وہ صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ آیات صاف اور واضح طور پر صرف ان قربانیوں سے متعلق نظر آتی ہیں جو قدیم زمانے سے مکے میں کعبے کے زائرین (حجاج) سرانجام دیتے آئے ہیں۔ یہ آیات کسی طرح بھی دوسرے یا زروبابل کے ہیکل سے متعلق قرار نہیں دی جاسکتیں۔ درج ذیل نکات کی مدد سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی: ایک تو یہ کہ ہیکل ثانی ہیکل سلیمانی سے زیادہ شان دار نہ تھا (خواہ اس شان وشوکت سے روحانی شوکت ہی کیوں نہ مراد لی جائے)، جیسا کہ بعض علما مراد لیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ غیر یہودی اقوام اور بادشاہ دوسرے ہیکل کی روشنی اور طلوع کی چمک دمک کے پاس کبھی نہیں آئے (آیت ۳)۔ صرف یہودیوں کی ایک مختصر سی تعداد ہی تھی جو اس کی زیارت کرتی تھی۔ اور وہ بھی اس وقت جب انھیں جلاوطنی سے واپسی کی اجازت مل گئی تھی۔ یہ زمانہ ۵۱۵ ق م سے ۷۰ء ہی تک کا ہے۔ اس کے بعد یہودیوں کا یہ دوسرا ہیکل بھی تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ اور پچھلی تقریباً بیس صدیوں سے اس کا صفحۂ ہستی پر کوئی وجود نہیں۔ اس ۵۱۵ ق م سے ۷۰ء کے زمانے کے دوران میں بھی متعدد مرتبہ اس ہیکل اور یہودیوں کو شدید مصائب سے گزرنا پڑا (ملاحظہ ہو ضمیمہ ۳ 'ہیکل سلیمانی کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ')۔

تیسری بات یہ کہ نہ تو کبھی سمندر کے کثیر اموال یا کثیر سمندری لوگ یہودی قوم کی طرف منتقل ہوئے اور نہ کبھی غیر یہودی اقوام کی افواج نے یہودی عقائد کی صداقت یا ان کے دوسرے ہیکل کی عظمت قبول کی (آیت ۵)۔

چوتھی بات یہ کہ ایسی کوئی روایت موجود نہیں کہ عرب کے زائرین وحجاج (مدیان، عیفاہ اور شیبا کے لوگ جو قطورہ کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسلیں ہیں) کے اونٹوں کے جھنڈ کبھی خداوند کی حمد کے ترانے گاتے ہوئے اس دوسرے ہیکل کی زیارت کے لیے آیا کرتے ہوں (آیت ۶)۔[۱۲]

پانچویں بات یہ کہ ایسی کوئی روایت موجود نہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹوں قیدار اور نبایوت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسلیں (عرب قومیں) کبھی دوسرے ہیکل کے گرد جمع ہوئی ہوں، یا انھوں نے اس دوسرے ہیکل پر کبھی ریوڑوں اور دنبوں کی قربانیاں پیش کی ہوں، جو خداوند کے چبوترے پر قربانی کی حیثیت سے قبول کر لی گئی ہوں (آیت ۷)۔

چھٹی بات یہ کہ یہ بات کسی طرح دوسرے ہیکل پر لاگو نہیں ہوتی کہ 'تیرے دروازے لگاتار کھلے رہیں گے، وہ دن یا رات میں کسی وقت بند نہ ہوں گے، لوگ غیر یہودی اقوام کی افواج تجھ پر لائیں گے، اور یہ کہ ان کے بادشاہ لائے جائیں گے' (آیت ۱۱)۔ دروازوں کا تو ذکر ہی کیا، وہاں تو پچھلے دو ہزار سال سے سرے سے ہیکل کی کوئی عمارت ہی صفحۂ ہستی پر موجود نہیں۔

ساتویں بات یہ کہ اقوام کی تاریخ میں کسی وقت بھی ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا کہ اہل بابل کے وہ بیٹے، جنھوں نے یہودیوں کو عذاب میں مبتلا کیا تھا، یہود کے پاس سرنگوں ہو کر آئے ہوں۔ اور وہ سب لوگ، جنھوں نے ان یہود سے نفرت کا اظہار کیا تھا، اپنے آپ کو ان یہود کے پاؤں کے تلووں کے نیچے جھکایا ہو، جیسا کہ آیت ۱۴ میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ جہاں تک کعبے کا تعلق ہے تو جو یمنی افواج اپنی کعبے کو نقصان پہنچانے کی بدنیتی کی وجہ سے پوری طرح تباہ و برباد کر دی گئی تھیں، اُن کی نسلیں باقاعدگی سے پورے جوشِ عقیدت کے ساتھ اس (کعبے) کی زیارت کے لیے حاضر ہوتی چلی آ رہی ہیں۔

آٹھویں بات یہ کہ دوسرے ہیکل یا یہودیوں کے بارے میں یہ بات کسی طرح بھی نہیں کہی جا سکتی: 'میں تجھے ابدی افتخار کی چیز[۲۲] اور تمام نسلوں کی مسرت بناؤں گا'[۲۳] (آیت ۱۵)۔

نویں بات یہ کہ دوسرے ہیکل کے بارے میں یہ بات بھی درست نہیں کہ 'تیری سرزمین میں آیندہ کبھی تشدد کے بارے میں کوئی بات نہ سنی جائے گی۔ تیری سرحدوں میں نہ تباہی ہو گی نہ بربادی، بلکہ تو اپنی دیواروں کو نجات کہے گا اور اپنے دروازوں کو حمد' (آیت ۱۸)۔

دسویں بات یہ کہ دوسرے ہیکل یا اسرائیلیوں کے بارے میں یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا

کہ 'تیرا سورج کبھی نہیں ڈھلے گا، نہ تیرا چاند کبھی غائب ہوگا، کیونکہ خداوند تیری ابدی روشنی ہوگا اور تیرے ماتم کے دن ختم ہو جائیں گے۔' (آیت ۲۰)، کیونکہ دوسرے ہیکل اور اسرائیلیوں نے اتنی زیادہ بدبختیاں اور نشیب وفراز دیکھے ہیں جو اس دعوے کو صریحاً جھٹلا رہے ہیں کہ 'خداوند تیری ابدی روشنی ہوگا۔'

گیارھویں بات یہ کہ اسرائیلیوں کا کردار اور ان کی حیثیت اس دعوے کے سراسر خلاف ہے جو آیت ۲۱ میں کیا گیا ہے، یعنی 'تیرے لوگ بھی تمام کے تمام نیکوکار ہوں گے وہ اس سرزمین کے ہمیشہ کے لیے وارث ہوں گے۔' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نیکوکار ہونے کے بجائے وہ بدکار، سودخور اور سرمایہ پرست بن کر رہ گئے۔ اور 'اس سرزمین کے ہمیشہ کے وارث' ہونے کے بجائے، اس سے دھتکارے جاکر دردر کی ٹھوکریں کھانا ان کا مقدر بنا رہا۔ اور اب جو انھیں وہاں دوبارہ تمکن نصیب ہوا ہے تو اس سرزمین میں رحم دلی، بے لاگ انسانی ہمدردی، خدا ترسی اور نیکوکاری کے بجائے اُنھوں نے جس طرح ظلم و بربریت اور لوٹ کا بازار گرم کیا ہے، اُسے کسی طرح بھی نیکوکاری نہیں کہا جا سکتا۔

مندرجہ بالا تنقیدی و تحلیلی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے تمام معانی کی لطافتوں اور مضمرات سمیت کتاب یسعیاہ کے باب ساٹھ کے الفاظ کا دوسرے ہیکل یا اسرائیلیوں سے کوئی تعلق نہیں۔

۵۔ کتاب یسعیاہ کے باب ساٹھ کا دوسرے ہیکل یا یہودیوں پر اطلاق مکمل طور پر مسترد ثابت ہو چکا ہے۔ البتہ اس کی آیات کا متعین مفہوم دریافت کرنے کی کوشش کی جانی باقی ہے۔ اگر کوئی شخص ان آیات کا مفہوم اور مضمرات متعین کرنے کی مخلصانہ اور غیر جانب دارانہ کوشش کرے تو وہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچے گا، اور وہ یہ کہ یہ آیات صاف اور واضح طور پر صرف ان قربانیوں سے تعلق رکھتی ہیں جو زمانہ قدیم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی یادگار کے طور پر حاجی لوگ مکے میں خانہ کعبہ کے قریب پیش کرتے تھے۔ ذیل

میں چند ملاحظات درج ہیں جو ان آیات کے تحلیلی مطالعے پر مبنی ہیں۔ اس سے ان آیات کی اہمیت، مقصد اور اصل حیثیت کا اِدراک کرنے میں مدد حاصل ہوگی:

(۱) آیت ۳ میں کہا گیا ہے: 'اور غیر یہودی قومیں [N.I.V اور اکثر دوسرے تراجم کے مطابق 'اقوام'] تیری روشنی کی طرف آئیں گی اور بادشاہ[۴۴] تیرے عروج وطلوع کی روشنی کی طرف'۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جب تک یہ ہیکل یہودیوں کے قبضے میں رہا، غیر یہودی اقوام کو اصل اور مرکزی ہیکل میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی غیر یہودی اس حرم میں داخل ہونے کی جسارت کرتا تو اسے سزائے موت دے دی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیکل کے ساتھ غیر قوموں کے لیے بھی ایک صحن موجود تھا، لیکن یہ حرم کے اندر نہیں، بلکہ اس سے باہر واقع تھا۔ 'غیر یہودیوں والے صحن میں ہر شخص کو آنے کی اجازت تھی۔ یہ ہیکل دوسرے دالانوں سے ایک جنگلے کے ذریعے سے جدا کیا گیا تھا، اور اس پر یہ تختی لکھ کر لگائی ہوئی تھی کہ غیر یہودیوں کا اندرونی صحنوں میں داخلہ منع ہے، اور اس کی سزا موت ہے[۴۵]'۔ جب یہودی ہیکل سے ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیے گئے تو اس کی عمارت بھی تباہ و برباد کر دی گئی اور زمین نامی اس سیارے پر پچھلی بیس صدیوں سے ایسے کسی ہیکل کا وجود نہیں۔ اگر اسرائیل کی حکومت اس ہیکل کو دوبارہ تعمیر کر لیتی ہے، جس کے لیے یہ سرتوڑ کوششیں کر رہی ہے اور جس کا امکان بھی موجود ہے کہ یہ یہودی اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو جائیں گے، تو اس کے بعد پھر یہ حرم غیر یہودی النسل لوگوں کے لیے ممنوع قرار پائے گا۔ صرف مکہ کا حرم ہی وہ حرم ہے جہاں قدیم زمانے سے ساری دنیا کی تمام قوموں کے مسلمان باقاعدگی سے حج وعمرہ کے لیے آ رہے ہیں۔

(۲) آیت ۴ کے ان الفاظ کا اطلاق کبھی دوسرے ہیکل پر نہیں کیا جا سکتا کہ 'اپنی آنکھیں اِدھر اُدھر اٹھاؤ اور دیکھو وہ سب اپنے آپ کو وہاں جمع کر رہے ہیں۔ وہ تیرے پاس آتے ہیں۔ تیرے فرزند دور سے آئیں گے اور تیری بیٹیاں تیرے پہلو میں پرورش پائیں گی۔ [GNB] نے اس کا ترجمہ بہتر انداز میں اس طرح کیا ہے: 'تیری بیٹیاں اس طرح اٹھا کر لائی جائیں گی جس

طرح بچے اٹھا کر لائے جاتے ہیں']، لیکن جہاں تک کعبے کا تعلق ہے، یہ الفاظ اپنے ہر مفہوم کے اعتبار سے اس پر کلیۃً منطبق ہوتے ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ قرآن کریم نے حج اور وہاں پیش کی جانے والی قربانیوں کا منظر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ. وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ. لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ. ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ. ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ. حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ. ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ.[۳۶]

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے اس گھر، یعنی خانہ کعبہ کی [اس ہدایت کے ساتھ] جگہ تجویز کی تھی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا، اور [تمھیں حکم دیا تھا کہ] میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو، اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو کہ وہ تمھارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں، تا کہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لیے رکھے گئے ہیں، اور چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے انھیں عطا کیے ہیں۔ [اور انھیں ہدایت کر دو کہ] اس میں سے خود بھی کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو بھی دو۔ پھر [انھیں چاہیے کہ] وہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں، اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔ یہ (تو تھا کعبے کی تعمیر کا مقصد)۔ اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اُس کے رب کے نزدیک خود اُسی کے لیے بہتر ہے۔ اور

تمھارے لیے مویشی جانور حلال کیے گئے، سوائے اُن چیزوں کے جو تمھیں بتائی جا چکی ہیں۔ پس بتوں کی گندگی سے بچو، جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو، یک سو ہو کر اللہ کے بندے بنو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو پرندے اسے اچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کو پیس کر رکھ دیا جائے گا۔ یہ (ہے اصل معاملہ۔ اسے سمجھ لو)، اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ بات دلوں کے تقویٰ کا مظہر ہے۔

(۳) دوسرے ہیکل کے بارے میں یہ بات کسی طرح بھی نہیں کہی جا سکتی، جیسا کہ آیت ۵ کا دعویٰ ہے کہ 'سمندروں [کے مال و اسباب] کی کثرت تیری طرف منتقل کی جائے گی۔ غیر یہودی اقوام کی افواج تیرے پاس آئیں گی'، یہ بات صرف مکہ معظمہ کے کعبے ہی پر صادق آتی ہے کہ اگرچہ یہ ایک بنجر سرزمین میں واقع ہے، پھر بھی یہاں دنیا بھر کے ہر قسم کے مال و اسباب فراوانی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ پھر یہ مکہ ہی ہے جہاں پوری دنیا سے غیر یہودی النسل مسلمان اہلِ ایمان (مرد اور عورت) اپنے تمام متاع و اسباب کے ساتھ بحری، بری اور ہوائی راستوں سے اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ جو آٹھویں آیت میں فرمایا گیا ہے 'یہ کون ہیں جو بادل کی طرح اڑے چلے آتے ہیں اور جیسے کبوتر اپنی کابک کی طرف'، تو لاکھوں حاجیوں کے ساتھ جوق در جوق ہوائی جہازوں کا اترنا اس کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ اور یہ منظر دنیا کے اور کسی بھی معبد کے لیے آنے والی پروازیں پیش نہیں کرتیں۔

(۴) دوسرے ہیکل کے متعلق یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے، جیسا کہ آیت ۶ میں کیا گیا ہے، کہ 'اونٹوں کے ہجوم تمھاری سرزمین کو ڈھانپ لیں گے، مدیان اور عیفاہ کے نوجوان اونٹ، وہ سب شیبا سے آئیں گے، وہ سونا اور خوشبوئیں لائیں گے، اور وہ خداوند کی حمدوں کے ترانے بلند آواز میں بیان کریں گے'۔ دنیا کی تاریخ کے کسی مرحلے میں ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا کہ عرب اقوام کے اتنے بڑے ہجوم کبھی اونٹوں کے قافلوں کی صورت میں یروشلم کے حرم کی طرف گئے ہوں۔ جہاں

تک حرمِ مکہ اور وہاں پیش کی جانے والی قربانیوں کا تعلق ہے، آیت کے یہ الفاظ اُس پر حرف بہ حرف صادق آتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ التفات ہے کہ حُجاج کرام تلبیہ کے الفاظ بلند آواز سے ادا کرتے ہیں (جن کا ایک حصہ یہ ہے: 'اے اللہ، سب تعریف تیرے ہی لیے ہے')، جیسا کہ بائبل میں درج ہے: 'وہ خداوند کی حمد کا اعلان یا اظہار کریں گے۔ [بلند آواز سے اور کھلم کھلا اعلان کریں گے]'۔

(۵) روئے زمین پر کوئی شخص 'دوسرے ہیکل' کے متعلق ساتویں آیت کے اس دعوے کی تائید نہیں کر سکتا کہ 'قیدار کے تمام ریوڑ تیرے پاس جمع کیے جائیں گے۔ نبایوت کے دنبے تیری خدمت میں پیش ہوں گے۔ وہ میری قربان گاہ پر آئیں گے اور شرفِ قبولیت پائیں گے اور میں اپنی عظمت کے گھر کو شان و شوکت دوں گا'۔ قیدار اور نبایوت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فرزند ہیں اور ان کی نسل ہزاروں سال سے سرزمین عرب میں آباد ہے۔ ان میں یروشلم کی زیارت کرنے اور وہاں قربانیاں پیش کرنے کی کبھی کوئی رسم و روایت نہیں رہی۔ دوسری طرف جدید دنیا کا ہر صاحبِ علم انسان جانتا ہے کہ سرزمینِ عرب کے باشندے زمانۂ قدیم سے حج و زیارت کے لیے حرمِ مکہ کی طرف آتے رہے ہیں۔ کیا یہ بات اس حقیقت کا تشفی بخش ثبوت نہیں ہے کہ کتاب یسعیاہ کے باب ساٹھ کی مندرجہ بالا آیات واضح طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کی طرف سے حرمِ مکہ پر قربانیاں پیش کرنے سے متعلق ہے۔ مزید براں یہ بات بھی قابلِ التفات ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے گھر کو کیوں کر عظمت بخشے گا جو صفحۂ ہستی پر سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا۔ یہ صرف مکہ کے مقام پر اللہ تعالیٰ کی عظمت والا گھر ہی ہے جو زمانۂ قدیم سے حفظ و امان کے ساتھ قائم و دائم ہے، جسے ہر مفہوم کے اعتبار سے شان و شوکت دی جا سکتی ہے، اور فی الواقع دی بھی گئی ہے۔ P.H. Kelley نے اس آیت کی اس طرح تشریح کی ہے کہ 'سرزمینِ عرب کے قبائل بھی دنبوں اور ریوڑوں کی قربانیاں اور نذریں پیش کرتے ہیں[۴۸]'۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سرزمین عرب کے قبائل کبھی یروشلم کی طرف اپنی قربانیاں پیش کرنے کے لیے نہیں جاتے تھے۔ ان کے درمیان

جو روایت چلی آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ مکے کی طرف قربانیاں لے کر جاتے ہیں، جو اُن کے حج کی ایک اہم رسمِ عبادت ہے۔

(۶) آیت ۹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ 'یقیناً جزائر میرے منتظر ہوں گے یا میری خدمت میں حاضر ہوں گے اور طرشیش کے بحری جہاز پہلے تیرے فرزندوں کو دور دراز سے لے کر آئیں گے۔' طرشیش سپین کے جنوبی ساحل پر واقع تھا، جیسا کہ متعلقہ حاشیے میں وضاحت کی گئی ہے۔ جب تک یروشلم کا ہیکل قائم تھا، اس وقت تک کسی ہسپانوی کے اس پر قربانی پیش کرنے کے لیے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، جبکہ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری ہی میں سپین پر عربوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور وہاں ان کی بستیاں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ اہلِ عرب جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے پیدا ہونے کے ناتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ہیں، باقاعدگی سے حرم مکہ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے تاکہ عمرہ (چھوٹا حج، جو سارا سال ہوتا رہتا ہے) اور حج ادا کریں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی یاد منائیں۔

(۷) جہاں تک آیت ۱۱ کا تعلق ہے کہ 'تیرے دروازے لگاتار کھلے رہیں گے وہ دن یا رات میں کسی وقت بند نہ ہوا کریں گے' تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اس کتاب کے مصنف کو بذاتِ خود حرمِ مکہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے اور اس نے بذاتِ خود یہ بات دیکھی ہے کہ مکہ میں حرمِ کعبہ کے دروازے دن رات کے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں اور یہ صدیوں کی روایت ہے۔ جہاں تک 'دوسرے ہیکل' کا تعلق ہے تو جب اس طرح کی کوئی عمارت سرے سے موجود ہی نہیں تو اس کے دروازے کہاں سے آئیں گے۔ اس طرح ان کے دن رات کھلے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۸) آیت ۱۴ میں دعویٰ کیا گیا ہے: 'جن لوگوں نے تجھ پر ستم ڈھائے ہیں، ان کے بیٹے بھی سر جھکائے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ اور وہ تمام بھی، جنھوں نے تجھ سے نفرت کا اظہار کیا،

تیرے پاؤں کے تلووں کے نیچے اپنے آپ کو جھکائیں گے۔ اور وہ تجھے خداوند کا شہر اور اسرائیل کے مقدس کا صیہون کہیں گے۔' یہ بات حرم مکہ پر حرف بہ حرف پوری اترتی ہے۔ جنوری ۶۳۰ء میں پیغمبر اسلام کے ہاتھوں فتح مکہ کے موقع پر اس کا عملی مظاہرہ سامنے آیا۔ جہاں تک اس ترکیب کا تعلق ہے کہ 'اسرائیل کے مقدس کا صیہون' تو سیاق و سباق کے لحاظ سے یہ بات کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ یہ صریحاً یا تو بعد کے کسی مؤلف کا اضافہ ہے یا پھر کسی مفسر کی تشریح ہے۔ 'خداوند کا شہر'، 'بیت اللہ' کا بعینہٖ ترجمہ ہے، جو عربی زبان میں خانہ کعبہ کا نام ہے۔

(۹) آیت ۱۵ کا ابتدائی حصہ 'جبکہ تجھے چھوڑا گیا ہے اور نفرت کی گئی ہے' صریحاً حضرت ہاجرہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اوپر متعلقہ حاشیے میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ 'یہ صورت ایک، فراق میں تنہا چھوڑی ہوئی، بیوی کی ہے' (بحوالہ 'ڈملو کی تفسیر' اور 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل')۔ جہاں تک آیت کے آخری جملے کا تعلق ہے، یعنی 'میں تجھے ایک ابدی عظمت بناؤں گا اور بہت سی [اصل میں 'بہت سی' کی جگہ لفظ 'تمام' ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ N.I.V وغیرہ نے اس کا ترجمہ کرتے وقت لکھا ہے] 'نسلوں کی مسرت'، تو 'ابدی عظمت' اور 'تمام نسلوں کی مسرت' کے الفاظ کا اطلاق یروشلم کے ہیکل پر کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف حرم مکہ ہی ہے، جس پر ان الفاظ کا ہر لحاظ سے اطلاق ہوتا ہے۔

(۱۰) آیت ۱۸ میں ہے: 'تیری سرزمین میں آئندہ کبھی تشدد نہ سنا جائے گا، نہ تیری سرحدوں کے اندر تباہی و بربادی [ہوگی]، لیکن تو اپنی دیواروں کو نجات اور اپنے دروازوں کو حمد کہے گا۔' یروشلم اور اس کے ہیکل کے 'تشدد، تباہی اور بربادی' سے محفوظ ہونے کا تو ذکر ہی کیا، یہ تو پچھلے دو ہزار سال سے صفحۂ ارضی پر موجود ہی نہیں ہے۔ اس آیت کے الفاظ کا اطلاق یروشلم کے ہیکل پر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ یروشلم کے ہیکل کی تاریخ کا ایک خاکہ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمے میں دیا گیا ہے، وہاں یہ بات ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف حرم مکہ پر اس کا حرف بہ حرف اطلاق ہوتا ہے۔

(۱۱) آیت ۲۱ میں ہے: 'تیرے لوگ بھی تمام نیک ہوں گے، وہ اس سرزمین کے ہمیشہ کے لیے وارث ہوں گے'۔ یہودیوں کے متعلق یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے کہ وہ سرزمینِ یروشلم کے ہمیشہ کے لیے وارث رہے ہیں؟ دوسری طرف ہر صاحبِ علم شخص جانتا ہے کہ اہلِ عرب حرمِ مکہ پر زمانۂ قدیم سے قابض چلے آ رہے ہیں۔ جہاں تک آیت کے آخری الفاظ 'میری شان اور عظمت بیان کی جائے' کا تعلق ہے تو جس کسی نے بھی حرمِ کعبہ کا حج یا عمرہ کیا ہو، وہ اس بیان کی تصدیق کرے گا۔

حواشی باب دہم

۱۔ ڈاکٹر ڈبلیو فچ، منسٹر، چرچ آف سکاٹ لینڈ، گلاسگو، 'نیو بائبل کمنٹری' میں کتاب یسعیاہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے صفحہ ۶۰۴ پر لکھتا ہے:

This is a prophecy of great beauty, thrilling with the joy of a great assurance that the purpose of God is so triumphantly to be fulfilled in the earth.

یہ بہت حسین پیشین گوئی ہے، جو اس عظیم الشان یقین دہانی کی مسرت سے محظوظ کرتی ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا مقصد بڑی کامیابی کے ساتھ پورا ہونے والا ہے۔

۲۔ قاضی سلیمان منصور پوری، 'رحمۃ للعالمین'، (دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۱ء)، ۱:۱۹۶۔

۳۔ کیرل سٹوہل موئلر 'دی جیروم بائبل کمنٹری' میں (صفحہ ۳۸۲ پر) بیان کرتا ہے:

These chapters (60-62), especially ch. 60 according to Dhorme (op. cit., xlvii), are a lyrical description of the new Jerusalem.

یہ ابواب (۶۰ - ۶۲)، بالخصوص باب ۶۰، دھورمے (حوالہ بالا ۴۷) کے مطابق نئے یروشلم کا غنائی بیان ہے۔

وہ باب ۶۰ کی تشریح کو 'نئے یروشلم کی شان و شوکت' کا عنوان دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس باب ۶۰ کا تعلق 'دوسرے ہیکل' سے قرار دیا جاتا ہے۔ ہیکلِ سلیمانی کا ایک مختصر بیان کتاب کے اخیر میں ایک ضمیمے میں درج ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ یروشلم ایک بامعنی لفظ ہے، اس کے دو حصے ہیں: یرو= شہر یا جگہ، اور شلم= امن۔ اس طرح یروشلم کے معنی ہوئے: 'امن کا شہر یا مقام'۔ بائبل میں بغیر کسی وضاحت کے دو یروشلموں کا ذکر ہے۔ پہلا اور پرانا 'امن کا شہر' تو کنعان والا یروشلم ہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے وہاں موجود تھا۔ دوسرا اور نیا 'امن کا شہر' مکہ ہے، جس کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے رکھی تھی

اور جس کا قرآن کریم میں 'البلد الامین' کے نام سے ذکر ہے۔ لفظ کے ہر مفہوم کے اعتبار سے صرف مکہ ہی یروشلم 'امن کا شہر' ہے۔ اس موضوع پر مصنف کی ایک اور کتاب میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴۔ سون کینو قباش نامی یہودی تفسیر بائبل (صفحہ ۱۱۳۴) سے یہاں ایک ذیلی حاشیہ درج کیا گیا ہے:

This is addressed to Jerusalem. Light being the symbol of joy and salvation, Jerusalem is told that the light had been rekindled (K).

اس کا خطاب یروشلم سے ہے۔ کیونکہ روشنی مسرت اور نجات کی علامت سمجھی جاتی ہے، اس لیے بتایا گیا ہے کہ یروشلم میں وہ شمع دوبارہ فروزاں کی گئی ہے۔

یروشلم کی تاریخ کے لیے کتاب کے اخیر میں ضمیمہ ملاحظہ کیجیے۔

۵۔ NIV نے اس لفظ کا ترجمہ 'اقوام' (Nations) کیا ہے۔ بالعموم اس لفظ 'Gentile' کے معنی 'یہودیوں کے علاوہ دوسری تمام اقوام' ہیں۔

۶۔ دی ریورینڈ ڈاکٹر آئی ڈبلیو سلوتکی نے 'کتاب یسعیاہ پر انگریزی ترجمہ و تفسیر (مطبوعہ لندن، دی سون کینو پریس، ۱۹۴۹ء) میں صفحہ ۲۹۲ پر ایک عمدہ ذیلی حاشیہ درج کیا ہے:

The nations will learn the ways of God, religion and morality, from [you].

قومیں [تم] سے خداوند کی راہیں، مذہب اور اخلاق سیکھیں گی۔

۷۔ میتھیو ہنری کی 'عہد نامہ قدیم وجدید کی تفسیر' (۳۵۱:۵) میں وضاحت کی گئی ہے:

'kings' means: 'men of figure, power, and influence'.

'بادشاہوں' کا مطلب ہے: 'خوب صورت، طاقت ور اور اثر ورسوخ والے لوگ'۔

۸۔ ڈاکٹر ڈبلیو فچ 'محولہ بالا' 'نیو بائبل کمنٹری' (صفحہ ۲۰۴) پر لکھتا ہے:

Then will the city be the centre of the world's light, for the glory of the everlasting God will rest upon her and will radiate around the world.

اس وقت یہ شہر دنیا کی روشنی کا مرکز ہوگا، کیونکہ ازلی وابدی خداوند اس پر قائم رہے گا اور پوری دنیا کے اردگرد روشنی پھیلائے گا۔

یہاں یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ 'ہیکل دوم' کو یسعیاہ کے بعد کبھی ایسی شان وشوکت حاصل نہیں ہوئی جیسی یہاں بیان کی گئی ہے۔ یہ صرف مکہ کا خانہ کعبہ ہی ہے جس کے متعلق اس شان وشوکت اور عظمت

کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔

۹ میتھیو ہنری اپنی 'عہد نامہ قدیم وجدید کی تفسیر'، جلد پنجم، ÌAn Exposition of the O & NT (NY: Robert Carter & Bros., 530, Broadway, 1712)Ì, میں صفحہ ۳۵۰ پر رقم طراز ہے:

When the Jews were settled again in their own land after their captivity, many of the people of the land joined themselves to them; but it does not appear that there ever was any such numerous accession to them as would answer the fulness of this prophecy; and therefore we must conclude that this looks further, to the bringing of the Gentiles into the [naturally, the forthcoming words should have been 'fold of that altar or sanctuary'; but it is the dexterity and adroitness of the worthy commentator that he manipulates to interpret it in the following terms] gospel church, not their flocking to one particular place, though under that type it is here described. There is no place now that is the centre of the church's unity [thanks are due to accept this bare fact, which was, of course, unavoidable; but...]; but the promise respects their flocking to Christ, and coming by faith, and hope, and the holy love, into that society which is incorporated by the charter of his gospel, and of the unity of which he only is the centre.

جب یہودی اپنی جلاوطنی کے بعد دوبارہ اپنی سرزمین میں آباد ہوئے تو اس سرزمین کے بہت سے لوگوں نے ان میں شمولیت اختیار کرلی، لیکن ایسا ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ اتنی کثیر تعداد میں کبھی الحاق ہوا ہو جس سے یہ پیشین گوئی مکمل طور پر پوری قرار دی جاسکے، اس لیے ہمیں لازماً یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ یہ کسی مستقبل کے واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے، یعنی انجیلی کلیسیا میں 'غیر یہودی قوموں کو شامل کرنا' نہ کہ ان کا کسی خاص جگہ پر اجتماع، اگرچہ یہاں پر جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے [فطری سی بات ہے کہ 'غیر یہودی قوموں کو شامل کرنا' کا تعلق 'اس حرم یا قربانی کے چبوترے کے دائرے میں' ہونا چاہیے، لیکن یہاں لائق مفسر کی مہارت وذہانت کو داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے کیسی چابک دستی سے مفہوم کیا سے کیا بنادیا ہے: 'جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔'] اب [دنیا میں] کوئی ایسی جگہ نہیں جو کلیسا کے اتحاد کا مرکز ہو، لیکن یہ وعدہ ان کے مسیح کے پاس اکٹھا ہونے سے متعلق ہے۔ اور ایمان اور امید اور مقدس محبت کی بدولت اس سوسائٹی میں داخل ہونے سے متعلق ہے جو اس انجیل وبشارت کے ذریعے سے عمل میں آیا ہے اور اس اتحاد سے متعلق ہے، جس کا مرکز صرف وہی [مسیح] ہے۔

مسیحی علما، عہد نامہ قدیم کی سادہ سی عبارتوں کو توڑ مروڑ کر کس مہارت سے حضرت یسوع مسیح یا کلیسا پر چسپاں کردیتے ہیں، مندرجہ بالا عبارت اس کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

۱۰ 'نیو انگلش بائبل' میں ہے:

Your daughters walking beside them leading the way.

تمھاری بیٹیاں ان کے ساتھ چلتی ہیں اور راستہ دکھاتی [یا عبور کرتی] ہیں۔

میتھیو ہنری کی 'عہد نامہ قدیم و جدید کی تفسیر' (۳۵۱:۵) میں ہے:

Sons and daughters shall come in the most dutiful manner'.

بیٹے اور بیٹیاں انتہائی فرض شناسی اور خدمت گزاری کے انداز میں آئیں گی۔

یہ دونوں تراجم اس سیاق و سباق میں ایک معقول مفہوم فراہم کرتے ہیں۔ یہ مردوں اور عورتوں کے کاروانوں اور گروہوں کے اکٹھے ہو کر مکے کے اس حرم کے حج کے لیے آنے کی ایک اچھی تصویر پیش کرتے ہیں۔

۱۱ 'نیو جیروسلم بائبل' (صفحہ ۱۲۸۲) میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

since the riches of the sea will flow to you, the wealth of the nations come to you;

کیونکہ سمندر کی دولت تمھاری طرف بہ کر آئے گی، قوموں کی دولت تمھارے پاس آئے گی۔

N.I.V (صفحہ ۷۷۹) نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

the wealth on the seas will be brought to you, to you the riches of the nations will come.

سمندروں پر کی دولت تمھارے پاس لائی جائے گی۔ تمھارے پاس قوموں کی دولت آئے گی۔

'دی سنکینو قماش' (صفحہ ۱۱۳) نے یہاں ایک حاشیہ درج کیا ہے:

Whereas in the past the Land of Israel was desolate and forsaken, it will now be crowded with multitudes like a roaring sea (K).

جبکہ ماضی میں اسرائیل کی سرزمین ویران اور بے آباد تھی، اب یہ لوگوں کے ہجوم سے بھر کر ایک چنگھاڑتے ہوئے سمندر کے مانند ہو جائے گی۔

لیکن جہاں تک 'دوسرے ہیکل' کا تعلق ہے یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

۱۲ 'وکلف کی تفسیر بائبل' (صفحہ ۶۵۱) میں ہے:

It is quite remarkable that, in origin, all these offered treasures are

preponderantly Arabian.

یہ بات بڑی اہم ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے قربانی کے لیے پیش کیے جانے والے ان تمام خزانوں کی غالب اکثریت اقوامِ عرب سے متعلق ہے۔

لیکن اپنے دل کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے وہ اس کی تاویل یوں کرتا ہے:

Perhaps there is a suggestion here that Islam will some day turn to the Cross.

شاید یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام ایک نہ ایک دن عیسائیت قبول کرلے گا۔

لیکن یہ اس فاضل مصنف کی خوش فہمی اور محض خواب وخیال ہی ہے۔

۱۳۔ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' (جلد۴، صفحہ ۳۱۴) لفظ 'مدیان' کی تشریح میں لکھتی ہے:

A region in the desert of Arabia (see on Ex. 2:15).

یہ صحرائے عرب کا ایک خطہ ہے۔ (ملاحظہ کیجیے خروج ۲:۱۵)

حقیقت یہ ہے کہ مدیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان کی بیوی قطورہ [جنہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سارہ کی وفات کے بعد اپنی زوجیت میں لیا تھا] کے چھ بیٹوں میں سے ایک تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قطورہ سے اپنے ان بیٹوں (زمران، یقشان، میدان، مدیان، اشباک اور شعاع) کو عرب میں آباد کیا تھا۔

۱۴۔ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' (۴:۳۱۴) لفظ 'عیفاہ' کی مندرجہ ذیل وضاحت کرتی ہے:

A Midianite tribe (Gen. 25:4; 1 Chron. 1:33), and here the region they inhabited.

ایک مدیانی قبیلہ (پیدائش ۲۵:۴، ۱-کتاب تواریخ ۱:۳۳)۔ اور یہاں اس سے مراد وہ خطہ ہے جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ عیفاہ مدیان کے پانچ بیٹوں (عیفاہ، عیفر، حنوخ، ابیدہ اور علداہ) میں ایک سے تھا۔ مدیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان بیٹوں میں سے ایک تھا جو اُن کے ہاں قطورہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔

۱۵۔ N.J.B. (صفحہ ۱۲۸۳) کا بیان ہے:

Midian, Ephah and Sheba are peoples of Arabia.

مدیان، عیفاہ اور شیباہ سرزمین عرب کی قومیں ہیں۔

'7th Day Adventist Bible Dic.' (صفحہ ۱۰۱۵) میں وضاحت کی گئی ہے:

It is now generally held that it was a queen of this Arabian Sheba, in the area now called Yemen, who made a visit to Solomon (1Ki 10:1-13). The Sabeans were one of the most important peoples of all Arabia. (...). They built large dams and an extensive irrigation system, which made their country the most fertile in ancient Arabia. This is why it was known in classical times as Arabia Felix, 'Happy Arabia.'

اب عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ عرب کے اس شیبا کی، جو اس خطے میں واقع ہے جسے اب یمن کہتے ہیں، ایک ملکہ تھی جو حضرت سلیمان کی ملاقات کے لیے آئی تھی (۱سلوک ۱۰:۱-۱۳)۔ سبائی پورے عرب کی سب سے اہم اقوام میں سے ایک تھی۔ (...)۔ انھوں نے بڑے بڑے بند اور آبپاشی کا ایک وسیع نظام تعمیر کیا تھا۔ جس سے ان کا ملک قدیم عرب کا سب سے زیادہ زرخیز ملک بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کلاسیکی دور میں عربیا فیلکس یعنی 'خوش و خرم عرب' کہتے تھے۔

۱۶۔ ٹائنڈیل ہاؤس، کیمبرج کا وارڈن ڈیرک کڈنر اپنی کتاب 'یسعیاہ کی تفسیر' میں صفحہ ۲۲۱ پر لکھتا ہے:

v. 7 is crucial to the understanding of the chapter [60].

ساتویں آیت اس باب [۶۰] کا مفہوم سمجھنے کے سلسلے میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔

۱۷۔ ڈملو نے اپنی تفسیر میں صفحہ ۴۵۰ پر لفظ 'نبایوت' کی اس طرح وضاحت کی ہے:

a tribe allied to Kedar, descended from Ishmael (Gn 25:13).

قیدار کا ساتھی ایک قبیلہ، جو اسماعیلؑ کی نسل سے ہے (پیدائش ۲۵:۱۳)۔

'دی نیو جیروسلم بائبل' (صفحہ ۱۲۸۳) نے نبایوت کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

an Arabian people, see Gn. 25:13; 28:9; 36:3.

ایک عربی قوم، ملاحظہ کیجیے کتاب پیدائش ۲۵:۱۳، ۲۸:۹، ۳۶:۳۔

'اے نیو کیتھولک کمنٹری اون ہولی سکرپچر' صفحہ ۵۹۷ پر تشریح کرتی ہے:

The tribes of 'Kedar' and of 'Nebaioth' were of Ishmaelite origin, and were mainly shepherds.

'قیدار' اور 'نبایوت' کے قبیلے اسماعیلؑ کی نسل سے تھے اور وہ زیادہ تر چرواہے تھے۔

'دی وکلف بائبل کمنٹری' صفحہ ۶۵۱ پر یہ کہنے کے بعد کہ:

It is quite remarkable that, in origin, all these offered treasures are

preponderantly Arabian.

یہ بہت اہم ہے کہ یہ تمام پیش کردہ خزانے بنیادی طور پر زیادہ عرب سے تعلق رکھتے ہیں۔

اپنے دل کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل پیش گوئی کرتا ہے:

Perhaps there is a suggestion here that Islam will some day turn to the Cross.'

شاید یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک نہ ایک دن اسلام عیسائیت قبول کرلے گا۔

۱۸ اصل عبرانی بائبل میں اس لفظ 'خدمت کرنا' کے لیے 'شرث' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے 'سٹرونگز ڈکشنری آف دی ہیبریو بائبل' (صفحہ ۱۲۲، اندراج ۸۳۳۴-۸۳۳۵) میں یہ معنی درج ہیں:

to attend as a menial or worshipper; fig. to contribute to, minister, wait on;' or 'service (in the temple)

ایک ادنیٰ انسان یا عبادت گزار کی طرح خدمت میں حاضر ہونا مجازی طور پر امداد کرنا، خدمت کرنا، خدمت میں حاضر رہنا یا ہیکل میں خدمت بجالانا یا عبادت کرنا۔

'یہودی تفسیر پنٹاٹیوک اینڈ ہفتوراز' (صفحہ ۸۷۵) میں جے ایچ ہرٹز عبرانی لفظ کا ترجمہ 'Minister' کرتا ہے اور حاشیہ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے: 'قربانیوں کے لیے جانور فراہم کرکے۔'

۱۹ ڈملو نے اپنی تفسیر کے صفحہ ۴۵۰ پر یہاں ایک ذیلی حاشیہ دیا ہے:

The nations are pictured as coming in a long train, to bring their riches for the service of the sanctuary.

قوموں کو ایک بڑے سلسلے میں آتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ وہ اس حرم کی خدمت کے لیے اپنی دولت لائیں۔

میتھیو ہنری کی 'عہد نامہ قدیم و جدید کی تفسیر' (۳۵۱:۵) میں درج ہے:

Great numbers of sacrifices shall be brought to God's altar, acceptable sacrifices, and, though brought by Gentiles, they shall find acceptance.

خداوند کے چبوترے پر قربانیوں کی بہت بڑی تعداد لائی جائے گی جو قابل قبول قربانیاں ہوں گی اور اگرچہ انھیں غیر یہودی قوموں کے لوگ لے کر آئیں گے پھر بھی یہ شرف قبولیت حاصل کریں گی۔

اگر انھیں ہیکل دُوم کے حوالے سے دیکھا جائے تو انھیں محض من پسند تخیلات ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲۰ 'نیو انٹرنیشنل ورشن' میں صفحہ ۹۷۷ پر اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

They will be accepted as offerings on my altar, and I will adorn my glorious

temple.

وہ میرے چبوترے پر قربانی کے طور پر قبول کیے جائیں گے اور میں اپنے عظیم الشان ہیکل کو سجاؤں گا۔

۲۱ 'نیو انٹرنیشنل ورشن' میں صفحہ ۹۷۷ پر اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

and I will adorn my glorious temple

اور میں اپنے عظیم الشان ہیکل کو سجاؤں گا۔

'دی سنکیو فاش' (صفحہ ۱۱۳۴) نے یہاں ایک ذیلی حاشیہ درج کیا ہے:

By causing the nations to bring their gifts and offerings to it (K).

قوموں کی اس پر اپنی قربانیاں اور اپنی نذریں پیش کروا کر۔

۲۲ یہ جدے کے ہوائی اڈے پر روزانہ بادلوں کی طرح آنے اور زمین پر اترنے والے ان ہزاروں ہوائی جہازوں کی عکاسی کرتا ہے، جو کروڑوں زائرین کو عمرے کے لیے سارا سال اور لاکھوں حاجیوں کو حج کے لیے ذی الحج کے مہینے میں لے کر آتے ہیں۔

۲۳ کیرل سٹوہل مل' دی چیروم تفسیر بائبل' میں صفحہ ۳۸۳ پر لفظ 'ترشیش' کی وضاحت کرتا ہے:

A Phoenician colony in southern Spain (Jon 1:3).

جنوبی سپین میں ایک فینقی نو آبادی۔

یہاں یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ سپین پر تقریباً آٹھ صدیوں تک عرب مسلمانوں کی حکومت رہی۔ یہ مسلمان بحری جہازوں کے ذریعے سے حج ادا کرنے کے لیے حرم مکہ کا سفر کرتے تھے۔

۲۴ ڈاکٹر ڈبلیو فج، منسٹر، چرچ آف سکاٹ لینڈ، گلاسگو 'نیو بائبل کومنٹری' میں صفحہ ۶۰۴ پر کتاب یسعیاہ کی تفسیر میں لکھتا ہے:

The gates will not be shut by day nor night, a symbol of absolute security under the blessing of her God.

دن ہو یا رات کسی وقت دروازے بند نہیں ہوں گے۔ اس بے پایاں تحفظ کی یہ ایک علامت ہے جو اس کے خداوند کی برکت کے تحت حاصل ہوگا۔

لیکن لفظ کے کسی مفہوم کے اعتبار سے بھی انھیں ہیکل دوم سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری

طرف حرمِ مکہ کے لیے یہ کلیتاً صحیح ہے جس کے دروازے حجاج کرام کے لیے دن رات کھلے رہتے ہیں۔ ان حجاج کی اکثریت غیر یہودی النسل ہوتی ہے اور جن میں کئی ملکوں کے بادشاہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ سب لوگ دن رات میں ایک لمحے کے وقفے کے بغیر خانۂ کعبہ کے گرد طواف میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت سے انھیں وہاں مکمل تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

۲۵ 'دی نیو جیروسلیم بائبل' میں صفحہ ۱۲۸۳ پر آیت ۱۲ کے سلسلے میں ایک حاشیہ درج ہے:

Interrupting the continuity, [v. 12] is very probably additional.

تسلسل منقطع کرنے والی یہ (آیت ۱۲) غالباً ایک [بعد کا] اضافہ ہے۔

'اے نیو کیتھولک کمنٹری اون ہولی سکرپچر' (صفحہ ۵۹۷) نے بھی اس آیت کی اسی طرح تشریح کی ہے:

In a context of this kind, the threat mentioned in 12 is astonishing, and is probably a gloss inserted later.

اس قسم کے سیاق و سباق میں [آیت] ۱۲ میں بیان کردہ دھمکی حیران کن ہے اور غالباً بعد میں بڑھائی ہوئی کوئی تشریح ہے۔

۲۶ لفظ 'صیہون' کا مختصر تعارف اس کتاب کے باب ۱۱ کے اخیر میں درج ہے۔ (دیکھیے: صفحہ ۱۸۵)

۲۷ 'دی نیو جیروسلیم بائبل' (صفحہ ۱۲۸۳) کے الفاظ میں یہ بھی آیت ۱۲ کی طرح 'بڑی غالب حد تک اضافی، یعنی الحاقی ہو سکتی ہے'، لیکن اگر آیت ۱۲، ۱۴ پوری طرح تحریف شدہ، اضافی اور بعد کی داخل کردہ نہ بھی ہوں اور اُن کا مفہوم صحیح سالم اور غیر تحریف شدہ ہو تو بھی حرم مکہ پر ان کا پورے اطمینان سے اطلاق کیا جا سکتا ہے اور یہ پیغمبر اسلام کے ہاتھوں فتحِ مکہ کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔

۲۸ ڈملو نے اپنی تفسیر (صفحہ ۴۵۰) میں اس جگہ ایک ذیلی حاشیہ دیا ہے۔ اس میں درج ہے:

The figure is that of a forsaken wife (546)

صورت حال ایک تنہا چھوڑی ہوئی بیوی کی ہے (۶:۵۴)۔

'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' (۴:۳۱۵) میں درج ہے:

Like a forsaken wife.

ایک یکہ و تنہا چھوڑی ہوئی بیوی کی طرح۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ اسماعیلؑ کی والدہ ہاجرہ سے متعلق ہے۔

۲۹ 'دی نیلسن سٹڈی بائبل' نے آیت ۱۵ میں صفحہ ۱۲۰۹ پر ایک حاشیہ درج کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

The new sanctuary will be greater than the old one because it is eternal, rich, and spiritual (vv. 17, 18)

نیا حرم پرانے سے زیادہ عظیم ہوگا، کیونکہ یہ ابدی، مالا مال اور روحانی ہے (آیت ۱۷-۱۸)۔

جو حرمِ مکہ کے بارے میں ہو بہو صحیح ہے۔

۳۰ 'سنکینو قماش' (صفحہ ۱۱۳۷) نے یہاں ایک ذیلی حاشیہ درج کیا ہے:

Israel's sovereignty and glory will never again depart (K).

اسرائیل کی حاکمیت اور شان و شوکت پھر کبھی ختم نہ ہوگی۔

یہ ایک خواہشاتی توقع سے زیادہ کچھ نہیں جو کبھی عملی صورت نہیں اختیار کر سکتی۔ دوسری طرف حرمِ مکہ پر اس کا کلی اطلاق ہوتا ہے۔

۳۱ 'سنکینو قماش' میں صفحہ ۱۱۳۷ پر اس جگہ درج ذیل حاشیہ دیا گیا ہے:

Israel's national glory will endure for ever, because the restoration will be the work of God (K).

اسرائیل کی قومی شان و شوکت ہمیشہ کے لیے قائم رہے گی، کیونکہ بحالی کا یہ عمل خداوند کا کام ہوگا۔

یہ بھی ایک خواب و خیال ہی رہا، کیونکہ ہیکل دوم کی تعمیر کے بعد بھی اسرائیل کی شان و شوکت کی وہ بحالی، جس کو یہاں 'خداوند کا کام' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، کبھی حقیقت میں تبدیل نہ ہوگی۔ وہ (یہودی) ایرانی، یونانی، سریانی یا رومی سلطنتوں کے تحت صرف محدود سی ایک 'داخلی خود مختاری' سے زیادہ کچھ نہ حاصل کر سکے۔ ہیکل ۷۰ء میں مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا اور 'اسرائیل کی قومی شان و شوکت ہمیشہ کے لیے باقی رہے گی' کا خواب محض ایک سُندر سپنا ہی رہا۔

۳۲ کتاب مقدس، یسعیاہ ۶۰: ۱-۲۱۔

۳۳ ڈاکٹر ڈبلیو ایچ 'نیو بائبل کومنٹری' میں اپنی کتاب یسعیاہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

Jerusalem is to be rebuilt (...). Then will the city be the centre of the world's light [unfortunately the city could never become 'the centre of the world's light'], for

the glory of everlasting God will rest upon her and will radiate around the world [the world never saw this dream come true]. (...) iii. Jerusalem to be built again. (lx. 10-14). (...). When rebuilt the gates will not be shut by day nor night (11), a symbol of absolute security under the blessing of her God [Of course, it is quite true that 'the gates will not be shut by day nor night' because they do not even physically exist on earth. As such, the question of their being ever shut does not arise! Because it is 'a symbol of absolute security under the blessing of her God' How can someone dare to comment on it!], and also implying the warmth of the welcome that will be given to those that seek an entrance therein.

یروشلم کو دوسری دفعہ تعمیر ہونا ہے۔(...)۔اس وقت یہ شہر دنیا کی روشنی کا مرکز ہوگا[لیکن بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ یہ شہر کبھی بھی دنیا کی روشنی کا مرکز نہ بن سکا]، کیونکہ ازلی اور ابدی خداوند کی شان وشوکت اس پر برقرار رہے گی اور دنیا کے اردگرد روشنی پھیلائے گی[لیکن دنیا نے کبھی بھی یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے نہیں دیکھا]۔ (...)۔یروشلم کا دوبارہ تعمیر کیا جانا(۶۰:۱۰-۱۴)۔(...)۔جب یہ دوبارہ تعمیر ہوگا تو دروازے دن یا رات میں کسی وقت بند نہ ہوں گے(۱۱)، اپنے خداوند کی برکت کے تحت مطلق تحفظ کی علامت[بلاشبہ یہ بالکل سچ ہے کہ 'دروازے دن یا رات میں کسی وقت بند نہ ہوں گے۔' چونکہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، اس لیے ان کے کبھی بند ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔' کیونکہ یہ اپنے خداوند کی برکت کے تحت مطلق تحفظ کی ایک علامت ہیں۔' بھلا کوئی شخص جھوٹ کے اس طومار پر تبصرہ کرنے کی کیسے جرأت کرسکتا ہے]اور یہ اس پُرجوش خیر مقدم کی غمازی بھی کرتا ہے جو ان لوگوں کو پیش کیا جائے گا جو اس میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔

مندرجہ بالا عبارت کا پہلا ذیلی حاشیہ بھی ملاحظہ کیجیے۔

۳۴ مندرجہ بالا آیات ۵،۱۵،۲۰،۲۱ کے ذیلی حواشی بھی ملاحظہ کیجیے۔

۳۵ N.O.A.B یسعیاہ ۶۰:۱۷-۱۸(صفحہ ۹۵۰)پر ذیلی حاشیہ ملاحظہ کیجیے۔

۳۶ جے ایل میکنزی کی لغتِ بائبل، ۸۷۵۔

۳۷ ڈبلیو سمتھ کی لغتِ بائبل، ۶۸۰۔

۳۸ 'نیو بائبل ڈکشنری'، ۱۱۷۰۔

۳۹ ملاحظہ کیجیے سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ بائبل ڈکشنری، ۱۱۰۰۔

۴۰ 'دی جیوئش انسائیکلوپیڈیا'، ۱۲:۹۷۔

۴۱ ' گڈ نیوز بائبل' یسعیاہ ۶۰:۶، صفحہ ۷۲۲ پر درج ہے:

Great caravans of camels will come, from Midian and Ephah. They will come from Sheba (...)! All the sheep of Kedar and Nebaioth Will be brought to you as sacrifices And offered on the altar to please the Lord.

مدیان اور عیفاہ سے اونٹوں کے بڑے بڑے کاروان آئیں گے۔ وہ شیبا سے آئیں گے۔(...)! قیدار اور نبایوت کی تمام بھیڑیں قربانی کے لیے تمھارے پاس لائی جائیں گی اور چبوترے پر پیش کی جائیں گی۔

C.E.V۔ یسعیاہ، باب ۶۰:۶، صفحہ ۸۷۷ پر درج ہے:

Your country will be covered with caravans of young camels from Midian and Ephah. The people of Sheba will bring gold and spices in praise of me, the Lord. Every sheep of Kedar will come to you; rams of Nebaioth will be yours as well. I will accept them as offerings and bring honor to my temple.

تمھارا ملک مدیان اور عیفاہ سے [آنے والے] نوجوان اونٹوں کے کاروانوں سے ڈھکا جائے گا۔ شیبا کے لوگ مجھ خداوند کی حمد میں سونا اور مصالحے لائیں گے۔ قیدار کی ہر بھیڑ تمھارے پاس آئے گی، نبایوت کے دنبے بھی تمھارے ہوں گے۔ میں انھیں قربانی کے طور پر قبول کروں گا اور اپنے ہیکل کو اعزاز بخشوں گا۔

جہاں تک دوسرے ہیکل کا تعلق ہے، مندرجہ بالا بیان کے مشمولات محض خیال و خواہش کی غمازی کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت میں جو مناظر پیش کیے گئے ہیں وہ بائبل کے کسی خوش اعتقاد مؤلف کے محض خواب ہیں، جو اس بے چارے کی دل داری کے لیے کبھی زمینی حقیقت میں تبدیل نہ ہو سکے۔

42. *New Jerusalem Bible*, p. 1283.

43. NIV, p. 780.

۴۴ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ میتھیو ہنری کی پرانے اور نئے عہدنامے کی تفسیر ۵:۳۵۱ کے مطابق 'بادشاہوں' کا مطلب 'خوب صورت، طاقت ور اور اثر و رسوخ والے آدمی' ہے۔

45. Mckenzie's *Dic. of the Bible*, p.875.

۴۶ قرآن مجید، الحج ۲۲:۲۶-۳۲۔

47. *The Nelson's Study Bible*. p. 1208.

48. Page H. Kelley in the Broadman Bible Com, ed. Clifton J. Allen etc., (Nashville, Tennessee, Broadman Press, 1971), 5:360.

بابِ یازدہم

'زبور' میں 'حجِ بکہ' کا ذکر

حضرت داوٗد علیہ السلام نے اپنے مزمور ۸۴ میں بکہ کے حج کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس تمنا کا اظہار کیا ہے کہ کاش، انھیں بھی حجاجِ کرام کی معیت میں حج کا موقع نصیب ہوتا۔ وہ ان پرندوں کی خوش نصیبی پر رشک کرتے ہیں جو خانہ خدا میں آشیانے بناتے اور ان میں آباد ہوتے ہیں، جبکہ ان کی کم نصیبی کا حال یہ ہے کہ وہ خود یہاں زیارت کے لیے حاضری بھی نہیں دے سکتے۔ وہ خداوند کے حضور خانہ خدا کے دیوان میں حاضری کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> تیرے دیوان میں حاضری کا ایک دن ایک ہزار [دن] سے بہتر ہے۔ کاش میں [اتنا بڑا بادشاہ ہونے کے بجائے] اپنے خداوند کے گھر کا دربان ہی ہوتا۔

کیسی شدید ہے یہ خواہش! کتاب کے اس باب میں مزمور کا معروضی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔[1] اکثر نکات کی تشریح موقع پر ہی ذیلی حواشی میں کر دی گئی ہے۔ ذیل میں اردو کتابِ مقدس سے زبور نمبر ۸۴ کی عبارت نقل کی جاتی ہے:

(۱) اے لشکروں کے خداوند![2]
تیرے مسکن[3] کیا ہی دل کش ہیں!
(۲) میری جان خداوند کی بارگاہوں کی مشتاق ہے،[4] بلکہ گداز ہو چلی ہے۔
میرا دل اور میرا جسم زندہ خدا کے لیے خوشی سے للکارتے ہیں۔
(۳) اے لشکروں کے خداوند![5] اے میرے بادشاہ اور میرے خدا!

تیرے مذبحوں کے پاس گوریا نے اپنا آشیانہ

اور ابابیل نے اپنے لیے گھونسلا بنالیا[6]

جہاں وہ اپنے بچوں کو رکھے[7]۔

(۴) مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں۔

وہ سدا[8] تیری تعریف[9] کریں گے[10]۔ (سلاہ)

(۵) مبارک ہے وہ آدمی جس کی قوت تجھ سے ہے[11]۔

جس کے دل میں صیون کی شاہراہیں ہیں[12]۔

(۶) وہ وادیٔ بکا سے گزر کر[13] اُسے چشموں کی جگہ بنالیتے ہیں[14]۔

بلکہ پہلی بارش اسے برکتوں سے معمور کر دیتی ہے[15]۔

(۷) وہ طاقت پر طاقت پاتے ہیں[16]۔

ان میں سے ہر ایک صیون[17] میں خدا کے حضور حاضر ہوتا ہے۔

(۸) اے خداوند لشکروں کے خدا! میری دعا سن۔

اے یعقوب کے خدا! کان لگا۔ (سلاہ)

(۹) اے خدا! اے ہماری سپر! دیکھ

اور اپنے ممسوح کے چہرے پر نظر کر۔

(۱۰) کیونکہ تیری بارگاہوں میں ایک دن ہزار [دن] سے بہتر ہے۔

میں اپنے خدا کے گھر کا دربان ہونا۔

شرارت کے خیموں میں بسنے سے زیادہ پسند کروں گا[18]۔

(۱۱) کیونکہ خداوند خدا، آفتاب اور سپر ہے[19]۔

خداوند فضل اور جلال بخشے گا۔

وہ راست رو سے کوئی نعمت باز نہ رکھے گا۔

(۱۲) اے لشکروں کے خداوند!

مبارک ہے وہ آدمی جس کا توکل تجھ پر ہے۔[20]

مناسب ہوگا کہ اس مزمور کا مفہوم متعین کرنے کے لیے اس کی آیات کا الگ الگ مطالعہ کیا جائے۔ کیتھولک کلامِ مقدس میں پہلی آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: 'اے ربّ الافواج، تیرے مساکن کیا ہی دلکش ہیں[21]'

N.I.V. (صفحہ ۶۳۱) اور NOAB (صفحہ ۷۴۷) کے ترجمے کے مطابق آیت امیں کہا گیا ہے:

How lovely is your dwelling place, O Lord Almighty! (NOxfAB: O Lord of hosts!)

اے خداوند قدیر! تیری جائے رہائش کیسی پیاری ہے! (NOAB کے مطابق اے رب الافواج)۔

اس کا مطلب ہے کہ یہ مزمور خدائے قدیر کی کسی 'جائے رہائش' سے متعلق ہے، جو اُس وقت فی الحقیقت صفحہ ارضی پر موجود تھی۔ عربی زبان میں 'خداوندِ قدیر کی جائے رہائش' کا ترجمہ 'بیت اللہ' کے الفاظ میں کیا جا سکتا ہے، جس کا مطلب ہے 'اللہ تعالیٰ کا گھر'۔ یہ 'بیت اللہ' حضرت داؤد علیہ السلام کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا اور مکہ میں اسی نام کے ساتھ عملاً ایک زمینی حقیقت کے طور پر موجود تھا، تاہم اہل عرب اسے 'الکعبۃ' کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ دوسری طرف اس وقت صفحہ ارضی پر کسی اور جگہ 'خداوندِ قدیر کی جائے رہائش' یا 'بیت اللہ' نامی کوئی عمارت موجود نہ تھی۔ اس وقت تک ہیکل سلیمانی تو سرے سے معرضِ وجود ہی میں نہ آیا تھا۔ یہ تو تعمیر ہی اس سے قریباً نصف صدی بعد ہوا تھا۔ اس کی تعمیر تو حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی کے دوران میں شروع ہی نہ ہو سکی تھی، اس لیے 'خداوند قدیر' کی اس 'جائے رہائش' کو مکے میں واقع 'الکعبۃ' یا 'بیت اللہ' قرار دیے جانے کے علاوہ اور کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی مزمور کے متن میں اور بھی ایسے متعدد شواہد موجود ہیں جن سے یہ بات بالکل یقینی طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

دوسری آیت سے بادشاہ داؤد علیہ السلام کی اپنے حی و قیوم خداوند کے دربار میں حاضری کی ولولہ انگیز خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 'خداوند حی و قیوم کا دربار' پہلے ہی کسی جگہ موجود

تھا، لیکن یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی حدودِ سلطنت میں شامل نہ تھا، جس کی وجہ سے وہ اس کی زیارت سے محروم تھے۔ چنانچہ وہ 'خداوند کے دربار' کی زیارت کی خواہش ہی کا اظہار کر سکتے تھے۔

جہاں تک آیات ۳ اور ۴ کا تعلق ہے تو اوپر موقع ہی پر ذیلی حواشی میں جو تشریح درج کی گئی ہے، اس سے بات کی وضاحت ہو چکی ہے، تاہم چند باتیں یہاں بھی دہرائی جا رہی ہیں۔

NOAB (صفحہ ۷۴۷) کے ذیلی حواشی میں ان آیات کی ایک خوب صورت تشریح بیان کی گئی ہے:

Envy of the birds and servitors who live there.

رشکِ طیور و خدام[22] جو وہاں قیام پذیر ہیں۔

'کالج ولا تفسیر بائبل' (صفحہ ۲۷۷) میں ان آیات ۳-۴ کی جو وضاحت کی گئی ہے، وہ بھی قابلِ غور ہے:

All living things are safe from threat in the presence of the Lord.

تمام زندہ اشیا خداوند کے حضور میں ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہیں [حرم مکہ میں عملی، شرعی و قانونی اور واقعی صورتِ حال یہی ہے کہ وہاں تمام ذی روح اشیا محفوظ و مامون ہیں]۔

'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' میں اس کی مندرجہ ذیل تشریح کی گئی ہے:

The general meaning of the verse, whose conclusion the poet only implies, is that even the birds have free access to the sacred precincts of the sanctuary, they make their homes there undisturbed, while the psalmist is exiled from the source of his joy, is denied the privilege of worshipping within the sacred enclosure. The nostalgic appeal of this verse is one of the most delicately beautiful expressions of homesickness in the whole realm of literature.[23]

آیت کا عمومی مفہوم جس کے نتیجے کی طرف شاعر محض اشارہ ہی کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ پرندے تک حرم کی مقدس حدود میں آزادی سے داخل ہو سکتے ہیں، وہ وہاں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے آشیانے بناتے ہیں، جبکہ داؤد اپنی مسرت کے سرچشمے سے جدا ہے اور اس مقدس عمارت کی حدود میں اسے عبادت کا حق حاصل نہیں۔ اس آیت کی حسرت بھری اپیل پوری دنیائے ادب میں وطن کی یاد کے انتہائی نزاکت اور خوب صورتی کے ساتھ اظہار کی بہترین مثال ہے۔

اس طرح آیت ۱-۴ سے جو نکات واضح ہوتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت داؤد علیہ السلام کسی ایسے حرم کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جو اُس وقت روے زمین پر عملاً موجود تھی اور جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے تھا۔

۲۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے دل میں اس حرمِ مقدس کی زیارت کی شدید خواہش ہے، لیکن وہ اسے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے (ظاہر ہے اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ان کی حدودِ سلطنت سے باہر ہے)۔

۳۔ یہ حرمِ مقدس مکے کا خانۂ کعبہ یعنی بیت اللہ ہی ہو سکتا تھا، کیونکہ بیت المقدس (ہیکلِ سلیمانی) تو اس وقت تک تعمیر ہی نہیں ہوا تھا اور خانۂ کعبہ کے علاوہ روے زمین پر اور کوئی ایسی عمارت موجود ہی نہ تھی جس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب ہو اور جو خداے واحد کی عبادت کے لیے مختص ہو۔

۴۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنی حسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ پرندے تک دربارِ الٰہی میں آزادانہ بسیرا لیتے ہیں، لیکن انھیں یہاں حاضری کا شرف میسر نہیں۔

KJV میں آیت ۵ کے دوسرے جملے کا ترجمہ واضح نہیں ہے۔ اکثر دوسرے تراجم میں اس مفہوم کو 'جن کے دل میں حج کی لو لگی ہے' یا اس سے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ نیچے بائبل کے کچھ تراجم اور تفاسیر کی فہرست دی گئی ہے جو آیت اور اس مزمور کے مضمون کا حج سے تعلق قائم کرتے ہیں:

(i) *Bible Knowledge Commentary*, p. 855.

(ii) *Christian Community Bible*, p. 1000.

(iii) *Collegeville Bible Commentary*, p.772.

(iv) *Contemporary English Version*, p. 707.

(v) *Good News Bible*, p. 900.

(vi) *Jerome Biblical Com.*, p. 591.

(vii) *New American Bible*, p. 615.

(viii) *New Bible Com.*, p. 472.

(ix) *New Bible Com. (Rvd)*, p. 504.

(x) *New Catholic Com.*, p. 473.

(xi) *New Commentary on Holy Scripture*, p. 264.

(xii) *New English Version*, p. 441.

(xiii) *New International Version.*, p. 621.

(xiv) *New Jerome Commentary*, p.540.

(xv) *New Jerusalem Bible*, p.900.

(xvi) *New KJV* (Nelson Study Bible), p. 966.

(xvii) *Peake's Bible Com.*, p. 431.

(xviii) *Today's English Version*, p. 607.

(xix) *Wycliffe Bible Com.*, p. 526.

(xx) *7th Day Adventist Bible Com.*, p. 828.

(xxi) *The Holy Bible (O&NT)*: An Improved Edn.(American Baptist Publication Society), as quoted by 'The OT books of poetry from 26 trans.', p. 334.

(xxii) *A New Trans. Of the Bible* (James Moffatt), as quoted by 'The OT books of poetry from 26 trans.', p. 334.

مندرجہ بالا مواد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس مزمور کا تعلق کسی حج سے ہے جو ایک عرصۂ دراز سے کسی حرم میں روایتی طور پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس مزمور میں سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام اُن لوگوں کو برکت عطا کر رہے ہیں 'جو خداوند کے اس گھر میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہیں اور ہمیشہ اس کی حمد کرتے ہیں'۔ دوسرے نمبر پر وہ [حضرت داؤد علیہ السلام] ان لوگوں کے لیے برکت کی دعا کرتے ہیں 'جن کے دلوں میں حج کی محبت رچ بس گئی ہے [لیکن وہ اس میں مستقل طور پر رہائش پذیر نہیں ہیں]'۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حرمِ پاک وہاں عملی طور پر موجود ہے۔ یہ خداوند کے لیے وقف ہے اور اس کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ لوگ 'حج' کے لیے اس کا سفر اختیار کرتے ہیں۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یروشلم کا حرم یعنی ہیکلِ سلیمانی ابھی وہاں معرضِ وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ یہ اس سے قریباً نصف صدی بعد تعمیر ہوا تھا، جبکہ حرم کعبہ جسے اہلِ عرب بیت اللہ یا اللہ کا گھر

کہتے تھے، عرب کے شہر مکہ میں ایک ٹھوس زمینی حقیقت کے طور پر حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی قریباً ایک ہزار سال پہلے سے موجود چلا آ رہا تھا۔ ان [حضرت داؤد علیہ السلام] کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسلیں اور پورے جزیرۃ العرب کے قبائل یہاں حج کرنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں آیا کرتے تھے۔ وہ اپنے حج کے دوران میں خداوند کی حمد کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اعلان کرتے چلے آ رہے ہیں:

لبیك اللّٰھم لبیك، لبیك لا شریك لك لبیك، ان الحمد و النعمة لك و الملك لا شریك لك.

حاضر ہوں، اے اللہ، میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔ حقیقت میں تمام تعریف تیرے ہی لیے ہے۔ تمام نعمتیں تیری ہیں اور حاکمیت بھی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے دل میں اس حرم کی محبت، آرزو اور احترام ضرور رہا ہوگا، کیونکہ اسے ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، لیکن یہ ان کی حدودِ سلطنت سے باہر تھا اور وہ ایک دوسری سرزمین کے بادشاہ تھے، اور کیونکہ وہ لگاتار مختلف جنگوں میں مصروف رہتے تھے، اس لیے وہ اس کی زیارت سے قاصر تھے۔ وہ بس اس بات کی خواہش کا اظہار ہی کر سکتے تھے کہ کاش وہ اس حرمِ مقدس میں حاضری دیں اور اس کا حج ادا کریں اور اس پر قربانی پیش کریں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی مکہ کے حج کی آرزو کا ایک اور سبب بھی ہے، جس کی وضاحت اگلی فصل میں کی گئی ہے۔

'بکہ' نے حضرت داؤدؑ کے دورِ ابتلا میں انھیں پناہ فراہم کی

حضرت داؤد علیہ السلام نے شاہ طالوت کے لیے عظیم الشان خدمات سرانجام دی تھیں، لیکن بائبل کے مطابق شاہ طالوت حضرت داؤد علیہ السلام کی ہردلعزیزی اور قوت دیکھ کر ان سے حسد کرنے لگا تھا اور انھیں ٹھکانے لگوا دینا چاہتا تھا۔ سمتھ کی لغتِ بائبل میں وضاحت ہے:

> Unfortunately David's fame proved the foundation of that unhappy jealousy of Saul towards him which, mingling with the king's constitutional malady, poisoned his whole future relations to David. (...). He [David] also still performed from time to time the office of minstrel [singer or musician of the king's court]; but the successive attempts of Saul upon his life convinced him that he was in constant danger. (...), he escaped by night, (...). David's life for the next few years was made up of a succession of startling incidents. (...); he is hunted by Saul from place to place like a partridge.[24]

بدقسمتی سے داؤدؑ کی شہرت شاہ طالوت کے ان [حضرت داؤد علیہ السلام] سے اس ناخوش گوار حسد کی بنیاد ثابت ہوئی جس نے داؤدؑ سے اس کے مستقبل کے تمام تعلقات میں زہر گھول دیا۔ مزید براں شاہ طالوت کی جسمانی کمزوری اور بیماری بھی اس [حسد] کا باعث بنی۔ (...)۔ وہ [حضرت داؤد علیہ السلام] ابھی تک وقتاً فوقتاً بادشاہ کے دربار کے شاہی موسیقار کے طور پر بھی خدمات بجالاتے تھے، لیکن شاہ طالوت کی بار بار ان کی جان لینے کی کوششوں سے انھیں یقین ہو گیا کہ ان کی جان مسلسل خطرے میں ہے۔ (...)۔ انھوں نے رات [کی تاریکی] میں راہِ فرار اختیار کی، (...)۔ اگلے چند سال تک داؤدؑ کی زندگی مسلسل چونکا دینے والے حیرت انگیز واقعات سے عبارت تھی۔ (...)۔ شاہ طالوت جگہ جگہ تیتر کے شکاری کی طرح ان کی گھات میں تھا۔

اسی دوران میں حضرت داؤد علیہ السلام کے سرپرست سیموئیل نبی کا انتقال ہو گیا۔ داؤد علیہ السلام شاہ طالوت کی پہنچ سے دور رہنے کے لیے فاران کے بیابان کی طرف بھاگ گئے۔ بائبل کی کتاب

ا۔سموئیل میں بیان کیا گیا ہے:

اور سموئیل مر گیا اور سب اسرائیلی جمع ہوئے اور انھوں نے اُس پر نوحہ کیا اور اُسے رامہ میں اُسی کے گھر میں دفن کیا اور داؤد اٹھ کر دشتِ فاران کو چلا گیا۔[۲۵]

یہ فاران وہی جگہ ہے جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ہاجرہ اس وقت سے آباد ہو گئے تھے، جب انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں چھوڑ آئے تھے۔ اگر یہ وہ دوسرا فاران ہوتا جو صحرائے سینا میں واقع تھا تو شاہِ طالوت کی اس تک رسائی کوئی مشکل نہ ہوتی اور حضرت داؤد علیہ السلام وہاں بالکل غیر محفوظ ہوتے۔ چنانچہ یہ وہی فاران ہو سکتا ہے جس کا بائبل میں ان الفاظ میں ذکر آیا ہے:

اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اسے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے، جہاں لڑکا پڑا ہے، اس کی آواز سن لی ہے۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملکِ مصر سے اس کے لیے بیوی لی۔[۲۶]

اگر یہ دوسرا یعنی سینائی والا فاران ہوتا تو یہ طالوت کی بالکل پہنچ میں ہوتا اور حضرت داؤد علیہ السلام وہاں کسی صورت محفوظ نہ ہوتے۔

یہ بات تاریخی طور پر بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے اور زمینی حقائق کے بھی عین مطابق ہے کہ خانۂ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تعلق رکھنے والے اہل عرب یہاں فریضۂ حج ادا کرنے آتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فاران کے بیابان میں بکہ کے مقام پر رہنے کا جو موقع ملا تھا، ظاہر ہے کہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے فریضۂ حج بھی ادا کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اس جائے پناہ کی ایک مرتبہ پھر زیارت کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں تاکہ وہاں حج کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

'بکہ' کا اصلی نام

آیت ۶ 'جو وادیٔ بکا میں سے گزرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے ہیں۔ بارش بھی جو ہڑوں کو بھرتی ہے۔' اس لفظ (بکا) کے یقینی طور پر اسم معرفہ ہونے کی نشان دہی کرتی ہے جہاں سے حاجیوں کو اپنے حج کی ادائیگی کے دوران میں گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض تراجم میں لفظ 'بکا' کو کسی اور لفظ سے بدل دیا گیا ہے۔ 'دی نیو جیروسلم بائبل' (صفحہ ۹۰۰-۹۰۱) نے اس کا ترجمہ 'بلسام' کیا ہے اور ذیلی حاشیے میں لکھا ہے:

In seven MSS and in versions, 'the valley of Tears' (the Hebrew words for these two words are identical when spoken).

سات مسودات اور تراجم میں [اس کا ترجمہ] 'اشکوں کی وادی' [کیا گیا ہے]۔ اُس میں مزید لکھا ہے کہ جب یہ دونوں الفاظ بولے جاتے ہیں تو ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔

بعض دوسرے تراجم نے لفظ 'بکا' کو اسم معرفہ کے طور پر نہیں لیا اور اس کا ترجمہ 'Misery' (مصیبت)[27] 'weary/glen' (اُکتا دینے والی وادی)[28]، 'thirsty valley' (پیاسی وادی)[29] وغیرہ کے الفاظ سے کیا ہے۔ ڈاکٹر کرٹس وان (Curtis Vaughan) کی کتاب 'عہد نامہ قدیم کی شعری کتابوں کے چھبیس تراجم' میں درج شدہ تمام ترجموں میں اس مقام پر اصل عبرانی لفظ 'بکا' قرار دیا گیا ہے۔ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' میں درج ہے:

The LXX and the Vulgate translate the phrase 'valley of Baca' as 'valley of Tears.'

'ہفتادی ترجمہ'[30] اور 'ولگیٹ'[31] میں 'وادیٔ بکا' کا ترجمہ 'آنسوؤں کی وادی' کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔[32]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بائبل کے ان یونانی اور لاطینی تراجم کے مطابق بھی یہاں اصل عبرانی لفظ 'بکا' ہی ہے۔ ذیل میں بائبل کے کچھ مزید ایسے تراجم اور تفاسیر کی فہرست دی جاتی ہے جنھوں نے اس مقام پر 'بکا' کا لفظ استعمال کیا ہے:

1 *Bible Knowledge Commentary*, p.855.
2 *Dummelow's Bible Com.*, p.363.
3 *Good News Bible*, p. 585.
4 *Gray & Adams Bible Com.*, 1:612.
5 *Matthew Henry's Exposition*, 4:324.
6 *New American Bible*, p. 615.
7 *New American Standard* B, p. 747.
8 *New Bible Commentary*, p. 472.
9 *New Bible Com. (Rvd)*, p. 504.
10 *N.Catholic Com.*, p.473, (Baka).
11 *New Commentary on Holy Scripture*, p.364.
12 NIV (*New International Version*), p. 621.
13 NKJV (in *Nelson Study Bible*), p. 966.
14 *New Oxford Annotated Bible*, p. 747.
15 *Paragraph Bible*, p. 621.
16 *Peake's Bible Com.*, p. 431.
17 *Readers Digest Bible*, p.306.
18 RSV (*Revised Standard Version*), p. 539.
19 TEV (*Todays English Version*), p. 607.
20 *Thompson's Bible.*, p. 666.
21 *7th Day Adventist Bible Com.*, 3:827.

'بکا' کے محل وقوع کے متعلق علمائے بائبل کی لاعلمی

حقیقت یہ ہے کہ بائبل کے اکثر علما یہ بات جانتے ہی نہیں کہ بکہ یا بکا کا محل وقوع کیا ہے اور وہ اس حقیقت کا برملا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے چند مستند علما کے نظریات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ 'کنٹمپریری انگلش ورشن' (صفحہ ۷۰۷) نے یہاں ایک ذیلی حاشیہ درج کیا ہے:

Dry Valley: Or 'Balsam Tree Valley.' The exact location is not known.

خشک وادی: یا 'بلسام کے درختوں کی وادی'۔ یقینی محل وقوع معلوم نہیں۔

۲۔ 'دی نیو امریکن بائبل' نے اس آیت پر ایک ذیلی حاشیہ درج کیا ہے:

Baca valley: Hebrew obscure; probably a valley on the way to Jerusalem.

وادی بکا: عبرانی مبہم ہے: غالباً یروشلم کے راستے میں ایک وادی۔

۳۔ 'دی جیروم تفسیر بائبل' (صفحہ ۵۹۱) نے آیات ۷-۸ کو ملا کر ان پر ایک ذیلی حاشیہ دیا ہے:

A description of the pilgrim's journey. The MT is uncertain.

حاجی کے سفر کا بیان۔ مسورائی متن غیر یقینی ہے۔

۴۔ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ لغات بائبل' نے اس لفظ کی قدرے مفصل تشریح بیان کی ہے۔ وضاحت کے اختتام پر وہ اس کی غیر یقینی حیثیت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا:

Baca (baka). [Heb. Baka, possibly 'balsam tree.'] The name of a valley in Palestine (Ps 84:6), possibly so named because balsam trees grew there. Some have thought that it is another name for the Valley of Rephaim, where trees of that species were found, but this is pure conjecture. There were doubtless many valleys in which balsam trees grew. Another interpretation names it the valley of 'weeping' from the Hebrew bakah, 'to

weep,' a word that differs only slightly from baka. However, neither interpretation helps to identify this place.[33]

(بکا)۔ [عبرانی بکا، بلکہ غالباً 'بلسام کا درخت'] ۔ فلسطین کی ایک وادی کا نام ۔ (مزمور ۶:۸۴)۔ غالباً اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ وہاں بلسام کے درخت اُگتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وادیٔ رفائیم کا دوسرا نام ہے۔ جہاں اس قسم کے درخت پائے جاتے ہیں، لیکن یہ محض ظن و تخمین ہے۔ بلاشبہ وہاں ایسی بہت سی وادیاں تھیں جن میں بلسام کے درخت اگتے تھے۔ ایک اور تاویل کے مطابق اس کا نام عبرانی لفظ بکا یعنی رونا سے وادیٔ گریہ و بکا بنا ہے۔ یہ لفظ بکا سے صرف خفیف حد تک مختلف ہے، تاہم کوئی تاویل بھی اس مقام کی نشان دہی میں مددگار ثابت نہیں ہوتی۔

۵۔ 'دی نیو آکسفرڈ اینوٹیٹڈ بائبل' (صفحہ ۷۴۷) نے آیات ۵-۷ کے حواشی میں لکھا ہے:

Baca, some unknown, desolate place through which the pilgrims must go.

بکا، کوئی نامعلوم اور بے آباد جگہ جس میں سے زائرین (حاجیوں) کو گزرنا پڑتا تھا۔

۶۔ 'دی ہارپر ز بائبل ڈکشنری' نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے:

Baca [bay'kuh], unidentified valley associated with weeping or balsam [Ps. 84:6]. The term is derived from the verb 'to drip,' hence its association with weeping.[34]

بکا، غیر متعین وادی جو، یا تو رونے سے متعلق ہے، یا بلسام سے (مزمور ۶:۸۴)۔ یہ لفظ ٹپکنے سے ماخوذ ہے اور یہی اس کو رونے سے منسلک کرنے کا باعث ہے۔

۷۔ ڈبلیو سمتھ اپنی 'تفسیر بائبل' میں اگر چہ اسے فلسطین کی ایک وادی قرار دیتا ہے، لیکن تاہم اُس کی مندرجہ ذیل توضیح سے اُس کی بے یقینی صاف ظاہر ہے:

That it was a real locality is most probable from the use of the definite article before the name.[35]

یہ بات کہ یہ کوئی حقیقی مقام تھا، اس بنا پر ممکن دکھائی دیتا ہے کہ اس نام سے پہلے لام تعریف استعمال کیا گیا ہے۔

۸۔ کولنز کی *Gem Dic. of the Bible* میں بھی اس کے متعلق ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا

ہے:

It may simply be a valley in Palestine (Ps. 84,6). It may simply be the Valley of the balsam trees, or it may be the Valley of Weeping (Heb. Bakah) or the Valley of little water.[36]

ہوسکتا ہے کہ یہ محض فلسطین کی کوئی وادی ہو (مزمور ۸۴:۶)۔ یہ سادہ الفاظ میں بلسام کے درختوں کی وادی ہوسکتی ہے یا یہ گریہ وبکا کی وادی ہوسکتی ہے (عبرانی بکہ) یا بہت ہی تھوڑے سے پانی کی وادی۔

۹۔ جے ہیسٹنگز کی Dic. of the Bible Revised One Vol. میں اس کی مشکوک حالت کی طرف اس طرح اشارہ ہے:

An allegorical place-name, found only in Ps. 846 (AV, RSV), where RV renders 'Valley of Weeping.' Most probably it is no more an actual locality than is the 'Valley of the Shadow of Death' in Ps 234.[37]

تمثیلی انداز میں ایک جگہ کا نام، جو صرف مزمور ۸۴:۶ میں ملتا ہے (RSV, AV)۔ اس مقام پر RV کا ترجمہ ہے 'گریہ وبکا کی وادی'۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہ مزمور ۲۳:۴ میں 'موت کے سائے کی وادی' کی طرح کوئی حقیقی جگہ نہیں۔

۱۰۔ اے۔ ایس اگلن 'ہیسٹنگز لغت بائبل' میں اپنے مقالے 'بکا' میں اس وادی کے متعلق غیر یقینیوں کے علاوہ کوئی چیز بھی دریافت نہیں کرسکا ہے:

If an actual valley (the article is not quite conclusive), it may be identified either with 'the valley of Achor, i.e. trouble'; 'the valley of Rephaim'; a Sinaitic valley with a similar name (Burckhardt); or the last station of the caravan route from the north to Jerusalem.

Perseverance and trust not only overcome difficulties, but turn them into blessings; this is the lesson, whether the valley be real or only (as the Vulg. Vallis lacrymarum has become) an emblem of life.[38]

اگر یہ کوئی واقعی وادی ہے (مقالے میں اس کے متعلق کوئی قطعی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکا ہے)، تو یا تو اس کی 'وادی اخور یعنی مصیبت کی وادی' کے طور پر نشان دہی کی جاسکتی ہے؛ یا 'وادی رفائیم' کے طور پر؛ یا صحرائے سینا کی اسی نام کی کسی وادی کے طور پر (برک ہارٹ)؛ یا پھر یہ شمال سے یروشلم کی طرف

آنے والے کاروانوں کا آخری پڑاؤ ہو سکتی ہے۔

صبر واستقلال اور اعتماد کے ذریعے سے نہ صرف مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے، بلکہ ان کے ذریعے سے انھیں نعمتوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں یہی سبق مضمر ہے، خواہ یہ وادی کوئی حقیقی وادی ہو یا محض علامتِ حیات۔

۱۱۔ ڈبلیو ایچ مارٹن بھی تقریباً انھی خیالات کا حامل ہے۔ وہ 'انٹر پریٹرز بائبل ڈکشنری' میں اپنے مقالے 'بکا' میں لکھتا ہے:

No valley of such a name has yet been identified, (….). In the same vein, it is quite possible that the valley was entirely symbolic.[39]

ابھی تک اس طرح کے نام کی کسی وادی کی نشان دہی نہیں کی جا سکی، (...)۔ اسی انداز میں یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ یہ وادی کلیتاً علامتی ہو۔

۱۲۔ ڈاکٹر فرانٹس بہل (Dr. Frants Buhl of Copenhangen Univ.) اور ڈاکٹر موریس جسٹراؤ (Dr. Morris Jastrow of Univ. of Pennsylvania) نے بیان کیا ہے:

(…); but it signifies rather any valley lacking water.[40]

(...)؛ بلکہ یہ کسی ایسی وادی کی نشان دہی کرتا ہے جس میں پانی نہ ہو۔

۱۳۔ 'اے نیو کمنٹری اون ہولی سکرپچر' کو بھی اس بات کا یقین نہیں کہ وادی بکا کسی جگہ مل سکتی ہے:

Baca was the name of some valley [Note the air of uncertainty regarding the location of the valley!] on the way to the city.[41]

بکا کسی وادی کا نام تھا [ملاحظہ کیجیے کہ وادی کے محل وقوع کے متعلق کیسی غیر یقینی کی فضا پائی جاتی ہے] جو شہر کے راستے میں واقع تھی۔

پیک (Peake) کی تفسیر بائبل کا بیان ہے:

The valley of Baca ; this rendering is better than 'valley of weeping' (LXX, RV). The location of the valley is unknown. Baca may mean 'balsam tree', which grows in dry soil. The point at all events seems to be that the valley is arid.[42]

وادیٔ بکا: یہ ترجمہ 'رونے کی وادی' (ہفتادی ترجمہ اور نظر ثانی شدہ ترجمہ) سے زیادہ بہتر ہے۔ اس وادی کا محل وقوع معلوم نہیں۔ بکا کے معنی 'بلسام کا درخت' بھی ہو سکتے ہیں جو درخت خشک زمین میں اگتا ہے۔ بہر صورت اہم نقطہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ وادی خشک تھی۔

مندرجہ بالا معلومات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ بائبل کے علما وادی بکا کے ٹھیک ٹھیک محل وقوع کے متعلق کوئی یقینی دعویٰ نہیں کر سکتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حرمِ یروشلم کی زیارت سے ہٹ کر اس کا کسی اور جگہ سے تعلق قائم کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یا تو وہ یہ بات فراموش کر چکے ہیں یا اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں کہ:

۱۔ یہ مزمور حضرت داؤد علیہ السلام نے لکھا ہے۔

۲۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی میں یروشلم میں ایسا کوئی حرم سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔

۳۔ اس مزمور کی زبان اور زلیف سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت داؤدؑ یہاں کسی ایسے حرم کا ذکر کر رہے ہیں جو عملی طور پر کہیں نہ کہیں موجود ہے۔

۴۔ حضرت داؤد علیہ السلام بڑے جذباتی انداز میں اس حرم کی زیارت کا شوق ظاہر کر رہے ہیں، لیکن کیونکہ یہ ان کی حدودِ سلطنت سے باہر ہے، اس لیے وہ یہاں حاضری دینے سے قاصر ہیں۔

اگر بائبل کے علما نے اس مزمور کے واضح الفاظ اور منشا کو نظر انداز نہ کیا ہوتا اور اگر انھوں نے اس مقام کی نشان دہی کی مخلصانہ کوشش کی ہوتی تو وہ بڑی آسانی سے اس کا محل وقوع دریافت کر لیتے۔

'بکہ' کا حقیقی محل وقوع

یہ بات متفقہ طور پر تسلیم شدہ ہے کہ عبرانی بائبل میں متعلقہ مقام پر اصلی لفظ بکا ہے۔ سیاق و سباق اس بات کی صریح دلالت کر رہے ہیں کہ یہاں یہ اسم معرفہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور بائبل کے اکثر تراجم میں اس کی یہی حیثیت برقرار رکھی گئی ہے۔ بعض تراجم اس کی اصل حیثیت کا ادراک نہیں کر سکے اور انھوں نے اسے اسم معرفہ کے بجائے ایک عام سا لفظ سمجھ لیا ہے۔ اور پھر انھوں نے من مانے طریقے پر مندرجہ ذیل مختلف معنی دے دیے ہیں: رونا، آنسو، بلسام کا درخت، شہتوت، کوئی اور درخت، خشک وادی وغیرہ۔ یہ سب ایک غلط کاوش ہے اور کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔

عبرانی لفظ بکا تین حروف تہجی ب + ک + الف سے مرتب ہے۔ 'سٹرونگز ڈکشنری' کے مطابق اس کے معنی ہیں:

> 'weeping'[43] or 'the weeping tree (some gum-distilling tree, perhaps the balsam,):-mulberry tree.'[44] . 'Bakah' is also composed of three alphabetical letters = (b+k+h), meaning 'to weep; gen. to bemoan, to bewail, complain, mourn, with tears, weep'[45]

رونا یا 'رونے والا درخت (کوئی گوند والا درخت، جیسے شاید بلسام کا درخت)، شہتوت کا درخت'۔ 'بکہ' بھی تین حروف تہجی ب+ک+ہ سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں: 'رونا، عام طور پر آہیں بھرنا، آہ وزاری کرنا، شکایت کرنا، ماتم کرنا، آنسوؤں کے ساتھ رونا'۔

جہاں تک اس کے استعمال کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ بَکّہ دراصل مَکّہ کا قدیم نام تھا۔ شروع میں یہ اسی لفظ بَکّہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔[46] ذیل میں لفظ بکہ کے لغوی معانی کی وضاحت کے لیے عربی کے چند مستند حوالے درج کیے جاتے ہیں۔

اٹھارہ جلدوں میں عربی زبان کی ایک مشہور لغت 'لسان العرب' میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

قال یعقوب: بَكّةُ ما بين جبلي مَكّة لأن الناس يبكُّ بعضهم بعضًا في الطواف أي يَزْحَمُ؛ (...) وقيل: بَكة اسم بطن مَكّة سميت بذلك لازدحام الناس. وفي حديث مجاهد: من أسماء مَكّةَ بَكّةُ، قيل: بَكّةُ موضع البيت ومكّةُ سائر البلد، وقيل: هما اسما البلدة، والباء والميم يتعاقبان.[۲۷]

یعقوب کہتا ہے: بَکّہ وہ ہے جو مکّے کے دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، کیونکہ لوگ طواف کے دوران میں یہاں ایک دوسرے کو کچل دیتے تھے یا یہاں بہت زیادہ ہجوم ہو جاتا تھا۔ (...)۔ کہا جاتا ہے کہ بَکّہ اندرون مَکّہ کا نام ہے اور اسے یہ نام لوگوں کی وہاں بہت بھیڑ ہو جانے کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ مجاہد کی روایت میں بیان کیا گیا ہے: 'بَکّہ مَکّہ کے ناموں میں سے ہے' اور کہا جاتا ہے: 'بَکّہ خانۂ خدا کا محل وقوع ہے اور مکّہ پورے شہر کا نام ہے۔' یہ بھی کہا گیا ہے [بَکّہ اور مَکّہ] دونوں ہی اس شہر کے نام ہیں اور 'ب' اور 'م' [حروف ابجد] ایک دوسرے کی جگہ آتے ہیں۔

(سولہ جلدوں کی) 'تهذيب اللغة' عربی زبان کی ایک انتہائی قابلِ اعتبار لغت ہے۔ اس میں اس وضاحت کے سلسلے میں لکھا ہے:

قال الليث: البكّ: دقّ العنق. ويقال سُمّيت مكّة بكّة لأنها كانت تَبُكُّ أعناق الجبابرة إذا ألحدُوا فيها. ويقال: بل سُمّيت بكّة لأن الناس يَبُكُّ بعضهم بعضًا في الطُّرق، أي يدفع. عمرو عن أبيه: بَكَّ الشيءَ أي فسخه؛ ومنه أخذت بكّة لأنها كانت تبكُّ أعناق الجبابرة إذا ألحدُوا فيها. ويقال: بل سُمّيتْ بكة لأنّ الناسَ يبكُّ بعضُهم في الطُّرق. (...). قيل: انّ بَكّةَ موضع البيت، وسائرُ ما حوله مكّة. قال: (الزجاج) والاجتماع أنّ مكّة وبكّة الموضع الذي يحجُّ الناسُ إليه، وهي البلدة. (...). وقال (الزجاج): (للّذي ببكّة مباركًا). فأمّا اشتقاقه في اللغة فيصلح أن يكون الأسم اشتق من بكّ الناسُ بعضهم في الطواف، أي دفع بعضهم بعضًا. وقيل: انما سُمّيت بكّة لأنها تبكُّ أعناق الجبابرة.[۲۸]

اللیث لکھتا ہے: 'البك' کے معنی ہیں گردن توڑنا۔ کہا جاتا ہے کہ مکّے کا نام بکّہ اس لیے پڑ گیا تھا کہ جب کوئی ظالم سیدھے راستے سے انحراف کرتا تھا تو وہ اُس کی گردن توڑ دیتا تھا۔ اور یہ کہا جاتا

ہے کہ بکے کا نام بکہ اس لیے رکھا گیا تھا، کیونکہ یہاں لوگ راستوں میں ایک دوسرے کو کچل دیتے تھے یا دھکے دیتے تھے۔ عمرو اپنے والد سے روایت کرتا ہے: 'بك الشيء'، یعنی اُسے توڑ دیا یا اُس کے جوڑ الگ کر دیے اور اسی سے لفظ بکہ ماخوذ ہے، کیونکہ جب کوئی شخص یہاں حد سے تجاوز کرتا تھا تو یہ ایسے ظالموں کی گردنیں توڑ دیتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے بکہ کا نام اس وجہ سے دیا گیا، کیونکہ اس کی راہوں میں لوگ ایک دوسرے کو کچل دیتے تھے۔ (...)۔ زجاج کہتا ہے: 'کہا جاتا ہے کہ بکہ حرم کا محلِ وقوع ہے اور جو کچھ اس کے اردگرد ہے، وہ مکہ ہے'۔ وہ (زجاج) کہتا ہے: اور اس بات پر اتفاقِ رائے ہے کہ مکہ اور بکہ وہ مقام ہیں جہاں لوگ حج کے لیے آتے ہیں، اور یہ شہر ہے۔ (...) اور وہ (زجاج) کہتا ہے: اور جہاں تک اس کے لغوی اشتقاق کا تعلق ہے تو یہ کہنا مناسب ہوگا کہ 'لوگ طواف میں ایک دوسرے کو کچل دیا کرتے تھے یعنی ایک دوسرے کو دھکے دیا کرتے تھے'۔ اور کہا جاتا ہے کہ بکہ کو یہ نام اس لیے دیا گیا تھا، کیونکہ یہ ظالموں کی گردنیں توڑ دیتا تھا۔

'معجم الوسیط' میں ہے: 'بکّہ یعنی مکّہ'۔[۴۹]

'الصحاح' میں وضاحت کی گئی ہے:

وبَكَّةُ: اسم بطن مكة، سُمِّيتْ بذلك لازدحام الناس. ويقال سُمِّيتْ لأنها كانت تَبُكُّ أعناق الجبابرة.[۵۰]

بکّہ مکّہ کے اندرونی حصے کا نام ہے۔ اس کا یہ نام اس لیے پڑا تھا کیونکہ اس میں لوگوں کا بہت ہجوم ہو جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا تھا کیونکہ یہ بڑے بڑے ظالموں کی گردنیں توڑ مروڑ دیتا تھا۔

'ترتیب القاموس المحیط' نے بھی 'بکّہ' کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی ہے:

ومنه بَكَّةُ لمَكَّة، أو لما بين جَبَلَيْها. أو لِلْمَطَافِ لِدَقِّها أعناق الجَبابِرَة، أو لازْدِحامِ الناسِ بها.[۵۱]

بکّہ یا تو مکّہ کے لیے استعمال ہوتا ہے یا جو کچھ مکّہ کے دو پہاڑوں کے درمیان ہے، اس کے لیے ہے یا مطاف کے لیے، کیونکہ یہ مغروروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے یا اس وجہ سے کہ اس میں

لوگوں کا بہت ہجوم ہوتا ہے۔

'محیط المحیط' بھی عربی لغات میں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ فیروز آبادی کی مشہور لغت 'القاموس المحیط' کی نظر ثانی شدہ اور ترقی دادہ صورت ہے۔ اس نے بھی اس لفظ کی اسی طرح وضاحت کی ہے:

بكة لغة في مكة أو اسم ما بين جبليها أو للمطاف قيل سميت بذلك لدقها اعناق الجبابرة أو لازدحام الناس بها[۵۳]

یہ اس جگہ کا نام ہے جو مکہ کے دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے یا مطاف کا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کیونکہ یہ متکبروں کی گردنیں توڑ دیتا تھا یا اس لیے کہ وہاں لوگوں کا بہت ہجوم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک عربی الفاظ کے بنیادی مادوں کا تعلق ہے 'معجم مقاییس اللغه' ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اس لفظ کی تشریح مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

قال الخليل: 'البَكّ' دقّ العنق، ويقال سميت بكة لأنها تَبُكُّ أعناق الجبابرة، اذا ألحدُوا فيها بظُلمٍ لم يُنظَرُوا، ويقال بل سُمِّيَتْ بَكّةُ لأنّ النّاس بعضُهم يبُكُّ بعضًا في الطُّواف، أي يدفع.[۵۳]

الخلیل کہتا ہے 'البك یعنی گردنیں کچلنا یا توڑنا'۔ اور کہا جاتا ہے کہ بکہ کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کیونکہ یہ ظالموں کی گردنیں کچل دیتا تھا۔ جب وہ ظلم کی طرف مائل ہوتے تو وہ منظر سے ہٹا دیے جاتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا نام بکہ اس لیے پڑا کیونکہ لوگ طواف کے دوران میں ایک دوسرے کو کچل دیتے تھے یا پرے دھکیل دیتے تھے۔

الخلیل بن احمد (۱۰۰-۱۷۵ ہجری) عربی لغات کے سب سے زیادہ مستند محققین میں سے ایک ہے۔ عربی زبان کی اولین لغت 'کتاب العین' اسی کی ترتیب دی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے:

البَكُّ: دَقُّ العُنُق. وسُمِّيَتْ مَكّةُ: بكّة، لأنّ النّاس يبُكُّ بعضهم بعضًا في الطّواف، [أي]: يدفع

بعضهم بعضًا بالازدحام. ويقال: بل سُمّيت، لأنّها كانت تَبُكّ أعناق الجبابرة اذا ألحدوا فيها بظُلم.[54]

البك یعنی گردن کچل دینا۔ مکہ کا نام بکہ اس لیے رکھا گیا کیونکہ لوگ طواف کے دوران میں ایک دوسرے کو کچل دیا کرتے تھے یا ہجوم کی وجہ سے ایک دوسرے کو پرے دھکیل دیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کیونکہ یہ ظالموں کی گردنیں کچل دیتا تھا جب وہ زمین میں ظلم کے ذریعے سے راہِ حق سے انحراف کرتے تھے۔

'اخبار مکہ' عربی زبان میں چھ جلدوں میں مکہ کی ایک مفصل تاریخ ہے۔ ذیل میں 'اسماء مکہ' نامی اس کی فصل سے چند اقتباسات نقل کیے گئے ہیں:

وقال لي رجل من أهل مكة، وأعطاني كتابًا عن أشياخه، فاذا فيه أسماء مكة، فيما زعم المكيون. والله أعلم. قالوا: هي مكة، وبكة، وبَرّة، بَسّاسه، أمّ القُرىٰ، الحَرَم، المسجد الحَرام، والبَلَد الامين. (...). وقالوا من أسمائها صلاح. (...). وقال بعض المكيين: من أسمائها [كوثى].[55]

مکہ کے کسی باشندے نے مجھے اپنے آباواجداد میں سے کسی کی لکھی ہوئی ایک کتاب دی۔ اس میں مکہ کے وہ نام بیان کیے گئے تھے جن کے متعلق مکہ کے باشندوں کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کے نام ہیں، یعنی مکّہ، بکّہ، برّہ، بَسّاسہ، اُمّ القُریٰ، الحَرَم، المسجد الحَرام اور البَلَد الامین۔ (...)۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے ناموں میں سے 'صلاح' بھی ایک نام ہے۔ (...)۔ بعض مکے والوں کا دعویٰ ہے کہ 'کوثی' بھی اس کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

مکتوب في أسفل المقام: أنا الله ذو بكة حرمتها يوم خلقت السموات والأرض.[56]

'المقام' کے نیچے لکھا ہے: میں اللہ ہوں، بکہ کا رب۔ میں نے اسے اس دن مقدس قرار دیا جب زمین وآسمان وجود میں لائے گئے۔

قرآن نے اس مقام کے نام کے لیے مکہ اور بکہ، دونوں الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جب اس کا ذکر قدیم زمانے کے ایک مقام کے طور پر کیا گیا ہے تو اس کا نام 'بکہ' لیا گیا ہے، جیسا کہ

قرآن کی تیسری سورت میں آیا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ . فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا .[57]

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ، جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی، وہ وہی ہے جو مکّہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ عبادت ہے، اور اُس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا، مامون ہوگیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے۔

قرآن میں وہ دوسرا موقع جہاں یہ لفظ آیا ہے، سورۃ الفتح ہے۔ یہاں یہ لفظ نبی اکرم ﷺ کے عہد کے پس منظر میں بیان ہوا ہے:

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا.[58]

وہی ہے جس نے مکے کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ اُن سے روک دیے، حالاں کہ وہ اُن پر تمھیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے، اللہ اُسے دیکھ رہا تھا۔

یہاں اس کا ذکر مکے کے نام سے ہوا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس کا نام 'مکّہ' ہی رائج تھا۔

حروفِ تہجی 'ب' اور 'م' کا مخرج (آواز کا سرچشمہ) ایک ہی ہے یعنی ہونٹ۔ اس طرح یہ بات عین قرینِ قیاس ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ لفظ بکّہ نے مکّہ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ کا اصلی اور قدیم نام بکّہ ہی تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہی قدیم نام استعمال کیا، کیونکہ ان کے زمانے میں اس شہر کا یہ نام زیادہ رائج تھا جو بعد کی صدیوں میں بدل کر لفظ 'مکّہ' کی شکل اختیار کر گیا۔

بائبل کی متعلقہ آیت میں ہے: 'وادیٔ بکا میں سے گزرتے ہوئے وہ اس میں ایک کنواں

بناتے ہیں۔' حضرت ہاجرہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش کے دوران میں وادئ بکا میں سے گزر رہی تھیں، جس کے نتیجے میں انھیں ایک کنواں (بیر سبع یا زم زم) دیا گیا تھا۔ جن لوگوں کو اس وادئ بکہ کی زیارت کا موقع ملا ہے، وہ یہ بات خوب جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ ایک نشیبی علاقے میں واقع ہے۔ سابقہ ادوار میں جب یہاں زوردار بارش ہوتی تھی تو یہ جگہ ایک تالاب کی سی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ اب وہاں ایک نہایت جدید نکاسئ آب کا نظام تعمیر کر دیا گیا ہے اور بارش کا پانی وہاں سے تیزی کے ساتھ بہ جاتا ہے۔ اس طرح اس آیت کا ہر جز مکہ کے زمینی حقائق پر پوری طرح منطبق ہے۔

آیت ۷ میں بیان ہے: 'وہ قوت سے قوت کی طرف جاتے ہیں' یہ الفاظ زائرین (حجاج کرام) کے جوش و جذبہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ جوں جوں وہ حرم کعبہ کے قریب سے قریب تر پہنچتے ہیں تو ان کے جوش و جذبے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، جو انھیں تھکاوٹ کے بجائے نئی قوت اور جوش و جذبہ بخشتا ہے۔

آیت کا دوسرا جملہ ہے: 'ان میں سے ہر ایک صیہون میں خداوند کے حضور ظاہر ہوتا ہے' یا، جیسا کہ NIV میں بیان ہے، 'یہاں تک کہ ہر ایک صیہون میں خداوند کے حضور نمودار ہوتا ہے'۔ اس طرح یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ لفظ صیہون کا قدرے تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔

جہاں تک اس کے معنی کا تعلق ہے 'انسائیکلوپیڈیا ببلیکا' کا بیان ہے:

Various explanations of the name have been given. Gesenius (Thes. 1164) and Lagarde (Ubers. 84. n) derive from [a Hebrew word meaning] 'to be dry.' (...) Wetzstein derives from 'to protect,' so that the name would mean 'arx, citadel'; cp Zin.[59]

اس لفظ کی متعدد توضیحات بیان کی گئی ہیں۔ Gesenius اور Lagarde اسے ایک ایسے عبرانی لفظ سے ماخوذ قرار دیتے ہیں جس کے معنی ہیں خشک ہونا۔ (...) Wetzstein اسے حفاظت کرنا سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح اس لفظ کے معنی ہوں گے 'ایک قلعہ'۔

'انٹر پریٹرز بائبل ڈکشنری' میں وضاحت ہے:

The etymology of the name is uncertain. It may be related to the Hebrew (sayon), "dry place" , "parched ground" (Isa. 25:5; 32:2).[60]

اس نام کا اشتقاق غیر یقینی ہے۔ اس کا تعلق عبرانی لفظ صیہون سے ہو سکتا ہے جس کے معنی ہیں: 'خشک جگہ'، 'جھلسی ہوئی زمین'۔

ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ 'خشک جگہ' یا 'جھلسی ہوئی زمین' کا اطلاق صرف مکہ کی بے آب و گیاہ سرزمین ہی پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اطلاق یروشلم کی سرسبز و شاداب زمین پر کسی طرح ممکن نہیں۔

بائبل میں آنے والے دوسرے ناموں کی طرح 'صیہون' کے بھی ایک سے زیادہ مفہوم ممکن ہیں۔ یہ بات عین قرین قیاس ہے کہ ایک صیہون مکہ کا ہو اور دوسرا یروشلم کا، لیکن 'خشک جگہ' یا 'جھلسی ہوئی زمین' کے مفہوم کے لحاظ سے موجودہ سیاق و سباق میں اس کا اطلاق صرف مکہ ہی پر کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ کتاب کے مصنف کے لیے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ یہاں اس پر تفصیلی گفتگو کرے، تاہم یہ بات انتہائی قابل توجہ ہے کہ اس وقت یروشلم میں کوئی حرمِ مقدس موجود نہ تھا، اس لیے یہاں یروشلم کے کسی صیہون کا مفہوم کسی طرح ممکن نہیں۔ مزمور کا بقیہ حصہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس شدید خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ کاش انھیں بھی دوسرے زائرین کی طرح حرمِ الٰہی کی زیارت کا موقع نصیب ہو۔

روایات اور تاریخی واقعات کا ماضی میں جتنا پیچھے جا کر جائزہ لیا جائے، اُس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ سرزمین موریا (مکہ کی ایک پہاڑی) کے علاقے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے حقیقی اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے لیے پیش کیے جانے کی یادگار زمانہ قدیم سے منائی جا رہی ہے، لیکن قوم یہود یا مسیحیوں میں کوئی ایک بھی ایسی جگہ یا رسم یا تہوار یا نشانی یا عمارت نہیں جہاں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کرنے کے کسی واقعے کی کوئی یادگار مناتے ہوں۔ اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ کوئی معروضی نتیجہ اخذ کرے۔

اس باب کے بغور مطالعے سے مندرجہ ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں 'قوموں کے خداوند کا کوئی گھر' پہلے سے موجود تھا۔

۲۔ یہ ایک مقدس حرم تھا اور دور و نزدیک سے بکثرت حجاج کرام اس کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔

۳۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس جگہ ایک قابلِ لحاظ مدت تک کے لیے قیام پذیر رہے تھے۔

۴۔ یہ حرم مقدس وادی بکہ میں واقع تھا۔

۵۔ اپنے وطن واپس جانے کے بعد انھیں بعض اسباب کی بنا پر اس حرمِ مقدس کی زیارت کا موقع نصیب نہیں ہوا تھا۔

۶۔ انھوں نے اس حرمِ مقدس کی زیارت کے لیے اپنی شدید خواہش کا اظہار کیا۔

۷۔ وہ ان پرندوں پر رشک کا اظہار کرتے ہیں جو بے روک ٹوک اس حرمِ مقدس میں اپنے آشیانے بناتے اور وہاں رہتے ہیں۔

۸۔ انھیں خداوند کے اس گھر سے اتنی عقیدت ہے کہ اپنے وطن میں، جسے وہ اس حرمِ مقدس کے مقابلے میں برائی اور مکاری کی سرزمین قرار دیتے ہیں، رہنے کے مقابلے میں اس 'بیت اللہ' کی دربانی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

۹۔ اُن کے خیال میں 'خداوند کے دربار' میں ایک دن بسر کرنا کسی اور جگہ ایک ہزار دن کے قیام سے بہتر ہے۔

۱۰۔ یہودیوں کا حرمِ مقدس (یعنی ہیکلِ سلیمانی) اس وقت تک معرضِ وجود ہی میں نہ آیا تھا۔ یہ تو اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے حضرتِ سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا۔ اُس وقت تک صرف مکہ مکرمہ کا خانہ کعبہ ہی موجود تھا جو اُن کے بزرگ آبا ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام نے قریباً دس صدیاں پہلے تعمیر کیا تھا اور پورا سال لاکھوں عقیدت منداس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔

حواشی باب یازدہم

۱ جہاں تک اس مزمور کی تالیف کا تعلق ہے، اسے پورے اطمینان سے بذاتِ خود حضرت داؤد علیہ السلام کی حقیقی تالیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں بعض مستند علما کی آرا درج کی گئی ہیں۔ میتھیو ہنری (Matthew Henry) 'پرانے اور نئے عہد نامے کی تفسیر' (۳۲۴:۴) کے مقدمے میں رقم طراز ہے:

Though David's name be not in the title of this song, yet we have reasons to think he was the penman of it, because it breathes so much of his excellent spirit and is so much like the sixty-third psalm which was penned by him; (...), witness this psalm, which contains the pious breathing of a gracious soul after God and communion with him.

اگرچہ اس مزمور کے عنوان میں داؤدؑ کا نام نہیں ہے، پھر بھی ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ وہی اس کے مصنف تھے، کیونکہ یہ ان کی عظیم الشان روح سے مطابقت رکھتا ہے اور بالکل تریسٹھویں مزمور سے مشابہ ہے جو اسی [حضرت داؤد علیہ السلام] کا لکھا ہوا ہے۔ (...)، اس مزمور کو پڑھ کر دیکھیں۔ اس میں ایک کریم روح اور تقویٰ کی آمیزش صاف جھلکتی ہے اور اپنے خداوند سے رشتۂ عبودیت استوار کرنے کا جذبہ موجزن ہے۔

'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' میں (۳: ۸۲۷ پر) اس مزمور کے متعلق مقدمے میں تحریر ہے:

Ps 84 was composed by David, the Lord's "anointed"(...). It is a passionate lyrical expression of devotion and love for the house of Jehovah and His worship. The psalm seems to describe the blessedness of those who dwell in the sacred precincts (vs. 1-4, 9-11); the blessedness of those who make pilgrimages to the sanctuary (vs. 5-8).

مزمور ۸۴ خداوند کے مسوح داؤدؑ کی تالیف ہے۔ (...)۔ یہ اللہ تعالیٰ کے گھر اور اس کی عبادت کے لیے لگن اور محبت کا نظم کے انداز میں جذباتی اظہار ہے۔ اس مزمور سے ان لوگوں کے خوش نصیب اور بابرکت ہونے کے بیان کا اظہار ہوتا ہے جو اس کی مقدس حدود میں رہائش پذیر ہیں (آیات ۱-۴، ۹-۱۱)۔ اس سے ان لوگوں کے بابرکت ہونے کا اظہار بھی ہوتا ہے جو اس حرم کی زیارت سر انجام دیتے ہیں (آیات ۵-۸)۔

'پیک (Peake) کی تفسیر بائبل' (صفحہ ۴۳۱) میں درج ہے:

The period of its composition is clearly that of the monarchy.

اس کی تالیف کا زمانہ واضح طور پر (متحدہ) شہنشاہیت کا دور ہے۔

ان چند اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ بائبل کے مفسرین اسے بذاتِ خود حضرت داؤد علیہ السلام کی تحریر قرار دیتے ہیں۔

۲۔ یہاں 'لشکروں یا گروہوں کا خداوند' کے الفاظ سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ وہ صرف اسرائیل کا خداوند نہیں ہے، بلکہ تمام قوموں کا پروردگار ہے۔

۳۔ یہاں عبرانی کا جو اصل لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ ہے 'مشکان'، جو عربی کے لفظ 'مسکن' یعنی جائے رہائش کا بعینہٖ مترادف ہے۔ سٹرونگ کی محولہ بالا ڈکشنری (اندراج ۴۹۰۸، صفحہ ۷۴) کے مطابق اس کے معنی ہیں:

a residence; dwelling (place), habitation.

رہائش: (جائے) رہائش، آبادی۔

اس طرح 'تیرا خیمہ عبادت اے رب الافواج' کے لفظی معنی ہوں گے: 'اے قوموں کے خداوند تیرا گھر'۔ عربی میں اسے 'بیت اللہ' کہا جائے گا جو مکہ کا الکعبہ ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہیکل سلیمانی ابھی تک تعمیر نہیں ہوا تھا، اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ صرف مکے کے خانہ کعبہ سے متعلق ہے، کیونکہ اُس وقت تک روئے زمین پر اس کے علاوہ کوئی 'خداوند کا گھر' موجود نہ تھا۔

۴۔ 'گرے اینڈ ایڈمز کی تفسیر بائبل' میں (۲:۶۱۱ پر) وضاحت کی گئی ہے:

David says not, Oh how I long for my palace, my crown, my sceptre, my kingdom; but oh how I long to return to the house of God' [the word 'return' shows that King David had previously been to this place.]

داؤدؑ یہ نہیں کہتے کہ 'میں اپنے محل، اپنے تاج و تخت، اپنے عصائے اقتدار، اپنی سلطنت کی آرزو میں کتنا بے تاب ہوں'۔ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں: 'میں اپنے خداوند کے گھر میں واپس جانے کے شوق میں کتنا بے چین ہوں!' [لفظ 'واپس جانے' سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ پہلے بھی اس جگہ ہو آئے تھے]۔

تاہم یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام

کے عہد تک صرف ایک ہی خانۂ خدا موجود تھا جو بکہ میں [اس وقت مکہ کا نام بکہ ہی تھا]، ان کے آباؤ اجداد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔

۵۔ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' (۳:۸۲۸) پر اس آیت کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے:

The general meaning of the verse, whose conclusion the poet only implies, is that even the birds have free access to the sacred precincts of the sanctuary, they make their homes there undisturbed, while the psalmist is exiled from the source of his joy, is denied the privilege of worshipping within the sacred enclosure. The nostalgic appeal of this verse is one of the most delicately beautiful expressions of homesickness in the whole realm of literature.

اس آیت کے، جس کا انجام شاعر محض ضمناً بیان کرتا ہے، عمومی معنی یہ ہیں کہ اس حرمِ مقدس کی حدود میں پرندے تک رسائی رکھتے ہیں اور وہ بغیر کسی خلل کے اپنے گھر بناتے ہیں، جبکہ مصنفِ زبور اپنے سرچشمۂ مسرت سے خارج البلد ہے اور وہ اس مقدس چار دیواری کی حدود میں عبادت کے استحقاق و اعزاز سے محروم ہے۔ اس آیت کی حسرت بھری آرزو عالمی ادب میں اپنے گھر سے دوری اور مجبوری کے انتہائی حسین و نازک طرزِ اظہار کی ایک بہترین مثال ہے۔

۶۔ 'نیو آکسفرڈ اینوٹیٹڈ بائبل' (NOAB) میں صفحہ ۷۴۷ پر آیات ۳-۴ کے سلسلے میں ایک خوبصورت حاشیہ درج ہے:

Envy of the birds and servitors [a male servant] who live there.

پرندوں اور ان خادموں پر رشک جو وہاں رہتے تھے۔

'کالج ولا تفسیر بائبل' صفحہ ۲۷۷ میں ان آیات ۳-۴ کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ بھی قابل ملاحظہ ہے:

All living things are safe from threat in the presence of the Lord.

خداوند کے حضور میں تمام زندہ چیزیں دھمکی یا خطرے سے محفوظ ہیں۔

۷۔ میتھیو ہنری کی 'عہد نامہ قدیم و جدید کی تفسیر' (۴: ۳۲۴-۳۲۵) نے اس نکتے کی مندرجہ ذیل وضاحت کی ہے:

He would rather live in a bird's nest nigh God's altars than in a palace at a distance from them. It is better to be serving God in solitude than serving sin with a multitude. (...). Observe, David envies the happiness not of those birds that flew over the altars, and had only transient view of God's courts, but of those that had

nests for themselves there. David will not think it enough to sojourn in God's house as a way-faring man that turns aside to tarry for a night; but let this be his rest, his home; here he will dwell.

وہ اس بات کو زیادہ ترجیح دے گا کہ خداوند کی قربان گاہ کے قرب وجوار میں کسی گھونسلے میں رہائش اختیار کرلے، بہ نسبت اس کے کہ اس سے دور ہو کر کسی محل میں رہے۔ یہ بہتر ہے کہ تنہائی میں رہ کر خدا کی عبادت کی جائے، بہ نسبت اس کے کہ ہجوم میں رہ کر گناہ کی خدمت بجالائی جائے۔ (...)۔ ملاحظہ کیجیے کہ داؤد ان پرندوں کی مسرت پر رشک نہیں کرتے جو قربان گاہوں کے اوپر سے ہو کر گزر جائیں اور خداوند کے ایوانوں کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ پائیں، بلکہ ان پرندوں کی مسرت پر رشک کرتے ہیں جو وہاں اپنے لیے مستقل آشیانے بنا کر ان میں رہتے ہیں۔ داؤد کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ خانۂ خدا میں ایک ایسے راہ گیر انسان کی طرح تھوڑی دیر قیام کرلیں جو شب بسری کے لیے راستہ چھوڑ کر آرام کرتا ہے، بلکہ خانۂ خدا کو اس کا مستقر اور مستقل ٹھکانا ہونا چاہیے جہاں وہ رہائش اختیار کرے۔

۸ انگریزی 'کنگ جیمز ورشن' میں اصل عبارت یہ ہے: 'They will be "still" praising thee.'

گرے اور آدم کی تفسیر بائبل (۶۱۱:۲) کے مطابق یہاں 'still' کے معنی 'All the Day long' یعنی 'سارا دن' ہیں۔

۹ NIV صفحہ ۶۲۱ میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے: 'they are ever praising you' یعنی 'وہ ہمیشہ تمھاری حمد بیان کر رہے ہیں'۔ بجائے اس کے کہ یہ ترجمہ کیا جائے: 'they will be still praising thee.' یعنی 'وہ ابھی تک تیری تعریف کر رہے ہوں گے'۔

۱۰ 'نیو کیتھولک کومنٹری' (صفحہ ۴۷۳) میں اس آیت کا ترجمہ ہے:

Blessed [be] those who dwell in thy house, still they praise thee.

مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ ابھی تک تیری تعریف بیان کرتے ہیں۔

اس میں مزید درج ہے:

Yet the idea of 'They are pilgrims at heart' is consistent with the theme of the psalm.

پھر بھی 'وہ دل سے زیارت کے لیے آئے ہیں' کا نظریہ مزمور کے مضمون سے مناسبت رکھتا ہے۔

۱۱ NIV صفحہ ۶۲۱ نے اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے: 'who have set their hearts on pilgrimage'.

'جنھوں نے اپنے دل میں حج وزیارت کی لو لگائی ہے'، بجائے اس ترجمے کے کہ 'in whose heart are the ways of them.' یعنی 'جن کے دل میں ان کی راہیں ہیں'۔

۱۲ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' (۸۲۸:۳) پر اس آیت کی یہ تشریح کی گئی ہے:

The second blessing is bestowed on those who hold God in their hearts as they make the pilgrimage.

دوسری برکت ان کو عطا کی گئی ہے جو حج کی ادائیگی کے وقت خداوند کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں اردو ترجمے میں جو لفظ 'صیون' لکھا ہے (نیز بعض انگریزی تراجم میں بھی، مثلاً 'نیو اوکسفرڈ اینوٹیٹڈ بائبل' ایڈیشن سوم نے صفحہ ۸۴۹ پر اور *Praise Songs of Israel: Rendering of the Book of Psalms: 26 Translations of the OT Books of Poetry* نے صفحہ ۳۳۴ پر لکھا ہے: 'In whose heart are the highways to Zion.' یعنی 'جن کے دل میں صیہون کی شاہراہیں ہیں'، لیکن نیچے حاشیے میں یہ بھی لکھ دیا ہے: 'Heb. lacks *to Zion*') تو اکثر وبیشتر انگریزی تراجم میں یہ موجود نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اصل عبرانی عبارت میں بھی اس کا کوئی وجود نہیں حتیٰ کہ کیتھولک اردو بائبل 'کلامِ مقدس' میں بھی نہیں۔ اس کے برعکس اس میں حج کا مفہوم موجود ہے۔ لکھا ہے: 'جب اس کے دل میں زیارت کا خیال ہے (کلامِ مقدس، روما ۱۹۵۸ء، صفحہ ۷۳۹)'۔ اسی طرح 'دی ہولی بائبل مشتمل بر عہد نامہ قدیم وجدید، این امپرووڈ ایڈیشن' (امیریکن بپٹسٹ پبلیکیشنز سوسائٹی بحوالہ '*The OT Books of Poetry from 26 Translations*, 1973, p.334') میں ترجمہ ہے:

In their heart the pilgrim-ways.

یعنی 'اُن کے دل میں ہیں حج کی راہیں'۔ 'نیو انگلش بائبل' میں ہے (صفحہ ۳۴۴): 'whose hearts are set on the pilgrim-ways!' یعنی 'جن کی نظریں حج کی راہوں پر لگی ہیں'۔ 'اے نیو ٹرانسلیشن آف دی بائبل' (James Moffatt, *A New Translation of the Bible* (London: Hadder and Stoughton, Ltd., at St.Paul's House, 1941) میں صفحہ ۳۳۴ پر ہے: 'Set out on pilgirmage.' یعنی 'حج کے لیے چل پڑے ہیں'۔ 'نیو انٹرنیشنل ورشن' (NIV) میں ہے: 'Who have set their hearts on pilgrimage.' یعنی 'جنھوں نے اپنے دلوں میں حج کی لو لگائی ہے'۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مزمور ۸۴ کا اصل موضوع 'حج' ہی ہے۔

'کنٹمپریری انگلش ورشن' (CEV) نے صفحہ ۷۰۷ پر اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

You bless all who depend on you for their strength and all who deeply desire to visit your temple.

تم ان سب پر برکت نازل کرتے ہو جو اپنی قوت کے لیے تم پر بھروسا کرتے ہیں اور جو تمھارے ہیکل کی زیارت کی شدید آرزو رکھتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جگہ بھی 'حج' ہی کا ذکر ہے۔ اور 'صیہون' کا لفظ یہاں سراسر غلط مبحث ہے۔

۱۳ 'میتھیو ہنری کی تفسیر' (۳۲۶:۴) نے اس جگہ اس رائے کا اظہار کیا ہے:

Our way to heaven lies through a valley of Baca, but even that may be made a well if we make due improvement of the comforts God has provided for the pilgrims of the heavenly city.

ہمارا جنت کا راستہ ایک وادی بکا میں سے ہو کر گزرتا ہے، لیکن وہاں بھی ایک کنواں بنایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ہم ان آسائشوں کی ترقی کا فریضہ سرانجام دیں جو خداوند نے اس شہرِ جنت کے زائرین (حاجیوں) کے لیے فراہم کی ہیں۔

۱۴ 'گرے اور آدم کی تفسیر' ۲: ۶۱۲ پر وضاحت کی گئی ہے:

To such a one, whose soul is athirst for God, the valley of Baca becomes a well, while the hot rock pours out its streams of blessing.

جب گرم اور سنگلاخ چٹان سے اس کی برکت بھری ندی پھوٹ بہتی ہے تو وادی بکا ایسے شخص کے لیے، جس کی روح خداوند کی پیاسی ہے، ایک کنواں بن جاتی ہے۔

ان الفاظ میں زائرین مکہ کے ذہن کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔

۱۵ پشیتا (Peshitta) بائبل صفحہ ۶۲۸ میں ہے:

They have passed through the valley of weeping [the word 'weeping' shows that the actual word here was 'Baca', because its meaning, if not taken as a proper noun, is 'weeping'], and have made it a dwelling place; the Lawgiver shall cover it with blessings.

وہ رونے کی وادی میں سے گزر کر آئے ہیں [لفظ 'رونا' ظاہر کرتا ہے کہ یہاں اصل عبرانی لفظ 'بکا' ہے، کیونکہ اگر اسے اسمِ معرفہ قرار نہ دیا جائے تو اس کے معنی رونا ہی بنتے ہیں] اور اسے جائے رہائش بنا لیا

ہے۔ شارع اسے برکت سے ڈھانپ دے گا۔

۱۶ بائبل میں اس مقام پر جو اصل عبرانی لفظ استعمال ہوا ہے، وہ ہے 'حایل'۔ 'سٹرونگز ڈکشنری' (اندراج ۲۴۲۸، صفحہ ۳۹) کے مطابق اس کے معنی ہیں: 'ایک فوج، قوت، آدمیوں کا دستہ، کمپنی'۔ اس کا مطلب ہوا: 'وہ جوق در جوق آتے ہیں'، جیسا کہ مکے میں حجاج و زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

۱۷ 'صیون' اصلاً ایک بامعنی لفظ ہے اور اس کا مادہ 'صِیَہ' ہے۔ 'سٹرونگز ڈکشنری' میں اندراج ۶۷۲۳، صفحہ ۹۹ کے تحت اس کے معنی ہیں:

to Parch; concretely a desert; - barren, dry (land, place), wilderness, solitary place.

جھلسنا؛ عملی طور پر ایک صحرا: بنجر، خشک (علاقہ یا جگہ)، صحرا و بیابان، ویران اور غیر آباد جگہ۔

اس لحاظ سے اس کا اطلاق کسی جھلسی ہوئی، بنجر، خشک جگہ یا صحرا ہی پر ہو سکتا ہے، جیسا کہ مکہ ہے۔ یروشلم جیسی کسی سرسبز و شاداب جگہ پر اس کا اطلاق درست نہیں۔

The Hebrew and Aramaic Lexicon of the O.T (۱۰۲۳:۲) پر 'صیون' کے معنی ہیں: 'Barren place, bare hill'۔ اردو میں اس کا مطلب ہے: بنجر جگہ، بے آب و گیاہ پہاڑی۔

'انسائیکلوپیڈیا ببلیکا' (۵۴۲۱:۴) میں 'صیون' کے ضمن میں درج ہے:

Gesenius and Lagarde derive from [a Hebrew word which means] 'to be dry.'. (....) It may be better however, to add zion to group Zin, Zenan, and Zoan, and to suppose Zion to be a descendent of the race-name 'Ishmael' through the intermediated form Zibeon.

جسینیس اور لیگارڈے اسے ایک عبرانی لفظ سے ماخوذ قرار دیتے ہیں جس کے معنی ہیں: 'خشک ہونا'۔ (....)، تاہم بہتر یہ ہوگا کہ صیہون کو زین، زینان اور زوآن کے گروپ میں شامل کیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ صیہون 'زیبون' کی درمیانی حالت کے واسطے سے نسلی نام 'اسماعیل' کی اولاد سے متعلق ہے۔

نیز ملاحظہ کیجیے اوپر حاشیہ ۱۲۔

۱۸ 'گرے اور آدم کی تفسیر' (۶۱۳:۲) میں وضاحت کی گئی ہے:

The poet would rather be the humblest of the guests of Jehovah than dwell at

ease among the heathen.

شاعر کہتا ہے کہ وہ مشرکوں کے ساتھ عیش کی زندگی گزارنے پر اس بات کو ترجیح دے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حقیر ترین مہمان بن کے زندگی گزارے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر (حضرت داؤد علیہ السلام) 'خانۂ خدا' کو کس قدر عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

۱۹ پشیتا (Peshitta) میں صفحہ ۶۲۸ پر اس جگہ مندرجہ ذیل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

For the Lord God is our supply and our helper;

کیونکہ خداوند خدا ہمارا مددگار اور ہمیں وسائل مہیا کرنے والا ہے۔

۲۰ کتابِ مقدس، زبور ۸۴۔

۲۱ کلامِ مقدس، مطبوعہ سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۷۳۹۔

۲۲ انگریزی میں یہاں 'Servitor' کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'مرد ملازم' (چیمبرز انگلش ڈکشنری، ۱۹۸۹ء، صفحہ ۱۳۴۵)

23. *The 7th Day Adventist Bible Com.*, 3:828.

24. *Smith's Bible Dictionary*, p.138.

25. The Bilbe: KJV-I Sam, 25:1.

۲۶ کتابِ مقدس، کتابِ پیدائش ۲۱: ۱۷-۲۱۔

27. 'From the Psalms in the *Book of Common Prayer of the Anglican Church*' (as quoted by *OT Poetry 26 Translations*, p. 334).

28. James Moffatt, *A New Trans. of the Bible*, quoted in *OT Poetry 26 Tr*, p. 334).

29. *New English Bible*, p. 441.

۳۰ 'ہفتادی' (Septuagint or 'LXX') جس کے معنی ہیں ستر کا ترجمہ۔ ستر اُن علما کی تعداد ہے جنھوں نے ترجمے کا یہ کام سرانجام دیا تھا۔ یہ بائبل کے مسوراتی متن (MT, i.e., Massoretic Text) کا یونانی ترجمہ ہے، جو تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح کے دوران میں اسکندریہ میں کیا گیا تھا۔

۳۱ 'ولگیٹ' (Vulgate) کا مطلب ہے عام۔ یہ بائبل کے اس لاطینی ترجمے کا نام ہے جو سینٹ جیروم

(St Jerome) نے کیا تھا۔ یہ قریباً ۴۵۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ اسے 'ولگیٹ' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسے قبولیتِ عامہ حاصل ہوگئی تھی۔

32. *The 7th Day Adventist Bible Com.*, 3:828.

33. *7th Day Adventist Bible Dic. Revised. Ed.*, p. 114.

34. *Harper's Bible Dic.*, p. 89.

35. William Smith, *A Dic. of the Bible*, p. 73.

36. Rev. James L. Dow, *Collins Gem Dic. of the Bible*, p. 54.

37. *J. Hasting's Dictionary of the Bible Revised One Vol. Edn.*, p. 84.

38. J. Hastings, *A Dictionary of the Bible*, 1:230.

39. *Interpreter's Dic. of Bible*, 1:338.

40. *Jewish Encyclopaedia* 2:415.

41. *A New Commentary on Holy Scripture*, p. 364.

42. *Peake's Com. of Bible*, p. 431.

43. *Strong's Dic. of the Hebrew Bible*, p. 21, entry No. 1056.

44. *Strong's Dic. of the Hebrew Bible*, p. 21, entry No. 1057.

45. *Strong's Dic. of the Hebrew Bible*, p. 21, entry No. 1058.

۴۶ ملاحظہ کیجیے آگے حاشیہ ۵۷-۵۸۔

۴۷ ابن المنظور، 'لسان العرب' (بیروت: دار صادر، ۱۳۰۰ھ)، ۱۰:۲۰۲۔

۴۸ ابو منصور محمد بن احمد الأزہری، 'تہذیب اللغة' (القاہرہ: الدار المصریہ للتألیف والترجمہ، بن ندارد)، ۹:۲۶۳-۲۶۴۔

۴۹ 'المعجم الوسیط' (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۹۷۲ء)، ۱:۶۷۔

۵۰ اسماعیل بن حماد الجوہری، 'تاج اللغة وصحاح العربية' (بیروت: دار العلم للملایین، ۱۹۸۴ء)، ۴:۱۵۷۶۔

۵۱ الاستاذ الطاہر احمد الزاوی، 'ترتيب القاموس المحيط على طريقة المصباح المنير' (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۷۹ء)، ۱:۳۰۸۔

۵۲ المعلم بطروس البستانی، 'محيط المحيط' (بیروت، مکتبہ لبنان ناشرون، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۵۰۔

۵۳۔ احمد بن فارس، 'معجم مقاییس اللغۃ' (بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۲۰۰۱ء)، صفحہ ۹۲۔

۵۴۔ الخلیل بن احمد، 'کتاب العین' (بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۲۰۰۱ء)، صفحہ ۸۴۔

۵۵۔ الامام ابی عبداللہ محمد بن اسحاق الفاکہی، 'اخبار مکہ فی قدیم الدہر و حدیثہ'، (مکہ، مکتبہ النہضۃ الحدیثہ، ۱۹۸۷ء) ۲:۲۸۲ و بعد۔

۵۶۔ 'اخبار مکہ فی قدیم الدہر و حدیثہ'، ایضاً، صفحہ ۲۹۳۔

۵۷۔ قرآن کریم، سورۃ آل عمران ۳:۹۶ و بعد۔

۵۸۔ قرآن کریم، سورۃ الفتح ۴۸:۲۴۔

59. *Enc. Biblica*, 4:5421.

60. *The Interpreter's Dic. of Bible*, 4:959.

ضمیمہ ۱

بیر سبع

(سات کا کنواں یا زم زم)

کتاب کے متن میں بیر سبع کا متعدد مرتبہ حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ موضوع ایک تفصیلی مطالعہ کا متقاضی تھا، لیکن متنِ کتاب میں اس کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ اس ضمیمے میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اشخاص و اماکن کے ناموں کے ہجے بالعموم وہی نقل کیے گئے ہیں جو بائبل یا متعلقہ مآخذ میں درج ہیں۔ اقتباسات میں ہجے اور حرکاتی علامات کی وہ اسکیم اختیار نہیں کی گئی ہے جو کتاب کے شروع میں منسلک ہے، بلکہ عام طور پر وہی اسکیم اختیار کی گئی ہے جو اصل اقتباسات میں اختیار کی ہوئی تھی۔ اس ضمیمے کے اہم نِکات درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ان کی والدہ حضرت ہاجرہ سمیت اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت 'بیر سبع کے بیابان'، 'فاران کے بیابان'، یا 'موریا' (زم زم، الحجاز، المروہ) میں آباد کیا تھا، لیکن اس میں حضرت سارہ کے کسی حسد یا حضرت ہاجرہ اور سارہ کے درمیان کسی تنازعے کا کوئی دخل نہ تھا۔

(۲) حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کی بیر سبع کے مقام پر آبادکاری کا واقعہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بچپن میں اس وقت رونما ہوا تھا، جبکہ ابھی تک حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ دودھ چھڑانے والی ضیافت اور حضرت سارہ کا نام نہاد حسد اور ان کے حضرت ہاجرہ پر نام نہاد شرم ناک مظالم محض ایک افسانہ ہے۔

(۳) یہ بات ہر گز قرین قیاس نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دروازے سے باہر دھکا دے کر بغیر کسی راہنمائی کے کس مپرسی کی حالت میں نکال باہر کیا ہو۔ ایسی ظالمانہ حرکت کی توقع تو کسی عام شریف آدمی سے بھی نہیں کی جا سکتی، کجا کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول پر یہ تہمت لگائی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ منزلِ مقصود پر اپنے ساتھ خود چھوڑ کر آئے تھے۔

(۴) بیر سبع ایک بامعنی لفظ ہے اور اس کے دو معنی ہیں: (۱) سات کا کنواں اور (۲) عہد یا حلف کا کنواں۔

(۵) بائبل کے ریکارڈ کے مطابق بیر سبع کا محلِ وقوع ایک سے زیادہ مقامات پر ہونا چاہیے۔ بائبل میں یہ لفظ چونتیس مقامات پر آیا ہے، لیکن اس کے شروع میں 'بیابان' کا وصف صرف ایک ہی مقام پر درج ہے۔

(۶) بیر سبع سے پہلے 'بیابان' کے وصف کا یہ واحد استعمال، 'سات کے کنوئیں والے بیر سبع' کو، باقی ماندہ بیر سبعوں سے بالکل ممتاز کر دیتا ہے۔ اس سے 'سات کے کنویں' کا محلِ وقوع ٹھیک مکے کا علاقہ قرار پاتا ہے۔

(۷) اس سیاق و سباق میں بیر سبع صریحاً اس چشمے کی دلالت کرتا ہے جو حضرت ہاجرہ کے پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سات چکروں کے نتیجے میں انھیں [ہاجرہ کو] عنایت فرمایا گیا تھا۔

(۸) اس طرح یہ 'بیر سبع' مکے کا چاہِ زم زم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۹) یہ 'بیر سبع' (سات چکروں کے نتیجے میں ملنے والا چاہِ زم زم) اس 'بیر سبع' یعنی حلف کے کنوئیں سے بالکل مختلف ہے، جو کنعان کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔

(۱۰) اس سلسلے میں بائبل میں جو قصہ بیان ہوا ہے، وہ مختلف روایتوں کا مجموعہ ہے اور اس میں بڑی مقدار میں قابلِ اعتراض اور متناقض مواد شامل ہے، اس لیے اس کا کوئی بیان بھی محتاط تنقیدی جائزے کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بیابانِ بیر سبع، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جہاں اُن کے چھوڑ کر چلے جانے کے بعد حضرت ہاجرہ اپنے بچے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ گھومتی رہیں، اس کا 'کتاب مقدس' میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے (اس عبارت سے متعلق بیش تر اہم نِکات کی موقع ہی پر ذیلی حواشی میں قدرے تفصیلی وضاحت کردی گئی ہے۔ اس مضمون کے متن میں ان نِکات پر دوبارہ کسی تفصیلی بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اس لیے ان ذیلی حواشی کو بائبل کے متن کے ساتھ موقع ہی پر توجہ سے دیکھ لیا جائے):

> اور وہ لڑکا بڑھا اور اُس کا دودھ چھڑایا گیا[۳] اور اضحاق کے دودھ چھڑانے کے دن ابرہام نے بڑی ضیافت کی۔ اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا[۴] جو اُس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے[۵]۔ تب اُس نے ابرہام سے کہا اِس لونڈی[۶] کو اور اس کے بیٹے[۷] کو نکال دے[۸]، کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق[۹،۱۰] کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ پر ابرہام کو[۱۱] اُس کے بیٹے کے باعث[۱۲] یہ بات نہایت بُری معلوم ہوئی۔ اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے[۱۳] اور اپنی لونڈی[۱۴] کے باعث برا نہ لگے۔ جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے، تُو اُس کی بات مان، کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا۔ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک [عظیم] قوم[۱۵] پیدا کروں گا، اس لیے کہ وہ تیری نسل[۱۶] ہے۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اُٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک[۱۷] لی اور اُسے ہاجرہ کو دیا، بلکہ اُسے اُس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اُس [ہاجرہ][۱۸] کے حوالے کر کے اُسے رخصت کردیا[۱۹]۔ سو وہ چلی گئی، اور بیر سبع کے بیابان[۲۰] میں آوارہ پھرنے لگی۔ اور جب مشک کا پانی ختم ہوگیا تو اُس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا[۲۱]۔ اور آپ اُس کے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دُور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اُس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلّا چلّا کر رونے لگی۔ اور خدا نے اُس لڑکے کی آواز سُنی[۲۲] اور خدا کے فرشتے[۲۳] نے آسمان سے[۲۴] ہاجرہ کو پکارا اور اُسے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟[۲۵] مت ڈر[۲۶] کیونکہ خدا نے اُس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اُس کی آواز سن لی ہے[۲۷]۔ اُٹھ اور لڑکے کو اُٹھا اور اُسے اپنے ہاتھ سے سنبھال[۲۸]، کیونکہ میں اُس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اُس کی آنکھیں

کھولیں اور اُس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا[۲۹]۔ اور خدا اُس لڑکے کے ساتھ تھا[۳۰] اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا۔ اور وہ فاران[۳۱] کے بیابان میں رہتا تھا اور اُس کی ماں نے ملکِ مصر سے اُس کے لیے بیوی لی[۳۲]۔

اس بیابانِ بیر سبع سے متعلق کچھ اہم نکات کی تشریح ذیل میں دی گئی ہے:

(الف) بیابانِ بیر سبع کا محلِ وقوع متعین کرنے کے سلسلے میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بائبل کی کتابِ پیدائش کا باب ۲۱، جس سے مندرجہ بالا بیان ماخوذ ہے، تین مختلف روایات و مآخذ (Yahwistic, Priestly, and Elohistic) کا ایک پیچیدہ سا آمیزہ ہے[۳۳]۔

(ب) جہاں تک مذکورہ بالا عبارت (کتاب پیدائش ۲۱:۸-۲۱) کا تعلق ہے، یہ ساری کی ساری الوہسٹ (Elohist) روایت سے تعلق رکھتی ہے[۳۴]۔ یہ بنیادی طور پر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قصے کا بیان ہے جو آیت ۲۱ پر ختم ہو جاتا ہے۔ آیت ۲۲ سے باب کے اخیر تک ایک دوسرا قصہ ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شاہ ابی ملک کے درمیان کسی دوسرے بیر سبع [حلف کا کنواں] کے بارے میں کسی معاہدے سے متعلق ہے۔ یہ بالکل ایک الگ بیان ہے اور اس کا حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں جو (سات کے کنوئیں والے) بیر سبع کے نزدیک رونما ہوا تھا۔ علمائے بائبل کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ اِلُوہسٹ (Elohist) روایت سے متعلق ہے یا یہوسٹ (Yahwist) روایت سے[۳۵]۔

(ج) بیر سبع کا لفظ بائبل میں چونتیس مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ پوری بائبل میں صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں اس سے پہلے بیابان کا وصف لگایا گیا ہے (کتاب پیدائش ۲۱:۱۴)۔ بائبل کے مطابق یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور اس کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آباد کیا تھا اور یہ پہلا مقام ہے جہاں لفظ بیر سبع پوری بائبل میں پہلی دفعہ متعارف ہوا ہے۔ اسی طرح پوری بائبل میں یہ وہ واحد مقام ہے جہاں بیر سبع کا لفظ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام دونوں کے حوالے سے آیا ہے۔ وہ بیر سبع جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شاہ ابی ملک کے درمیان

معاہدے سے متعلق ہے، اس سے ایک بالکل مختلف مقام ہے۔ جو اس سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر واقع ہے اور جس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

(د) 'بیابان' کا مطلب ہے: 'غیر مزروعہ، بنجر، ناہموار اور پہاڑی سرزمین یا صحرا'۔ یہ لفظ بائبل میں مجازاً 'غیر آباد' کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے، اگرچہ یہ اس کے لغوی معنی نہیں ہیں۔ بائبل میں بیابان کے لیے جو اصل عبرانی لفظ استعمال ہوا ہے، وہ 'مدبار' ہے۔ انگریزی بائبل میں اس عبرانی لفظ مدبار کا ترجمہ یا تو لفظ 'Wilderness' (بیابان) سے کیا گیا ہے اور یا لفظ 'Desert' (صحرا) سے۔ بائبل میں اس لفظ 'مدبار' کا 'غیر مزروعہ اور غیر آباد مقام' کے مفہوم میں استعمال کتاب یسعیاہ کے اس جملے سے ظاہر ہے:

Yet the defenced city shall be desolate, and left like a wilderness [in Hebrew 'midbar']

'تاہم قلعہ بند اور محفوظ شہر اجاڑ ہوگا[36] اور ایک بیابان کی طرح چھوڑا ہوا۔'[37]

بائبل میں یہ لفظ کچھ دوسرے مفہوم ادا کرنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ سٹینلے اے کک (Stanley A. Cook) 'انسائیکلوپیڈیا ببلیکا' میں واضح کرتا ہے:

The English word 'desert' ordinarily means a sterile sandy plain without vegetation and water-a 'sea of sand' such as, e.g., parts of the Sahara. This is not the meaning of the Hebrew word. No desert of this kind was known to Israel either before or after the occupation of Canaan. (...) midbar; AV 'desert,' RV 'wilderness'; (...). It is commonly employed to denote the wilderness of wanderings, which itself is a mountainous region, (...). The most prominent is that which was the scene of the wandering of Israel. It is commonly called ham-Midbar; (...), and with this agrees the circumstance that it is only in the later writings that the horror and lonesomeness of the 'wilderness' is referred to (e.g., Dt. 8:15).[38]

انگریزی زبان کے لفظ 'ڈیزرٹ' کے معنی بالعموم ایک بنجر، ریتلے میدان کے ہوتے ہیں جہاں نہ کوئی سبزہ ہو اور نہ پانی -- ایک ریت کا سمندر، جیسے مثلاً صحرا [صحرائے اعظم] کے بعض حصے -- اصلی عبرانی لفظ کے یہ معنی نہیں ہیں۔ بنی اسرائیل اس طرح کے کسی صحرا سے نہ کنعان پر قبضہ سے پہلے آشنا تھے نہ اس کے بعد۔ (...)۔ مدبار کے لیے AV (کنگ جیمز ورشن) میں 'صحرا' کا لفظ ہے اور

R.V (نظر ثانی شدہ ورشن) میں 'بیابان' کا۔ (...)۔ عام طور پر اس کا اطلاق بنی اسرائیل کی صحرانوردی پر کیا جاتا ہے، جو بذات خود ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ (...)۔ بنی اسرائیل کی صحرانوردی سے متعلق مدبار بہت اہم ہے جسے عام طور پر حام مدبار کہا جاتا ہے۔ (...)، اور یہ صورت بھی اس سے مطابقت رکھتی ہے کہ یہ محض بعد والی تحریریں ہی ہیں جن میں بیابان کی خوفناکی اور تنہائی کا حوالہ ہے (مثلاً کتاب استثنا ۸:۱۵)۔

عہد نامہ قدیم میں (کنگ جیمز اور نظر ثانی شدہ انگریزی تراجم کے مطابق) انگریزی لفظ 'Wilderness' دو سو ستر (۲۷۰) مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس میں سے '۲۵۶' مرتبہ یہ لفظ 'مدبار' کے ترجمے کے طور پر آیا ہے۔ عبرانی بائبل (عہد نامہ قدیم) میں اس مفہوم کے لیے مختلف الفاظ ہیں (مثلاً مدبار، عربہ، یشی مون، توہو، خرابہ، سراب وغیرہ)۔ بیابان اور صحرا کے لیے جو لفظ سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے، وہ 'مدبار' ہی کا لفظ ہے اور اس مفہوم میں یہ عہد نامہ قدیم میں '۲۶۹' مرتبہ آیا ہے۔ (۲۵۶ مرتبہ بیابان کے معنی میں اور ۱۳ مرتبہ صحرا کے معنی میں)۔ بیابان کے لیے ایک اور عبرانی لفظ 'عربہ' ہے، جو مختلف معانی میں '۵۹' مرتبہ استعمال ہوا ہے (۵ مرتبہ بیابان کے معنی میں اور ۸ مرتبہ صحرا کے معنی میں وغیرہ)۔ 'عربہ' کا یہ لفظ ایک بنجر اور غیر زرخیز زمین کا مفہوم دیتا ہے۔ ملک عرب کا نام پڑنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ اس لفظ بیابان کے لیے متعدد مرتبہ دوسرے عبرانی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں (مثلاً توہو، یشی مون وغیرہ)۔ یہاں اس عبارت میں جو لفظ استعمال ہوا ہے، وہ 'مدبار' ہے۔

اس کی تشریح شمریاہو تالمون (shemaryahu Talmun) پروفیسر بائبل اسٹڈیز اور ڈین فیکلٹی آف ہومینٹیز، عبرانی یونیورسٹی، یروشلم نے اپنے مقالے 'Wilderness' میں کی ہے۔ اُن کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے:

(...) to arid or semiarid areas which are not suited for permanent settlement but in part can be utilized as pasture lands for small stock. (....). In the majority of occurrences, 'wilderness' carries negative overtones, referring to parched, inhospitable, and dangerous places. (....). No trees or

other vegetation grow in this barren void, and no husbanded animals or civilized men live there. Anyone who ventures into this wilderness suffers hunger and thirst. (...). This wilderness is synonymous with utter distress, a place cut off from life. (...). The Mesopotamian, for which Arabian desert lay to the W, where the sun sets, identified the wilderness as the area which leads to the nether [in a lower place or position] world. This idea appears to be reflected in scriptures in which midhbar, `arabha, semama contrast with the Garden of Eden, the source of life and abundant growth .[39]

(اس کا تعلق) خشک یا نیم خشک علاقوں سے ہے جو مستقل رہائش کے لیے موزوں نہیں ہوتے، لیکن چھوٹے چھوٹے ریوڑوں کے لیے چراگاہ کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔ (...)۔ اکثر صورتوں میں بیابان منفی مفہوم کا حامل ہوتا ہے اور اس سے مراد جھلسے ہوئے ناخوش گوار اور خطرناک مقامات ہوتے ہیں۔ (...)۔ ایسے بنجر، ویران خطے میں نہ تو درخت یا دوسری سبزیاں اگتی ہیں اور نہ پالتو جانوروں کے ریوڑ یا مہذب انسان یہاں رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔ جو کوئی اس بیابان میں جانے کی جرأت کرے، اسے بھوک اور پیاس کی سختی جھیلنا پڑے گی۔ (...)۔ یہ بیابان مکمل تباہی کے مترادف ہے اور یہ ایک ایسی جگہ ہے جو زندگی سے بالکل کٹی ہوئی ہے۔ (...)۔ میسوپوٹیمیا کے لوگ، جن کے لیے صحرائے عرب مغرب میں واقع ہے جہاں سورج غروب ہوتا ہے، اس بیابان کو ایک ایسا خطہ قرار دیتے تھے جو نشیبی (ادنیٰ) دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ کی صحائف میں بھی عکاسی موجود ہے جہاں مِدبار، عربہ اور شامہ باغ عدن کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے جو زندگی اور فراواں نشوونما اور پیداوار کا سرچشمہ ہے۔

اسی لغتِ بائبل میں ڈبلیو۔ ایل ریڈ (W.L. Reed) کہتا ہے:

The translation of several different words [he has written here in Heb. script: Midbar, Yasheemon, `arabah, etc.]; often used interchangeably with "DESERT." An accurate translation is difficult, because the so-called wilderness regions included arid and semiarid territory as well as sandy desert, rocky plateaus, pasture lands, and desolate mountain terrain. Such regions existed in Canaan and beyond its E and S borders.[40]

بہت سے مختلف الفاظ کا ترجمہ [یہاں اس نے مِدبار، یشی مون، عربہ وغیرہ کے الفاظ عبرانی رسم الخط میں لکھے ہیں]: اکثر لفظ 'صحرا' [Desert] کے ساتھ ادل بدل کر استعمال ہوا ہے۔ بالکل

درست ترجمہ بہت مشکل ہے، کیونکہ یہ نام نہاد بیابانی علاقے خشک اور نیم خشک خطوں، ریتلے صحرا، چٹانی سطح مرتفع، چراگاہوں اور بے آباد پہاڑی پٹی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایسے خطے کنعان میں اور اس کی مشرقی اور جنوبی سرحدوں سے پرے موجود تھے۔

سمتھ (Smith) کی لغت بائبل میں ہے:

MIDBAR, (...). It is most frequently used for those tracts of waste land which lie beyond the cultivated ground,[41]

مدبار (...) یہ لفظ عام طور پر بے آباد زمین کے ان ٹکڑوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مزروعہ زمین سے ہٹ کر واقع ہوں۔

'ہارپر کی لغت بائبل' میں وضاحت کی گئی ہے:

Wilderness, a desolate or deserted area devoid of civilization. One Hebrew word above all others is used for "wilderness," or "desert," in the OT: midbar, indicating both "that which is desolate and deserted" and "that which is beyond," i.e., beyond the limits of settlement and therefore of government control, perceived by both city dwellers and villagers as being essentially disorderly and dangerous, the home of wild beasts and savage wandering tribes. In time of war or repression refugees would flee to the midbar; (....). Midbar was for them, as "wilderness" was originally in English, the wild, alarming wasteland, where men and women find themselves bewildered and disoriented.[42]

بیابان [Wilderness] ایک بے آباد اور ویران خطہ، جہاں تہذیب کا کوئی نام و نشان نہ ہو۔ عہد نامۂ قدیم میں بیابان یا صحرا کے لیے ایک عبرانی لفظ اس مفہوم کے دوسرے سب الفاظ سے زیادہ استعمال ہوتا ہے: اور وہ ہے: 'مدبار'۔ یہ لفظ 'وہ جو بے آباد اور اجاڑ ہے' اور 'وہ جو پرے ہے' یعنی آبادی کی حدود سے پرے اور اس لیے حکومت کے کنٹرول سے بھی بالا ہے، ان دونوں معانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شہری اور دیہاتی باشندے، دونوں ہی اسے بدنظمی کا شکار اور خطرناک سمجھتے ہیں جو وحشی جانوروں اور جنگلی آوارہ قبائل کا مسکن ہو۔ جنگ یا ظالمانہ اقتدار کے دنوں میں پناہ گزین اس مدبار کی طرف فرار ہو جاتے ہیں۔ (...)۔ جس طرح انگریزی کا لفظ 'Wilderness' بنیادی طور پر ایسی وحشی اور خطرناک اجاڑ زمین کے لیے آتا ہے جہاں مرد اور عورتیں اپنے آپ کو حیران و پریشان

اور بھٹکا ہوا محسوس کریں، اسی طرح ان (یہود) کے لیے مدبار کا لفظ تھا۔

اس کا مطلب ہے کہ لفظ 'مدبار' جو بائبل میں 'اُجاڑ بیابان' کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اس سے مراد ایک پہاڑی، ریتلا، بے آباد، نا قابل کاشت مقام ہے جو بیابانِ بیر سبع اور فاران سے کلی مشابہت رکھتا ہے۔

(ہ) بیر سبع[43] ایک بامعنی لفظ ہے، اس کے لغوی طور پر دو الگ الگ معنی ہیں: (۱) 'سات کا کنواں'[44] اور (۲) 'حلف یا عہد[45] کا کنواں'۔ وہ بیر سبع جو حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قصے سے آگے اس باب کی آیت ۲۲ میں شروع ہوتا ہے اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شاہ ابی ملک کے حلف سے متعلق ہے، وہ 'حلف کا کنواں' ہے اور اسی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا ہے۔[46]

(و) اس پیراگراف میں 'عہد کے کنویں' سے متعلق بیر سبع کا مطالعہ مقصود ہے۔ ذیل میں چند اہم اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے یہ دوسرے معنی ثابت ہوتے ہیں۔ ہیسٹنگز کی نظر ثانی شدہ ایک جلد والی بائبل ڈکشنری میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ ایک ایسا مقام تھا:

Where he [Abraham] made a covenant with Abimelech, from which the place is alleged to take its name ('well of the covenant," according to one interpretation).[47]

جہاں اس [حضرت ابراہیمؑ] نے شاہ ابی ملک سے ایک معاہدہ کیا تھا، جس سے، کہا جاتا ہے کہ، اس کا یہ نام پڑا۔ (عہد کا کنواں)

'جے ہیسٹنگز ڈکشنری آف بائبل' میں بیان کیا گیا ہے:

It (...) received its name ('Well of the oath') as having been the place, marked by a well, where Abraham entered into covenant with Abimelech, king of Gerar (Gn 21:31 E).[48]

اس کا (...) یہ نام (حلف کا کنواں) اس لیے پڑ گیا، کیونکہ یہ ایک ایسی جگہ تھی جس کی نمایاں بات ایک کنواں تھا جہاں [حضرت] ابراہیمؑ نے جرار کے بادشاہ ابی ملک کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا (پیدائش ۲۱:۳۱۔ اے)۔

میکنزی کے مطابق:

about 28 mi S [according to *the Interpreter's Dic. of the Bible* "SW" (1:375)] of Hebron;[49]

یہ حبرون سے تقریباً اٹھائیس میل جنوب ['انٹرپریٹرز ڈکشنری' کے مطابق جنوب مغرب] میں واقع ہے۔

حبرون (جسے اب الخلیل کہا جاتا ہے) یروشلم کے جنوب میں بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے[50]۔ یہ حبرون وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پہلی بیوی سارہ کے ساتھ مستقل رہائش اختیار کی تھی، لیکن وہ اپنا اکثر وقت اپنے کثیر التعداد ریوڑوں کے ساتھ بیر سبع میں اپنی اس زمین پر صرف کیا کرتے تھے جو انھیں ابی ملک نے پیش کی تھی (کتاب پیدائش ۲۰:۱۵)۔ بائبل کی ڈکشنریوں میں یہ بات تحریر ہے کہ یہ ریوڑوں کے لیے ایک بڑی مناسب چراگاہ تھی۔ مثلاً 'ہارپر کی بائبل ڈکشنری' میں ہے:

The Beer-sheba plain with its ample winter pasturage is well suited for seminomadic living; thus it served as the principal homestead of Israel's patriarchs.[51]

اپنی وسیع سرمائی چراگاہوں کی وجہ سے بیر سبع کا میدان نیم خانہ بدوشانہ زندگی کے لیے نہایت موزوں ہے، اس طرح اسرائیل کے بزرگ آبا کے لیے یہ ایک بڑے اہم زراعتی فارم کا کام دیتا تھا۔

ایف-ایف بروس کہتا ہے کہ یہ ایک سرسبز و شاداب وادی تھی جس میں گھاس بافراط تھا۔ اس میں چوتھا ہزارہ قبل مسیح میں بھی انسانوں کی آبادیاں موجود تھیں:

On both sides of the Beer-sheba valley, in the Negeb, there is evidence of human settlement going back to the Chacolithic Age (later fourth millennium BC). (....). The Beer-sheba valley and its neighborhood were frequented by pastoralists like Abraham because the water-table was sufficiently high to be tapped by the digging of wells.[52]

نجب میں وادی بیر سبع کے دونوں طرف تانبے کے عہد [Chacolithic Age] (چوتھا ہزارہ ق م کا آخری دور)، جیسے قدیم زمانے میں بھی انسانی آبادیوں کی شہادت موجود ہے۔ (...)۔ وادی

بیر سبع اور اس کے قرب و جوار میں ابراہیمؑ جیسے چرواہے اکثر آیا کرتے تھے، کیونکہ یہاں پانی کی سطح اتنی کافی حد تک بلند تھی کہ کنوئیں کھود کر پانی بآسانی نکالا جا سکتا تھا۔

'ہیسٹنگز ڈکشنری آف بائبل' میں ای ہل (E. Hull) اس کی موجودہ حالت بھی اسی انداز میں بیان کرتا ہے:

The soil in the valleys where there is some moisture is exceedingly rich, and is rudely cultivated by the fellahin, who succeed in producing fine crops of wheat and barley. In the tracts around Beer-sheba the Bedawin find ample pasturage for their flocks and herds, which towards evening assemble in crowds around the wells as they did three thousand years ago.[53]

جہاں کہیں کچھ نمی موجود ہے، وہاں اس وادی کی مٹی بہت زرخیز ہے اور کسان لوگ انتہائی سادہ انداز میں کاشت کرتے ہیں اور گندم اور جو کی بڑی عمدہ فصلیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بیر سبع کے ارد گرد کے علاقوں میں بدوی لوگوں کو اپنے ریوڑوں کے لیے وسیع چراگاہیں مل جاتی ہیں جو شام کے وقت اس طرح کنوؤں کے گرد ہجوم کی صورت میں اکٹھے ہو جاتے ہیں جس طرح وہ تین ہزار سال پہلے ہوا کرتے تھے۔

یہ اس 'بیابانِ بیر سبع' سے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آباد کیا تھا، بالکل مختلف جگہ تھی۔

(ز) جس 'بیابانِ بیر سبع' کا تعلق حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ہے، اُس کے متعلق تو ایک تفصیلی بیان اگلے پیراگراف میں درج ہے اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام والا یہ بیر سبع حقیقی معنی میں ایک بیابان تھا، کیونکہ یہ ایک ویران، پہاڑی، ریتلی، بنجر، ناہموار اور غیر مزروعہ زمین تھی۔ موجودہ پیراگراف میں 'حلف کا کنواں' سے متعلق چند باتیں مختصراً درج ہیں۔ یہ 'حلف کا کنواں' ایک خوب صورت وادی میں واقع تھا، جس میں گھنی سرسبز چراگاہیں تھیں۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اس جگہ چار ہزار سال قبل مسیح کی انسانی آبادیوں کی نشان دہی کی ہے۔ بائبل کے مطابق یہاں حضرت اسحاق علیہ السلام کے زمانے میں 'ایک شہر' موجود تھا (کتاب پیدائش ۲۶:۳۳)۔ اس طرح یہ وہ

جگہ نہیں ہو سکتی جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آباد کیا تھا اور جو ایک مدباریعنی بے آباد پہاڑی، ریتلی، ناہموار، غیر مزروعہ اور حقیقی معنی میں ایک بنجر بیابان تھی۔

(ح) پہلے مفہوم والے اس بیر سبع (سات کا کنواں[54]) کا، جو حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ سے متعلق ہے، اس پیراگراف میں ذکر کیا گیا ہے۔ قدیم زمانے میں کسی مقام کا نام یا تو وہاں کسی قبیلے کے آباد ہونے کی وجہ سے اس قبیلے کے نام پر رکھ دیا جاتا تھا، یا کسی ایسے اہم واقعے کے نام پر رکھ دیا جاتا تھا جو وہاں رونما ہوا ہو، یا اس مقام اور اس کے اردگرد کی بعض نمایاں خصوصیات کی بنا پر رکھ دیا جاتا تھا۔ ان دونوں بیر سبعوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ان دونوں مقامات کا، جنھیں بعد میں بیر سبع کا نام دیا گیا تھا، پہلے سے کوئی متعین نام نہ تھا۔ ان کا یہ نام وہاں رونما ہونے والے واقعات کی وجہ سے رکھا گیا۔ پہلے مقام کو بیر سبع (ایک حلف یا ایک عہد کا کنواں) اس لیے کہا گیا کیونکہ اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بادشاہ ابی ملک کے درمیان ایک حلف یا عہد و پیمان منعقد ہوا تھا۔ دوسرے مقام کو بیر سبع (سات کا کنواں) کا نام حضرت ہاجرہ کے صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرنے کی بنا پر دیا گیا تھا، کیونکہ اُن کی سعی کے ان سات چکروں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے کے ذریعے سے ان پر یہ چشمہ نمودار کروایا تھا۔ اس کنوئیں کو عرب کے لوگ عام طور پر 'زم زم' کے نام سے پکارتے ہیں۔[55] اسی وجہ سے اس 'سات کے کنوئیں' کے اردگرد والے غیر مزروعہ غیر آباد علاقے کو 'بیر سبع کے بیابان' کا نام دیا گیا۔

'شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' میں تحریر ہے:

Hadjar, cast off by Abraham and seeing Ishma'el perishing of thirst, ran in despair seven times from one hill to the other;[56]

ہاجرہ، جنھیں ابراہیم چھوڑ گئے تھے، نے [اپنے بیٹے حضرت] اسماعیلؑ کو پیاس سے ہلکان ہوتے دیکھا تو اُس نے مایوسی میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک دوڑ کر سات چکر لگائے۔

ڈیوڈ کر (David kerr) وضاحت کرتا ہے:

This [the circumambulation around the Ka'bah] is followed by running seven times between two small hills [al-Safa and al-Marwah], recalling the

plight of Hagar and her son Ishmael who, in Islamic, Jewish and Christian tradition, were saved from certain death by a spring of water which God caused to break through the desert sands. This well is named in Islamic tradition as Zamzam.[57]

اس [خانہ کعبہ کے گرد طواف] کے بعد دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں [الصفا اور المروہ] کے درمیان سات مرتبہ دوڑا جاتا ہے (یعنی سعی کی جاتی ہے)۔ یہ اس مصیبت کی یادگار ہے جو یہودی، مسیحی اور اسلامی روایت میں حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ کو اٹھانی پڑی تھی اور جنھیں پانی کے ایک چشمے کے ذریعے سے یقینی موت سے نجات نصیب ہوئی تھی جو اللہ تعالیٰ نے صحرا کی ریت میں سے ان کے لیے جاری کیا تھا۔ اسلامی روایات کے مطابق اس کنوئیں کا نام 'زم زم' ہے۔

چاہِ زم زم کے متعلق عربی و اسلامی لٹریچر اور بائبل میں بیان کردہ واقعات کے تفصیلی مطالعے کے بعد اس قصے کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام والے بیر سبع کے مقام پر ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور ان سے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بیر سبع (سات کے کنوئیں) کے پہاڑی، غیر مزروعہ اور ریتلے بیابان میں چھوڑ کر بیر سبع (حلف کا کنواں) میں اپنے ریوڑوں اور حبرون میں اپنی جائے رہائش کی طرف لوٹ گئے۔ حضرت ہاجرہ کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام جو کھانا اور پانی چھوڑ گئے تھے، وہ چند دن میں ختم ہوگیا۔ وہ (حضرت ہاجرہ) بہت پریشان ہوئیں۔ قریب ہی صفا اور مروہ کی پہاڑیاں تھیں۔ وہ کچھ خوراک اور پانی یا کسی مددگار کی تلاش میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی کی طرف دوڑنے لگیں، لیکن یہ سب ایک سعی لاحاصل تھی۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے سات چکر لگانے کے بعد ہاجرہ اور اُن کے بیٹے کے لیے ایک عجیب اور غیر معمولی انداز میں پانی کا ایک چشمہ فراہم ہوگیا۔ اس طرح اس جگہ کا نام 'بیر سبع' یا 'سات کا کنواں' یعنی صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگانے کے نتیجے میں نمودار ہونے والا کنواں، پڑگیا۔ قریب ہی حرمِ کعبہ (بیت اللہ یعنی اللہ کا گھر جسے عبرانی میں بیت ایل

کہتے ہیں) کے باقیات اور کھنڈر کھڑے تھے جن پر مستقبل قریب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عمارت اٹھائی تھی۔

قبلِ اسلام کے پرانے زمانے سے اہلِ عرب کے درمیان یہ ایک مسلّمہ اور مشہور روایت چلی آرہی تھی کہ خانہ کعبہ کا حج کرتے وقت لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سات چکّر لگایا کرتے تھے۔ اسے اسلامی حج کی اصطلاح میں 'سعی' کہتے ہیں۔ اسلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کی اس روایت کو برقرار رکھا تاکہ اہلِ ایمان کے دل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مضبوط ایمان اور اللہ تعالیٰ کی کلّی اطاعت اور حضرت ہاجرہ کے اپنے مالک پر مکمل اعتماد کی یاد تازہ رہے اور اُن میں اِس واقعہ کی روح کی پیروی کا جذبہ پیدا ہو۔ بخاری نے اس واقعے کو تفصیل سے نقل کیا ہے:

ثم جاء بها ابراهيمُ وبابنها اسماعيلَ وهي تُرضعُه حتى وضعهما عند البيت عند دوحة فوق زمزمَ في أعلى المسجد وليس بمكةَ يومئذ أحدٌ وليس بها ماءٌ فوضعهما هنالك ووضع عندهما جرابًا فيه تمرٌ وسقاءً فيه ماءٌ ثم قفّى ابراهيمُ منطلقًا فتبعَتْه أمُّ اسماعيلَ فقالت يا ابراهيمُ أين تذهب وتتركنا فهذا الوادي الذي ليس فيه انسٌ ولا شيءٌ فقالت له ذلك مرارا وجعل لا يلتفتُ اليها فقالت له آللّٰهُ الذي أمرك بهذا قال نعم، قالت اذن لا يُضيّعُنا ثم رجعتْ فانطلق ابراهيمُ حتى اذا كان عند الثَّنِيَّةِ حيث لا يرونه استقبل بوجهه البيتَ ثم دعا بهؤلاء الكلمات ورفع يديه فقال ربِّ ﴿رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (ابراہیم۱۴:۳۷)﴾ وجعلتْ أمُّ اسماعيلَ تُرضع اسماعيلَ وتشربُ من ذلك الماء حتى اذا نفد ما في السقاء عطشت وعطش ابنُها وجعلتَ تنظر اليه يتلوّى أو قال يتلبّط فانطلقتْ كراهية أن تنظر اليه فوجدتْ الصّفا أقربَ جبلٍ في الأرض يليها فقامت عليه ثم استقبلتْ الوادي تنظر هل ترى أحدا فلم تر أحدا فهبطتْ من الصفا حتى اذا بلغتْ الوادي رفعتْ طرفَ درعها ثم سعَتْ سَعْيَ الانسانِ المجهور حتى جاوزتْ الوادي ثم أتتْ المروةَ فقامت عليها ونظرت هل ترى أحدا فلم تر أحدا ففعلت ذلك سبعَ مرات قال ابن عباس قال النبي ﷺ فذلك سَعْيُ الناس بينهما فلما أشرفت على المروة سمعت صوتا فقالت صه تريد نفسها ثم تسمَّعت فسمعتْ أيضا فقالت قد أسمعتَ ان كان عندك غواثٌ فاذا هي بالمَلَكِ عند موضع زمزمَ فبحث بعَقِبه أو قال بجناحه حتى ظهر

الماءَ فجعلت تُحَوِّضُه وتقول بيدها هكذا وجعلت تغرف من الماء في سقائها وهو يفُورُ بعد ما تغرفُ قال ابن عباس قال النبي ﷺ يرحم اللهُ أمَّ اسماعيل لو تركت زمزم أو قال لو لم تغرف من الماء لكانت زمزمُ عَينا مَعينا قال فشربت وأرضعت ولدها فقال لها الملكُ لا تخافوا الضَّيعَةَ فان ها هنا بيت الله يبني هذا الغلام وأبوه وان الله لا يُضيع أهله وكان البيت مرتفعا من الأرض كالرابية تأتيه السُّيولُ فتأخذ عن يمينه وشماله فكانت كذلك حتى مرت بهم رُفقَةٌ من جُرهُم أو أهل بيت من جرهم مُقبلين من طريق كَداءٍ فنزلوا في أسفل مكةَ فرأوا طائرا عائفا فقالوا ان هذا الطائر ليدور على ماء لعهدنا بهذا الوادي وما فيه ماءٌ فأرسلوا جَريًا أو جريَّين فاذا هم بالماء فرجعوا فأخبروهم بالماء فأقبلوا قال وأمُّ اسماعيلَ عند الماء فقالوا أتأذنين لنا أن ننزِلَ عندك فقالت نعم ولكن لا حقَّ لكم في الماء قالوا نعم قال ابن عباس قال النبي ﷺ فألفى ذلك أم اسماعيل وهي تحب الانس فنزلوا وأرسلوا الى أهليهم فنزلوا معهم حتى اذا كان بها أهل أبياتٍ منهم وشَبَّ الغُلام وتَعلَّمَ العربيةَ منهم وأنفسهم وأعجبهم حين شب فلما أدرك زوَّجوه امرأةً منهم وماتت أمُّ اسماعيلَ.[58]

ابن عباسؓ سے روایت ہے: 'پھر [حضرت] ابراہیم علیہ السلام اُنھیں (ہاجرہ کو) اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے آئے اور ہاجرہ [ابھی] حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلاتی تھیں۔ دونوں کو بیت اللہ کے پاس ایک بڑے درخت کے قریب زم زم کے اوپر مسجد کی بلند جانب بٹھایا اور مکے میں اس وقت کوئی نہ تھا اور نہ وہاں پانی تھا۔ دونوں کو وہاں بٹھایا اور دونوں کے پاس ایک تھیلی چھوڑی، جس میں کھجوریں تھیں، اور ایک مشکیزہ، جس میں پانی تھا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس روانہ ہوئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ بھی ان کے پیچھے پیچھے آئیں اور کہنے لگیں: 'اے ابراہیمؑ ہمیں اس وادی میں، جس میں نہ کوئی آدم زاد ہے اور نہ کوئی اور چیز، چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔' حضرت ہاجرہ نے یہ بات اُن سے کئی مرتبہ کہی۔ [لیکن] انھوں [ابراہیمؑ] نے اُن کی طرف کوئی التفات نہ کیا اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تو اُنھوں [ہاجرہ] نے اُن سے کہا: 'کیا اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟' انھوں نے کہا: 'ہاں۔ وہ (ہاجرہ) کہنے لگیں: 'تو پھر وہ ہمیں ضائع نہ ہونے دے گا۔'[59] یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس گھاٹی کے پاس پہنچے جہاں وہ لوگ اُنھیں [ابراہیمؑ کو] دیکھ نہ سکتے تھے، تو انھوں نے بیت اللہ کی طرف منہ کیا اور اپنے دونوں ہاتھ

اُٹھا کر ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کی:

پروردگار! میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار، یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ البذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے، شاید کہ یہ شکرگزار بنیں (ابراہیم ۱۴: ۳۷)۔

اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ انھیں دودھ پلاتی رہیں اور پانی کا جو مشکیزہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کے پاس چھوڑ گئے تھے، اس میں سے پیتی رہیں۔ جب مشکیزے کا پانی ختم ہو گیا تو انھیں پیاس ستانے لگی اور اُن کا بیٹا بھی پیاس سے بلکنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھتی تھیں کہ وہ تڑپ رہا ہے۔ [اُنھیں یہ بہت ناگوار گزرا]۔ وہ وہاں سے ہٹ گئیں، کیونکہ انھیں یہ بات پسند نہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو (اس حالت میں) دیکھیں۔ اُس [ہاجرہ] نے محسوس کیا کہ زمین پر صفا کی پہاڑی اس کے سب سے قریب ہے۔ وہ اُس پر کھڑی ہو گئیں پھر اُس نے وادی کی طرف منہ کیا تا کہ دیکھیں کہ کوئی شخص نظر آئے، مگر انھیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ صفا سے اُتریں، یہاں تک کہ جب وہ نیچے وادی میں پہنچیں تو اپنے کُرتے کے دامن کو اٹھا لیا اور اس طرح دوڑنے لگیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ یہاں تک کہ وادی سے گزر گئیں۔ پھر مروہ پہنچیں اور اُس کے اوپر کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے نظر دوڑائی کہ شاید کوئی نظر آ جائے۔ انھوں نے سات مرتبہ ایسا کیا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: 'یہی وہ سعی ہے جو لوگ ان دونوں [صفا اور مروہ] کے درمیان کرتے ہیں'۔ پھر جب وہ [ساتویں مرتبہ] مروہ پر چڑھیں تو انھوں نے ایک آواز سنی۔ اس پر اُنھوں نے اپنے آپ سے کہا 'خاموش!' اور پھر اُنھوں نے توجہ سے سُنا تو وہی آواز آئی۔ اُنھوں نے کہا تُو نے اپنی آواز تو سنا دی [لیکن] کیا تیرے پاس میرے لیے کوئی مدد بھی ہے؟ اب جو انھوں نے نظر ڈالی تو دیکھا کہ زم زم کی جگہ پر ایک فرشتہ ہے۔ اُس نے اپنی ایڑی یا اپنے پر سے زمین کھودی۔ یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ وہ حوض بنا کر یہ پانی اُس میں جمع کرنے لگیں اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح استعمال کرتے ہوئے پانی سے چلو بھر بھر کر اپنے مشکیزے میں ڈالنے لگیں اور یہ [پانی] ان کے چلو بھر بھر کر لینے کے بعد اور بھی جوش سے نکلنے لگا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'اللہ اسماعیل کی ماں پر رحم

فرمائے اگر وہ زم زم کو [اپنے حال پر] چھوڑ دیتیں، یا فرمایا: 'اگر وہ پانی سے چلّو چلّو نہ بھرتیں تو زم زم ایک چشمہ جاریہ ہوتا۔ پس انھوں نے پانی پیا اور اپنے لڑکے کو دودھ پلایا۔ پس فرشتے نے کہا: 'ضائع [ہلاک] ہونے کا خوف نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے۔ یہ لڑکا اور اُس کا باپ اُسے تعمیر کریں گے اور اللہ اپنے لوگوں کو ضائع نہیں کرتا'۔ اور خانہ کعبہ اُس وقت ایک ٹیلے کی طرح زمین سے اونچا تھا۔ اس پر سیلاب آتے تو اس کے دائیں بائیں سے گزر جاتے۔ حضرت ہاجرہ اس حال میں رہیں۔ یہاں تک کہ قبیلہ جُرہم کے کچھ لوگ یا جرہم کے گھر والوں میں سے کچھ لوگ اُن کے پاس سے گزرے۔ وہ 'کدا' کی طرف سے آرہے تھے اور ملّکے کے نشیب میں اُترے۔ انھوں نے [آسمان میں] چکر لگاتا ہُوا ایک پرندہ دیکھا تو کہا یہ پرندہ تو پانی کے اوپر چکر لگایا کرتا ہے۔ ہم ایک مدت سے اس وادی سے واقف ہیں۔ اِس میں تو کبھی پانی نہ تھا۔ پھر انھوں نے ایک دو آدمی [پتہ کرنے کے لیے] بھیجے، جنھوں نے وہاں پانی دیکھا۔ وہ واپس لوٹے اور ان لوگوں کو پانی کے متعلق خبر دی۔ وہ اس طرف آئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پانی کے پاس تھیں۔ انھوں نے کہا: 'کیا آپ ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ ہم آپ کے پاس قیام کرلیں۔' حضرت ہاجرہ نے کہا: 'ہاں، لیکن پانی [کی ملکیت] پر تمھارا کوئی حق نہ ہوگا'۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: 'یہ بات [حضرت] اسماعیلؑ کی والدہ کو پسند آئی۔ وہ تو خود یہی چاہتی تھیں [کہ وہاں کچھ انسان آباد ہوں]۔ وہ لوگ اُتر پڑے اور اپنے گھر والوں کو پیغام بھجوا کر بلا لیا اور وہ بھی آ کر ان کے ساتھ قیام پذیر ہو گئے۔ اُن کے کئی گھر وہاں آباد ہو گئے۔ وہ لڑکا [حضرت اسماعیل علیہ السلام] جوان ہو گیا۔ اُس نے اُن (بنو جرہم) سے عربی زبان سیکھی۔ جب یہ جوان ہُوا تو انھیں نفیس معلوم ہُوا اور انھیں پسند آیا۔ جب وہ بالغ ہو گیا تو انھوں نے اپنی کسی عورت سے اُس کی شادی کر دی۔ اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ [ہاجرہ] کا انتقال ہو گیا'۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اِس روایت میں واقعہ کا بیان کس قدر صاف مختصر، مربوط، برملا، بے عیب اور منطقی ہے۔

(ط) اُوپر یہ بات آچکی ہے کہ حلف کے کنوئیں والے 'بیر سبع' کے مقام پر پہلے سے ایک

کنواں موجود تھا اور وہ بالکل سامنے نظر آتا تھا۔ اسی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شاہ ابی ملک کے درمیان عہد و اقرار ہوا تھا، لیکن اس کا پہلے سے کوئی نام نہ تھا۔ اس کا نام 'بیر سبع' یا حلف کا کنواں اُس عہد و اقرار کے بعد رکھا گیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شاہ ابی ملک کے درمیان منعقد ہوا تھا، جبکہ سات کے کنوئیں والے 'بیر سبع' کے بیابان کے مقام پر پہلے سے کوئی کنواں موجود نہ تھا۔ اور یہ کنواں بعد میں اس وقت ایک غیر معمولی طریقے پر مہیا کیا گیا تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو 'بیر سبع' اور فاران کے بیابان میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سات کے کنوئیں والا 'بیر سبع' اور حلف کے کنوئیں والا 'بیر سبع' بالکل الگ مقامات ہیں۔

(ی) بائبل میں ایک تیسرے 'بیر سبع' کا بھی ذکر ہے:

تب ابی ملک اپنے دوست اخوزت اور اپنے سپہ سالار فیکل کو ساتھ لے کر جرار سے اُس کے پاس گیا۔ اضحاق نے اُن سے کہا کہ تم میرے پاس کیوں کر آئے حالانکہ مجھ سے کینہ رکھتے ہو اور مجھ کو اپنے پاس سے نکال دیا؟ اُنھوں نے کہا ہم نے خوب صفائی سے دیکھا کہ خداوند تیرے ساتھ ہے، سو ہم نے کہا کہ ہمارے اور تیرے درمیان قسم ہو جائے اور ہم تیرے ساتھ عہد کریں۔ کہ جیسے ہم نے تجھے چھوا تک نہیں اور سوا نیکی کے تجھ سے اور کچھ نہیں کیا اور تجھ کو سلامت رخصت کیا تو بھی ہم سے کوئی بدی نہ کرے گا، کیونکہ تُو اب خداوند کی طرف سے مبارک ہے۔ تب اُس نے اُن کے لیے ضیافت تیار کی اور اُنھوں نے کھایا پیا۔ اور وہ صبح سویرے اُٹھے اور آپس میں قسم کھائی اور اضحاق نے اُن کو رخصت کیا اور وہ اُس کے پاس سے سلامت چلے گئے۔ اُسی روز اضحاق کے نوکروں نے آکر اُس سے اُس کنویں کا ذکر کیا جسے اُنھوں نے کھودا تھا اور کہا کہ ہم کو پانی مل گیا۔ سو اُس نے اُس کا نام سبع رکھا، اسی لیے وہ شہر آج تک 'بیر سبع' کہلاتا ہے۔[۶۰]

بائبل کے زیادہ تر مفسرین اور لغت نگاروں کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق 'بیر سبع' اور حضرت اسحاق علیہ السلام سے متعلق 'بیر سبع' حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ ایسے ہیں

جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دو الگ الگ مقامات ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ یہ قصہ بائبل کے مؤلفین کی اختراع ہے۔ صورتِ حال جو بھی ہو، ایک بات یہاں انتہائی قابلِ فکر ہے: حضرت اسحاق علیہ السلام کی نہ تو وہاں حضرت ہاجرہ سے کوئی ملاقات ہوئی اور نہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان کے کسی فرد سے کوئی سامنا ہوا۔ اگر یہ وہی بیر سبع [سات کا کنواں] ہوتا جس کا حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قصے سے تعلق ہے تو:

(۱) یہ وہاں لازماً پہلے سے موجود ہونا چاہیے تھا۔

(۲) یہ کنواں چونکہ ہر لحاظ سے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ملکیت تھا، اس لیے انھیں وہاں لازماً عملی طور پر موجود ہونا چاہیے تھا اور

(۳) چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ایک مہمان نواز شخص تھے، اس لیے انھوں نے وہاں اپنے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام کی لازماً خوب خاطر تواضع کی ہوتی۔

لیکن اس کتاب کے مصنف کے لیے بھی اور قارئین کے لیے بھی یہ بات انتہائی مایوس کن ہے کہ اُس جگہ اس طرح کا کوئی معاملہ پیش نہ آیا۔ اس واقعہ سے پہلے وہاں کوئی کنواں موجود نہ تھا۔ یہ تو وہاں حضرت اسحاق علیہ السلام کے غلاموں نے کھود کر نکالا تھا۔ پھر نہ تو وہاں حضرت ہاجرہ موجود تھیں اور نہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان کا کوئی فرد وہاں دیکھا گیا۔ اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف سے حضرت اسحاق علیہ السلام کی ضیافت اور خاطر تواضع کا بھی کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ پھر بائبل کے مطابق یہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہی تھے جنھوں نے اس کنوئیں کا نام 'شیباہ کا کنواں' رکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسا کنواں تھا جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے غلاموں کے کھودنے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اور یہ وہ کنواں نہ تھا جو حضرت ہاجرہ کو کسی غیر معمولی طریقے سے دکھایا اور مہیا کیا گیا ہو۔

مندرجہ بالا مواد سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ بائبل کی مندرجہ بالا عبارت میں بیان کردہ 'بیر سبع' کے بیابان کا تعلق مکہ کی ایک ناقابلِ کاشت، پہاڑی، ریتلی، بنجر اور بے آباد زمین

اور چاہِ زم زم سے ہے۔ اس کا اُس قابلِ کاشت 'حلف کے کنوئیں والے بیر سبع' سے کوئی تعلق نہیں جو کنعان کی جنوبی سرحد کے قریب واقع ہے اور جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اُن ریوڑوں کی دیکھ بھال کے لیے اکثر جایا کرتے تھے جو انھوں نے وہاں رکھے ہوئے تھے۔

مندرجہ بالا سارے مضمون کے اعادے اور خلاصے کے طور پر ذیل میں چند اہم نکات پیش کیے جاتے ہیں:

۱) مذکورہ بالا عبارت میں بہت سی تحریفیں، اضافے، حذف اور تبدیلیاں موجود ہیں، جس سے یہ پوری کہانی قدرے مشتبہ ہو جاتی ہے، اس لیے اس میں سے جو بات بھی لی جائے اُسے اچھی طرح تنقیدی مطالعے کے بعد قبول کرنا چاہیے۔

۲) اس کہانی میں حضرت سارہ کو ایک حاسد، منتقم مزاج، کینہ پرور، تیز مزاج، گھٹیا ذہنیت والی، اور اذیت پسند عورت کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ یہ بات حضرت سارہ جیسے مرتبے کی ایک خدا ترس اور شریف خاتون کے متعلق کسی طرح بھی قابلِ اعتماد اور شایانِ شان نہیں۔ اس طرح قصّے کا یہ سارا حصّہ بالکل جعلی اور جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

۳) حضرت ہاجرہ مصر کے بادشاہ کی بیٹی تھیں۔ اس طرح وہ ایک شہزادی تھیں۔ انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ کے سپرد اسی غرض سے کیا گیا تھا تاکہ وہ اُن سے تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ اور نیک اور شریفانہ آداب سیکھیں اور اس خاندان کی خدمت کریں۔ شاہِ مصر نے یہ کام اس خاندان کی نیکی اور تقویٰ کے اعتراف کے طور پر کیا تھا۔ حضرت ہاجرہ کوئی باندی نہ تھیں جنھیں اُن کے باپ نے، جو مصر کا بادشاہ تھا، کسی مجبوری کے تحت فروخت کیا ہو۔ اس طرح وہ تمام قصّے جن میں حضرت سارہ کی حضرت ہاجرہ سے بدسلوکی کا ذکر ہے، بالکل مبنی بر افترا اور جھوٹ کا پلندہ ہیں، بلکہ اگر حضرت ہاجرہ کنیز ہوتیں تب بھی یہ بات حضرت سارہ جیسی نیک سرشت خاتون کے ہرگز شایانِ شان نہ تھی کہ وہ اِن کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کرتیں اور انھیں لونڈی پکار کر ان کی عزتِ نفس کو مجروح کرتیں۔

۴) جب حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بیر سبع (چاہ زم زم) کے قریب آباد کیا گیا تھا، اُس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام ایک کم سن بچے تھے۔ یہ بات مندرجہ ذیل عبارات سے صاف ظاہر ہے: 'حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ لیا، اور یہ چیزیں حضرت ہاجرہ کو دے کر بچے کو اُن کے کندھے پر رکھا' اور 'حضرت ہاجرہ نے اس بچے کو ایک جھاڑی کے نیچے پھینک دیا' اور یہ کہ خداوند کے فرشتے نے حضرت ہاجرہ سے کہا 'اس لڑکے کو اٹھاؤ اور اسے اپنے ہاتھوں میں تھام لو۔ دوسری طرف بائبل کا کہنا یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا دودھ چھڑانے کی ضیافت کے موقع پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حضرت اسحاق علیہ السلام کا مذاق اڑانے کے نتیجے میں رونما ہوا۔ دودھ چھڑانے کا یہ واقعہ اُس وقت رونما ہُوا جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی عمر دو یا تین سال کی تھی۔ وُہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے عمر میں تیرہ چودہ سال چھوٹے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضیافت کے موقع پر حضرت اسماعیل علیہ السلام سولہ سترہ سال کے نوجوان تھے۔ اس لحاظ سے حضرت ہاجرہ انھیں نہ تو اپنے کندھے پر ڈال سکتی تھیں نہ اُنھیں ایک جھاڑی کے نیچے پھینک سکتی تھیں اور نہ اس لڑکے کو اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں تھام سکتی تھیں۔ ان سب باتوں سے یہ چیز صاف ظاہر ہوتی ہے کہ دودھ چھڑانے کی ضیافت کا یہ واقعہ جس انداز میں بیان کیا گیا ہے، وہ قطعی غیر مربوط اور ناقابلِ اعتبار ہے اور معزز سارہ ظلم اور حسد کے تمام الزامات سے بری قرار پاتی ہیں اور اس قصے کا یہ واقعہ بھی حقائق کے اعتبار سے مسترد قرار پاتا ہے۔

۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور اُن کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم کے تحت بیر سبع (چاہ زم زم) کے بیابان میں آباد ہونے کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ جب وہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت سرانجام دے رہے تھے تو اُنھیں اس کے بارے میں کسی طرح کی پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ وہ بذاتِ خود خوب اچھی طرح مشاہدہ کر چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس خاندان کا خود ہی محافظ اور نگران ہے۔

۶) لفظ 'بیر سبع' بائبل میں چونتیس جگہ استعمال ہوا ہے۔ صرف اس ایک مقام پر، جہاں یہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام، دونوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے، اس سے پہلے بیابان کا وصف لگایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف یہی بیر سبع (چاہ زم زم) حقیقی معنوں میں بیابان قرار دیا جاسکتا ہے، جبکہ دوسرا بیر سبع (حلف کا کنواں) ایک سرسبز وشاداب اور زرخیز مقام ہے جہاں پانی کی بھی فراوانی ہے۔

۷) 'بیر سبع' ایک بامعنی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: 'سات کا کنواں' یا 'صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سات مرتبہ سعی کے چکر لگانے سے متعلق کنواں' یا 'وہ کنواں جو حضرت ہاجرہ کو ان کے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے سات چکر لگانے کے نتیجے کے طور پر دیا گیا تھا'۔

۸) بیر سبع کے ایک اور معنی 'حلف کا کنواں' بھی ہیں جس کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شاہ ابی ملک کے حلف سے ہے یا حضرت اسحاق علیہ السلام اور شاہ ابی ملک کے درمیان حلف سے ہے جو کنعان کے جنوب مغربی سرے پر عمل میں آیا تھا۔ اس کا اوّل الذکر 'بیر سبع' یعنی سات کے کنوئیں سے کوئی تعلق نہیں۔

۹) 'بیابان' عبرانی کے لفظ 'مِدبار' کا انگریزی کا ترجمہ ہے جس کے معنی ہیں 'ناقابل کاشت، ناہموار، بنجر، ریتلی اور پہاڑی زمین یا صحرا'۔ یہ اوصاف سات کے کنوئیں والے 'بیر سبع' یعنی مکہ اور اس کے ماحول سے تعلق رکھنے والے بیر سبع سے مکمل طور پر مطابقت رکھتے ہیں۔ جہاں تک 'حلف کے کنوئیں والے بیر سبع' کا تعلق ہے، ان اوصاف کا کسی طرح بھی اُس پر اطلاق ممکن نہیں۔

۱۰) 'حلف کے کنوئیں والا بیر سبع' تو اُس مقام پر پہلے ہی موجود تھا جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شاہ ابی ملک کے درمیان حلف منعقد ہوا تھا۔ (اور اگر اس سے حضرت اسحاق علیہ السلام اور شاہ ابی ملک والا کنواں مراد لیا جائے تو یہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے غلاموں نے باقاعدہ کھود کر نکالا تھا)، جبکہ 'سات کے کنوئیں والے بیر سبع کے بیابان' کے محلِ وقوع پر نہ تو کوئی کنواں پہلے

سے موجود تھا اور نہ اُسے کسی نے کھود کر نکالا تھا۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ 'حلف کے کنوئیں والا بیر سبع' اور 'سات کے کنوئیں والا بیر سبع' قطعی طور پر دو مختلف اور الگ الگ مقامات ہیں۔ 'سات کے کنوئیں والا بیر سبع' چاہ 'زم زم' ہے جو حضرت ہاجرہ کو اُن کے پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سات مرتبہ سعی کے چکر لگانے کے نتیجے میں دیا گیا تھا۔

حواشی ضمیمہ اول 'بیر سبع'

۱۔ 'چیمبرز بائیوگرافیکل ڈکشنری' (Chambers Biographical Dictionary) میں تشریح کی گئی ہے (صفحہ ۱۹۳۳):

Sarah, whose name means 'princess' in Hebrew, was the wife of Abraham and mother of Isaac. She accompanied Abram from Ur to Canaan (Gen 12-23) and pretended to be Abram.'s sister before Pharaoh in Egypt and Abimelech in Gerar, since her beauty and their desire for her might have endangered Ab.'s life. Pharaoh took her as his wife, and Abrm. prospered, but when the truth was revealed, Pharaoh banished them both. Long barren, she eventually gave birth to Isaac in her old age, fulfilling God's promise that she would be the ancestor of nations (Gen 17.16). She died at the age of 127 in Kiriath-arba."

سارہ، جس کے نام کے معنی عبرانی میں شہزادی ہیں، ابراہام کی بیوی اور اسحاقؑ کی ماں تھیں۔ وہ ابرام کے ساتھ اُر سے کنعان آئیں تھیں (پیدائش ۱۲: ۲۳)۔ انھوں نے مصر میں فرعون اور جرار میں شاہ ابی ملک کے سامنے یہ بہانہ بنایا تھا کہ وہ ابرام کی بہن ہیں، کیونکہ اُن [سارہ] کے حسن اور اُن [بادشاہوں] کی حضرت سارہ کی طرف رغبت کی بنا پر ابراہیمؑ کی زندگی خطرے میں تھی۔ فرعون نے انھیں اپنی بیوی بنالیا۔ اور ابراہام خوش حال ہو گئے، لیکن جب حقیقت ظاہر ہوگئی تو فرعون نے ان دونوں کو نکال دیا۔ مدت تک بانجھ رہنے کے بعد انھوں نے بڑی دیر سے بڑھاپے کی عمر میں اسحاقؑ کو جنم دیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہُوا کہ وہ قوموں کی ماں ہوگی (پیدائش ۱۷: ۱۶)۔ وہ ایک سو ستائیس سال کی عمر میں قریہ اربعہ کے مقام پر فوت ہوئیں۔

۲۔ 'نیو شارٹر اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری' ۱: ۳۲۵ میں کنعان کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے:

Ancient name of western Palestine, promised in the OT and Hebrew Scriptures to the children of Israel (Exod. 3:17 etc.).

[کنعان] مغربی فلسطین کا قدیم نام ہے۔ عہد نامہ قدیم اور عبرانی صحیفوں میں اِسے اولادِ اسرائیل کے لیے [مخصوص کرنے کا] وعدہ ہے (خروج ۳: ۱۷ وغیرہ)۔

۳۔ 'چیمبرز اسینشل انگلش ڈکشنری'، ۱۹۹۸ء، صفحہ ۱۱۱۵ میں وضاحت ہے:

A mother weans her baby when she gradually stops feeding it with milk from her breast and gives it increasing amounts of other kinds of food.

ایک ماں اپنے بچے کا دودھ اُس وقت چھڑاتی ہے، جب وہ بتدریج اسے اپنی چھاتی سے دودھ پلانا بند کر کے دوسری قسموں کی خوراک کی زیادہ مقدار دینے لگتی ہے۔

آر جے کلفرڈ (R.J. Clifford) اور آر ای مرفی (R.E. Murphy) لکھتے ہیں:

The age of weaning was three years. (*The New Jerome Biblical Com.*: ed RE Brown, etc, Bangalore: TPI. 1994. p.24):

دودھ چھڑانے کی عمر تین سال تھی۔

توارت کی ایک یہودی تفسیر 'دی سونکینو قماش' (*Soncino Chumash*) میں صفحہ ۱۰۳ پر ربی شلوموہ یتشا کی (Rabbi Shelomoh Yitschaki) (۱۰۴۰ء - ۱۱۰۵ء) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ [دودھ چھڑانا] دو سال کی عمر میں منعقد ہوتا تھا۔

ہیسٹنگز بائبل ڈکشنری' میں (۲۔ ۲۷ پر) درج ہے:

We are told of the birth of Isaac (v v. 1-7). On the occasion of the festival which was held perhaps two or three years later.

ہمیں [کتاب پیدائش باب ۲۱ میں] اسحاق کی پیدائش کے متعلق بتایا گیا ہے (آیات ۱-۷)۔ اُس کی [دودھ چھڑانے کی] تقریب کے موقع پر جو شاید دو یا تین سال بعد منعقد ہوئی تھی۔

اس کی جلد اول میں ایچ اے وائٹ بتاتا ہے (صفحہ ۳۰۱):

It was not fully weaned for two or three years.

دو یا تین سال تک اسے مکمل طور پر دودھ نہیں چھڑایا گیا۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بچے کا دودھ دو یا تین سال کی عمر میں چھڑایا جاتا تھا۔ کتاب پیدائش (۱۶:۱۶) کے مطابق:

جب ہاجرہ نے ابراہیم کے لیے اسماعیل کو جنا تو ابراہیم چھیاسی سال کے تھے۔

کتاب پیدائش (۲۱:۵) کے مطابق:

ابراہیمؑ کی عمر [اس وقت] سو سال تھی۔ جب اُن کے ہاں اُن کا بیٹا اسحاقؑ پیدا ہوا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں بھائیوں کی عمروں کے درمیان چودہ سال کا فرق ہے۔ اور جب حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ اُن کا دودھ چھڑایا گیا تو اُن کے بڑے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر سولہ [۱۴+۲] یا سترہ [۱۴+۳] سال کی ہونی چاہیے، کیونکہ اُن کی نشوونما کھلی فضا والی سخت کوشی کی زندگی میں ہوئی تھی اور اُن کی بنیادی خوراک دودھ اور گوشت تھی، اس لیے وہ ایک مضبوط توانا اور سخت کوش جوان ہوں گے، لیکن آگے آنے والی آیات کے مطابق وہ صحیح طور پر یا تو دودھ پیتے بچے دکھائی دیتے ہیں یا ابھی ابھی اُن کا دودھ چھڑایا گیا ہے۔ بائبل کے ان متضاد و متناقض بیانات کی روشنی میں دودھ چھڑانے کا یہ واقعہ بالکل ناقابل اعتبار قرار پاتا ہے۔ بائبل کے مفسرین نے بھی اس تضاد کو محسوس کیا ہے۔ جیروم کی تفسیر بائبل میں یوجین ایچ مالی (Eugene H. Maly) اپنی کتاب پیدائش کی تفسیر میں (صفحہ ۲۲ پر) لکھتا ہے:

From 17:25 and 21:8 we can deduce that Ishmael would be about 16 years old, which clashes with the present account (cf. vv. 14-17).

۱۷:۲۵ اور ۲۱:۸ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اسماعیل سولہ سال کے ہوں گے جو موجودہ بیان سے متصادم ہے (آیات نمبر ۱۴ تا ۱۷)۔

اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیابان بیر سبع / فاران میں آباد کیے جانے کے موقع پر اُن کی عمر کے متعلق بائبل کے بیانات متضاد اور متناقض ہیں، اس لیے اس کہانی کے ہر حصے کا بغور تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ہی اس کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

۴ اس جملے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے فرزند تھے، جنھیں اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جنا تھا۔ اور حضرت سارہ کو اس بات کا کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ اس کے متعلق اپنا بیٹا ہونے کا دعویٰ کریں۔ بائبل میں اس بات کی وضاحت موجود ہے:

اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور ساری نے ابرام سے کہا، 'کہ دیکھ، خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے، سو تو میری لونڈی کے پاس جا، شاید اُس سے میرا گھر آباد ہو' کیسی عجیب بات ہے کہ ایک خاتون دوسری خاتون سے اپنے لیے اولاد حاصل کر سکتی

ہے!] اور ابرام نے ساری کی بات مانی اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اُس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اُسے دی کہ اُس کی بیوی بنے۔ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی (...)۔ تب ساری اُس پر سختی کرنے لگی اور وہ اُس کے پاس سے بھاگ گئی [پس سارائی نے اُس کے ساتھ بدسلوکی کی اور وہ بھاگ گئی (NEV۔ کتاب پیدائش ۶:۱۶)]۔ (...)۔ اور خداوند کے فرشتے نے اُس [ہاجرہ] سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا، اُس کا نام اسماعیل رکھنا، اس لیے کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا۔ (...)۔ اور ابرام سے ہاجرہ کے ایک بیٹا ہوا اور ابرام نے اپنے اُس بیٹے کا نام جو ہاجرہ سے پیدا ہوا، اسماعیل رکھا (کتاب مقدس، پیدائش ۱۶:۱، ۳، ۱۱، ۱۵)۔

یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا، جیسا کہ آیت ۱۰ کے لفظ 'باندی' پر آگے آنے والے ایک حاشیے میں واضح کیا گیا ہے۔ حضرت ہاجرہ حضرت سارہ کی لونڈی یا باندی نہ تھیں۔ وہ ایک شہزادی تھیں اور اُن کے باپ نے، جو مصر کا بادشاہ تھا، انھیں حضرت سارہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیش کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کتاب کے دوسرے باب کے حاشیہ ۲ پر بھی دوبارہ ایک نظر ڈال لی جائے۔ اگر وہ حضرت سارہ کی باندی بھی ہوتیں تو جب سارہ نے انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکاح میں دے دیا تو وہ اُن کی باندی کیسے رہ گئیں۔ یہ ایک فطری انصاف کی بات ہے کہ ماں ہونے کا اعزاز صرف اُسی خاتون کو حاصل ہونا چاہیے جو متعلقہ بچے کو فی الواقع جنم دے۔ کسی ایسی عورت کو، جو ایک بچے کی حقیقی والدہ نہیں ہیں، یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اُس عورت سے اس بچے کی ماں ہونے کا اعزاز چھین سکے، جس نے اُسے جنم دیا ہے۔ کسی عورت کو، خواہ اُس کا معاشرتی مرتبہ کچھ بھی ہو، یہ اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ وہ کسی ایسی خاتون کا استحصال کرے جو نادار، کمزور اور بے آسرا ہو۔ جو کوئی بھی ایسی ظالمانہ حرکت کرے، وہ ایک ظالم مجرم ہے۔ اگر اس فطری انصاف کے برعکس اُس کے علاقے میں کوئی ایسی غیر منصفانہ مقامی روایت موجود تھی بھی تو بزرگ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ بات کسی طرح پسندیدہ اور مناسب نہ تھی کہ وہ اس پر عمل کرتے۔ اُن کا فرض تو یہ بنتا تھا کہ وہ خدائی اور فطری انصاف کے اصولوں کے مطابق اس میں مناسب تبدیلی لاتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو کسی طرح بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ معاشرے کی مروجہ بے انصافیوں کی پیروی کریں یا اُن کا ساتھ دیں۔ انھیں تو بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے کہ وہ ایسی تمام بے انصافیوں کو جڑ سے

اکھاڑ پھینکیں اور اپنی پوری حدودِ نبوت میں خداوند کے فطری انصاف کو قائم کریں۔ گجا یہ کہ وہ خود اپنے گھر میں ایسی بے انصافیوں پر عمل ہونے دیں، اس لیے مندرجہ بالا قضیے کو کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام انصاف اور مساوات کے تمام اصولوں کی رُو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُن کی جائز بیوی حضرت ہاجرہ سے اُن کے حقیقی اور قانونی پہلوٹے بیٹے تھے اور انھیں پہلوٹا بیٹا ہونے کے تمام حقوق حاصل تھے۔ بائبل کے جملے 'اب ابرام کی بیوی ساری نے اُس کے لیے کوئی بچے نہ جنے تھے' کی 'نیلسن اسٹڈی بائبل' میں مندرجہ ذیل وضاحت کی گئی ہے:

In the world of the OT, infertility caused great distress (see 25:21). At that time, the woman was always blamed. When a woman was not able to conceive a child, her husband might divorce her. (p. 33).

عہد نامہ قدیم کی دنیا میں بانجھ پن بہت بڑی مصیبت کا باعث بنتی تھی (دیکھیے ۲۵:۲۱)۔ اُس وقت الزام ہمیشہ عورت پر جاتا تھا۔ جب کوئی عورت حاملہ ہونے کے قابل نہ ہوتی تو اُس کا خاوند اُسے طلاق دے سکتا۔

اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس زمانے کے رسم و رواج کی پابندی کرتے تو وہ سارہ کو بانجھ پن کے الزام میں بے انصافی کے ساتھ سزا دیتے ہوئے طلاق دے دیتے، حالاں کہ فطری انصاف کے لحاظ سے اس پر انھیں (سارہ کو) موردِ الزام ٹھہرانا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

(۱) حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہر لحاظ سے اور تمام مقاصد کے لیے جائز فرزند تھے۔

(۲) جب حضرت ہاجرہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جنم دیا تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قانونی اور شرعی لحاظ سے بالکل جائز بیوی تھیں اور یہ بات کوئی بے انصاف اور بدنیت شخص ہی کہہ سکتا ہے کہ انھیں مکمل بیوی ہونے کی حیثیت حاصل نہ تھی۔

(۳) یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرزند ہونے کی مکمل حیثیت حاصل نہ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے۔ وہ مُشرک معاشرے میں رائج ظالمانہ رسوم کے نہ صرف یہ کہ پابند نہ تھے، بلکہ وہ تو ایسی تمام ظالمانہ رسوم کو تبدیل کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور اس بات کے پابند تھے کہ وہ ان رسوم کو بدلنے کی کوشش کریں۔

۵ 'دی نیو جیروم تفسیر بائبل' نے (صفحہ ۲۴ پر) اس موقع کی وضاحت اس طرح کی ہے:

with her son Isaac: This phrase seems to have dropped out of the MT by haplography [the inadvertent writing once, of what should have been written twice (*Chambers Dic.*, 1995, p.762)]; the phrase is preserved by the LXX and the Vg.

اپنے بیٹے اسحاق کے ساتھ: معلوم یہ ہوتا ہے کہ مسوراتی متن میں غلطی سے یہ الفاظ درج ہونے سے رہ گئے ہیں، جبکہ بائبل کے 'ہفتادی ترجمے' اور 'ولگیٹ' میں یہ الفاظ موجود اور محفوظ ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقام پر بائبل کے مؤلفین سے کچھ ذہول ہو گیا اور اس طرح یہ الفاظ متن میں درج ہونے سے رہ گئے۔ بائبل میں اس طرح کی غلطیاں کوئی انہونی بات نہیں۔

جس لفظ کا ترجمہ اس جگہ 'مذاق اڑانا' کیا گیا ہے، اُس کے متعلق ایک اور نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ عبرانی میں یہ لفظ ص + ح + ق ہے، یہ وہی لفظ ہے جو عربی میں ضحک ہے۔ معنی دونوں لفظوں کے ایک ہی ہیں یعنی ہنسنا۔ خیال رہے کہ عبرانی زبان اور اس کے حروف ابجد میں ض کا حرف نہیں ہے، اس لیے 'ض' کے موقع پر عبرانی میں 'ص' کا حرف ہی استعمال ہوتا ہے۔ 'سٹرونگ کی بائبل کے عبرانی الفاظ کی لغت' میں اندراج ۶۷۱۱ (صفحہ ۹۹) میں اس کے معنی دیے گئے ہیں:

to laugh outright (in merriment or scorn); by impl. to sport:* laugh, mock, play, make sport.

صریحاً ہنسنا (خواہ خوشی سے ہو یا نفرت سے)؛ کنایۃً کھیلنا، ہنسنا، منہ چڑانا، کھیلنا، تفریح کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ گنتھر پلاٹ (Gunther Plaut) کی 'دی توراہ، ایک جدید تفسیر' میں (صفحہ ۱۳۹ پر) اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

Sarah saw the son, whom Hagar the Egyptian had borne to Abraham, playing.

سارہ نے اُس بیٹے کو جسے مصری ہاجرہ نے ابراہیم کے لیے جنا تھا، کھیلتے دیکھا۔

بائبل کے بعض دوسرے تراجم میں بھی اس جگہ 'مذاق اڑانے' کے بجائے 'کھیلنے' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، مثلاً (۱) 'نیو جیروسلم بائبل' (NJB)، (۲) 'نیو آکسفرڈ اینوٹیٹڈ بائبل' (NOAB)۔ [اس نے یہاں 'اُس کے بیٹے اسحاق کے ساتھ کھیلتے ہوئے' کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور نیچے نوٹ دیا ہے: 'یونانی ولگیٹ: عبرانی میں With her son Isaac کے الفاظ نہیں ہیں'] (۳) 'دی توراہ مسوراتی

متن'، (۴) 'نیو امیریکن ورشن' (NAV)، (۵) 'ریوائزڈ سٹینڈرڈ ورشن، کیتھولک ایڈیشن' (RSV-Catholic Ed.)، (۶) 'ٹوڈے انگلش ورشن' (TEV)، (۷) 'گڈ نیوز بائبل' (GNB)، (۸) 'نیو کیتھولک کومنٹری'، (۹) 'سنکینو قماش' [کھیل تفریح]، وغیرہ۔

'وکلف کی تفسیر بائبل' (صفحہ ۲۶) میں اِس واقعے کی بڑی عمدہ وضاحت کی گئی ہے:

It has been translated "mocking," "sporting," "playing," and "making sport." There is no good reason here to introduce the idea of mocking. What Ishmael was doing does not matter so much as the fact that it infuriated Sarah. Perhaps she simply could not bear to see her son playing with Ishmael as with an equal. Or it may be that green-eyed jealousy took full control. Sarah may have feared that Abraham, out of love for Ishmael, would give the older lad the prominent place in the inheritance.

اس کا ترجمہ منہ چڑانا، تفریح، کھیلنا، چھلیں کرنا کیا گیا ہے۔ یہاں منہ چڑانا یا مذاق اڑانا کا تصور پیدا کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ جو کچھ اسماعیل کر رہا تھا، وہ کوئی ایسی بری بات نہ تھی جس سے سارہ اتنی سیخ پا ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ شاید وہ اپنے بیٹے کو اسماعیلؑ کے ساتھ اس طرح کھیلتے ہوئے دیکھنا برداشت نہ کر سکیں، جیسے کوئی اپنے برابر کی حیثیت والے کے ساتھ کھیلتا ہے۔ یا پھر یہ بات ہو سکتی ہے کہ حسد اُس پر پوری طرح چھا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ سارہ کو اس بات کا خوف ہو کہ اسماعیلؑ کی محبت سے مغلوب ہو کر کہیں ابراہیمؑ بڑے لڑکے کو وراثت میں نمایاں مقام اور بڑا حصہ نہ دے دیں۔

معزز اور شریف سارہ کے کردار کو کیسا مکروہ کر کے دکھلایا گیا ہے۔ جس خاتون نے اپنے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اپنے خاوند کی وفاداری کی خاطر اپنا وطن اور کنبہ قبیلہ چھوڑا ہو، ہزاروں میل کا تکلیف دہ سفر برداشت کیا ہو اور جس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرزمینِ مصر میں ایسے عظیم الشان معجزات رونما کیے ہوں، اُس کے متعلق یہ بات کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں کہ وہ اپنے خاوند کی دوسری بیوی اور اپنے خاوند کے بیٹے کی ماں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک روا رکھے گی۔ مزید براں یہ کہ وہ اپنے خدا ترس خاوند کے احساسات کو اتنی بوڑھی عمر میں اس قدر مجروح کرے گی۔ یہ بات بالکل ناقابلِ یقین ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کہانی کا یہ حصّہ قطعی طور پر جھوٹا اور بناوٹی ہے۔

۶۔ یہ بات درست نہیں کہ حضرت ہاجرہ ایک لونڈی یا باندی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مصر کی شہزادی تھیں اور اُن کے والد یعنی شاہ مصر نے اُنھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی بیوی حضرت سارہ کی خدمت

کے لیے اور ایک پاکیزہ ماحول میں پرورش اور نشوونما پانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے کیا تھا۔ بائبل کے مؤلفین نے ایک مقصد کے تحت انھیں کنیز کے طور پر پیش کیا، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

That Hagar appears as a slave-woman is a necessary consequence of the theory on which the Hebrew myth is based, the notion being that Ishma'el was of inferior origin. (Enc. Biblica, p. 1933).

یہ بات کہ ہاجرہ ایک باندی کے طور پر پیش کی گئی ہے، اس نظریے کا لازمی نتیجہ ہے جس پر عبرانی خرافات کی بنیاد ہے اور وہ نظریہ یہ ہے کہ اسماعیل کم تر نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ کی طرف غلامی اس لیے منسوب کی گئی تھی تا کہ اسماعیل علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام سے کم تر ثابت کیا جائے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک مصری شہزادی تھیں، جیسا کہ 'دی جیوئش انسائیکلوپیڈیا' کے مندرجہ ذیل اقتباس سے صاف ظاہر ہے:

According to the Midrash (Gen. R. xlv.), Hagar was the daughter of Pharaoh, who, seeing what great miracles God had done for Sarah's sake (Gen. xii, 17), said: "It is better for Hagar to be a slave in Sarah's house than mistress in her own." In this sense Hagar's name is interpreted as "reward" ("Ha-Agar" = "this is reward."). [Vol. VI, p.138]Hagar is held up as an example of the high degree of godliness prevalent in Abraham's time, (...). Her fidelity is praised, for even after Abraham sent her away she kept her marriage vow, (...). Another explanation of the same name is "to adorn," because she was adorned with piety and good deeds (l.c.). [6:138].

مدراش کے مطابق ہاجرہ فرعون [شاہِ مصر] کی بیٹی تھیں، جس [شاہِ مصر] نے یہ دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سارہ کی خاطر ایسے عظیم الشان معجزات رونما فرمائے ہیں (کتاب پیدائش ۱۲:۱۷) کہا: ہاجرہ کے لیے اس کے اپنے گھر میں مالکہ بن کر رہنے سے یہ بات زیادہ اچھی ہے کہ وہ سارہ کے گھر میں ایک خدمت گار باندی بن کر رہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے ہاجرہ کے نام کی اجر اور انعام کے الفاظ میں تعبیر کی گئی ہے (ھا اجر: یعنی یہ اجر و انعام ہے)۔ ہاجرہ کو ابراہیمؑ کے زمانے میں رائج تقویٰ اور نیکی کی اعلیٰ ترین مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ (...)۔ ان کی وفاداری کی ستائش کی جاتی ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ حضرت ابراہیمؑ نے انھیں باہر بھیج دیا تھا، انھوں نے اپنے نکاح کے میثاق کی پابندی کی۔ (...)۔ اسی نام کی ایک اور وضاحت یہ کی جاتی ہے کہ یہ 'سجانے' سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ تقویٰ اور اعمالِ صالحہ سے مزین تھیں۔

ایچ ای رائل (H. E. Ryle) نے اپنے مقالے 'ہاجرہ' میں یہی رائے ظاہر کی ہے:

Rashi, in his commentary on 6:1, records the belief that Hagar was a daughter of Pharaoh, who, after seeing the wonders that had been done for Sarah, declared that it was better for his daughter to be a bondservant in the house of Abraham than a mistress in the palace of another. (*J. Hastings, Dic. of Bible*, 2:278.)

راشی نے اپنی تفسیر میں ۶:۱ پر یہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھی جس نے ،وہ معجزات دیکھ کر جو سارہ کے لیے نمودار ہوئے تھے، اعلان کیا کہ میری بیٹی کے لیے ابراہیمؑ کے گھر میں باندی بن کر رہنا کسی اور کے محل میں مالکہ بن کر رہنے سے بہتر ہے (جے ہیسٹنگز کی لغات بائبل ۲:۲۷۸)۔

مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ ۲ (باب دوم)۔

ے۔ اس مقام پر 'دی نیو جیروم تفسیر بائبل' میں وضاحت کی گئی ہے:

Sarah in her anger brands her rival "that slave woman and her son," not even mentioning their names (p. 24).

سارہ غصے میں بپھری ہوئی اپنی سوتن کے متعلق کہتی ہیں: 'وہ کنیز عورت اور اس کا بیٹا'۔ اور ان کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتیں۔

یہ بات حضرت سارہ کو ایک ایسی کینہ پرور عورت کے رنگ میں پیش کرتی ہے جو کسی طرح قابلِ یقین نہیں۔ جو کہانی ایسے بے بنیاد واقعات سے عبارت ہو، اُسے ہرگز قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا۔ ذیل کا اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان آیات سے بائبل کے علما کیسے کیسے لایعنی اور ناقابلِ یقین نتائج اخذ کرتے ہیں۔

'دی جیوئش انسائیکلوپیڈیا' میں وضاحت کی گئی ہے:

Sarah took revenge (Gen. xvi) by preventing her intercourse with Abraham, by whipping her with her slipper, and by exacting humiliating services, such as carrying her bathing-materials to the bath (l.c.); she further caused Hagar by an evil eye to miscarry, and Ishma'el, therefore, was her second child." (*Jewish Enc.*, 6:138).

سارہ نے اس [ہاجرہ] کو ابراہیمؑ کے ساتھ ہم بستری کرنے سے روک کر، اپنے جوتے کے ساتھ اس کی پٹائی کر کے اور اپنے گندے مواد کو غسل خانے میں اٹھوا کر لے جانے جیسی توہین آمیز خدمات لے کر بدلہ لیا (کتاب پیدائش باب ۱۶)۔ اُس [سارہ] نے ہاجرہ کو بُری نظر لگا کر اُس کا [پہلا] حمل ضائع کرایا۔ اس طرح [حضرت اسماعیلؑ] اُن کے دوسرے بیٹے بنتے ہیں۔

کیسا مکروہ اور گھناؤنا جھوٹ اور افترا ہے یہ! کوئی شیطان ہی اس پر یقین کرسکتا ہے۔ اس سے حضرت سارہ کا حضرت ہاجرہ اور اُن کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق نا قابلِ یقین حد تک بغض ظاہر ہوتا ہے، جس کے بارے میں بعض فاضل مسیحی علما نے بھی یہ بات محسوس کی ہے (اس سلسلے میں اسی کتاب کا اگلا ذیلی حاشیہ بھی ملاحظہ ہو)۔

۸ اس مقام پر یوجینی ایچ مالی (Eugeni H. Maly) جیروم کی تفسیر بائبل میں بیان کرتا ہے:

Ancient law ordinarily forbade the expulsion of a slave wife and her child, and no justification for it is indicated here as in 16:4; Abraham accordingly hesitates (v.11).

قدیم قانون عام طور پر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کنیز بیوی [ایسی کنیز جسے بیوی بنا لیا گیا ہو] اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکالا جائے۔ اور یہاں ایسی کوئی توجیہ بھی پیش نہیں کی گئی جیسی ۱۶:۴ میں دی گئی ہے، اسی لیے ابراہیمؑ ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے ہیں (آیت ۱۱)۔

لیکن بائبل کے مؤلف کو اس بات میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ اس بے چاری نام نہاد غلام بیوی اور اس کے بچے کے معصوم خون میں رنگین کرے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس انداز میں انھیں بے یار و مددگار اپنے گھر سے نکالتے ہوئے دکھایا گیا ہے، اُس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ کسی نہ کسی ناگہانی مصیبت کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ صرف اپنے اس بے رحمانہ اور غیر انسانی طرزِ عمل کے ذریعے سے اپنی بیوی اور بچے کے سلسلے میں اپنے فطری اور دینی فرائض پسِ پُشت ڈال رہے ہوں، بلکہ زمانۂ قدیم سے رائج گذشتہ انبیا کے ان فطری اور انسانی قوانین کو بھی نظر انداز کر رہے ہوں جو بنیادی طور پر درست تھے اور جن کی مکمل تعمیل ایک انسانی فریضہ تھا۔ کیا روے زمین کا کوئی انسان ایسے غیر انسانی اور ظالمانہ طرزِ عمل کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرسکتا ہے؟

۹ 'دی کالج ولا تفسیر بائبل' میں بیان کیا گیا ہے:

It is Sarah's jealousy, not Hagar's arrogance, that leads her to demand that Abraham expel the two. She fears that Isaac's future inheritance is threatened by Ishmael's presence in the home. (p.60).

یہ ہاجرہ کا تکبر نہیں، بلکہ سارہ کا حسد ہے جو اُس [سارہ] سے یہ مطالبہ کراتا ہے کہ ابراہیمؑ ان دونوں کو گھر

سے نکال دیں۔ اُسے اس بات کا خوف ہے کہ اسماعیلؑ کی گھر میں موجودگی سے اسحاقؑ کی مستقبل کی میراث کو خطرہ ہوگا۔

یہ صریحاً ناانصافی ہے اور معزز سارہ سے ایسے ظالمانہ رویے کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس سے یہ قصہ ایک ناقابلِ یقین جھوٹ کا پلندہ قرار پاتا ہے۔ ذیل میں 'دی ایکسپوزیٹرز بائبل' (The *Expositor's Bible*) سے چند جگر خراش اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے اس قصے کی صداقت کے متعلق نہایت سنجیدہ قسم کے شکوک و سوالات پیدا ہوتے ہیں:

The act of expulsion was itself unaccountably harsh. (…). There may have been some law giving Sarah absolute power over her maid; but if any law gave her power to do what was now done, it was a thoroughly barbarous one, and she was a barbarous woman who used it. It was one of those painful cases in which one poor creature, clothed with a little brief authority, stretches it to the utmost in vindictive maltreatment of another. Sarah happened to be mistress, and, instead of using her position to make those under her happy, she used it for her own convenience, for the gratification of her own spite, and to make those beneath her conscious of her power by their suffering (…). She breathed freely when Hagar and Ishmael were fairly out of sight. A smile of satisfied malice betrayed her bitter spirit. No thought of the sufferings to which she had committed a woman who had served her well for years, who had yielded everything to her will, and who had no other natural protector but her, no glimpses of Abraham's saddened face, visited her with any relentings. It mattered not to her what came of the woman and the boy to whom she really owed a more loving and careful regard than to any except Abraham and Isaac. It is a story often repeated. One who has been a member of the household for many years is at last dismissed at the dictate of some petty pique ['a feeling of annoyance and displeasure, esp. caused by the hurting of one's pride.' (Longman's D. of Eng. Language and Culture, 1992, p. 999] or spite as remorselessly and inhumanly as a piece of old furniture might be parted with. Some thoroughly good servant, who has made sacrifices to forward his employer's interest, is at last, through no offence of his own, found to be in his employer's way, and at once all old services are forgotten, all old ties broken, and the authority of the employer, legal but inhuman, is exercised. It is often those who can least defend themselves who are thus treated; no resistance is possible, and also, alas! the party is too weak to face the wilderness on which she is thrown out, and if any [i.e. any one] cares to follow her history, we may find her at the last gasp under a bush. Still, both for Abraham and for Ishmael it was better this severance should take place. (….). For Ishmael himself, too, wronged as he was in the mode of his expulsion, it was yet far better that he should go. (…). All he required to call out his latent powers was

to be thrown thus on his own resources. (...). But the two fugitives are soon reminded that, though expelled from Abraham's tents and protection, they are not expelled from his God. Ishmael finds it true that when father and mother forsake him, the Lord takes him up. At the very outset of his desert life he is made conscious that God is still his God, mindful of his wants, responsive to his cry of distress. (...). God still "heard the voice of the lad, and the angel of God called to Hagar out of heaven." It is this voice of God to Hagar that so speedily, and apparently once for all, lifts her out of despair to cheerful hope. It would appear as if her despair had been needless; at least from the words addressed to her, "What aileth thee, Hagar?" (....). When Ishmael turned his back on the familiar tents, and flung his last gibe at Sarah, he was really setting out to a far richer inheritance, so far as this world goes, than ever fell to Isaac and his sons. [*The Expositor's Bible* {a commentary in 25 Volumes}, Ed by W. Robertson Nicoll (NY: A. C. Armstrong & Son, 1903), 1:214f, 17-19].

اخراج کا یہ عمل بذاتِ خود نا قابلِ توجیہ حد تک سخت [اور ظالمانہ] تھا۔ (...)۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا قانون پایا جاتا ہو جو حضرت سارہ کو اپنی باندی پر ایسا مطلق اختیار دیتا ہو، لیکن اگر کوئی قانون انھیں یہ سب کچھ کرنے کا اختیار دیتا بھی ہو جو یہاں کیا گیا ہے تو یہ صریحاً ایک وحشیانہ قانون تھا اور جس نے اِسے استعمال کیا، وہ ایک عورت نہیں، بلکہ وحشی درندہ تھی۔ یہ اُن دردناک صورتِ احوال میں سے ایک تھی جس میں ایک حقیر مخلوق، جسے معمولی سے اختیارات کا خلعت نصیب ہو گیا ہو، ان اختیارات کو اپنے کسی حریف کے ساتھ اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے انتہائی بدسلوکی کی حد تک پہنچا دے۔ سارہ کو مالکن کی حیثیت حاصل تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی یہ حیثیت اپنے ماتحتوں کو مسرت اور سہولت مہیا کرنے کے لیے استعمال کرتی، اُس نے اِسے اپنے ذاتی مفاد و آرام کے لیے، اپنے بغض کی تسکین کے لیے اور اپنے زیردستوں کو اذیتیں پہنچا کر انھیں اپنی قوت و اقتدار کا احساس دلانے کے لیے استعمال کیا۔ (...)۔ جب ہاجرہ اور اسماعیلؑ آنکھوں سے قدرے اوجھل ہوئے تو اُس نے سکھ کا سانس لیا۔ اپنے بغض کی تسکین پر اُس کی مسکراہٹ سے اُس کی گھٹیا ذہنیت کا پردہ فاش ہو گیا۔ جس عورت نے سالہا سال تک اُس کی اتنی شان دار خدمات سرانجام دی ہوں، جس نے اپنی ہر چیز اُس کی مرضی پر قربان کر دی ہو اور جس کا اِس [مالکہ] کے سوا کوئی فطری محافظ نہ ہو، اس کے مصائب اور اذیت پر اُسے کسی ہمدردی کا خیال تک نہ آیا۔ [اِس الم ناک اور دل خراش صورتِ حال کی وجہ سے حضرت] ابراہیمؑ کے غم زدہ چہرے کو دیکھ کر بھی اُسے نہ تو کوئی ترس آیا اور نہ کوئی ندامت محسوس ہوئی۔

اُسے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس عورت اور اس کے بیٹے کے ساتھ کیا گزری جس کے ساتھ اُسے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو چھوڑ کر باقی سب سے زیادہ محبت اور مُرُوّت کا رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ یہ ایک ایسی کہانی

ہے جو بار بار رونما ہوتی رہتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو سالہا سال تک ایک گھر میں خاندان کے ایک فرد کی طرح رہا ہو، اُسے کسی معمولی سی ناپسندیدگی یا رنجش کی بنا پر ایسی بے رحمی سے غیر انسانی انداز میں برطرف کر کے گھر سے نکال دیا جاتا ہے، جس طرح پرانے فرنیچر کے ایک ناکارہ ٹکڑے کو باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ ایک انتہائی شریف ملازم، جس نے اپنے مالک کے مفادات کی تکمیل کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا ہو، بغیر اُس کے کسی قصور کے آخر کار اُس سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر لیا جاتا ہے۔ اُس کی تمام خدمات کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اور اُس کا مالک اپنے اُس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے، جو شاید قانوناً تو درست ہو، لیکن ہو انتہائی ظالمانہ اور غیر انسانی، اُسے اپنے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ اس طرح کا سلوک اکثر اُن لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، جن میں اپنی مدافعت کی قدرت نہ ہو، کوئی دفاع اور مقاومت ممکن نہ ہو اور افسوس اس بات کا بھی ہے کہ یہ محترم خاتون اتنی کمزور ہے کہ جس صحرا میں اُسے پھینکا گیا ہے، اُس کی سختیاں جھیلنا اس بے چاری کے بس کی بات نہیں۔ اگر کوئی شخص اس بے چاری کی داستان تلاش کرنا چاہے تو شاید ہم اس کے علاوہ کچھ نہ دیکھ سکیں کہ وہ ایک جھاڑی کے نیچے پڑی اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے، لیکن ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ دونوں کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ یہ سختی جھیلیں۔ (...) اگرچہ جس انداز میں اسے گھر سے نکالا گیا تھا، وہ بہت غلط تھا، لیکن بذاتِ خود اسماعیلؑ کے لیے بھی یہ بہت بہتر تھا کہ وہ چلا جائے۔ (...) اُسے اپنی مخفی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت تھی، وہ یہی تھی کہ اُسے خود اُس کے اپنے سہارے پر یوں بظاہر بے آسرا باہر پھینک دیا جائے۔ (...)۔

لیکن ان دونوں نکالے ہوؤں کو جلد ہی یہ بات ذہن نشین کرا دی گئی کہ اگرچہ وہ ابراہیمؑ کے خیموں اور حفاظت سے محروم ہو گئے ہیں، لیکن وہ اُس کے خداوند کی حفاظت سے محروم نہیں ہوئے۔ اسماعیلؑ اس بات کو سچ پاتا ہے کہ جب ماں اور باپ اُسے چھوڑ دیتے ہیں تو خداوند اُسے سنبھال لیتا ہے۔ صحرا میں اپنی زندگی کے آغاز ہی میں اُسے اِس بات کا احساس دلا دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں اُس کے ساتھ ہے، اُس کی ضروریات کے بارے میں اُسے پورا دھیان ہے اور وہ مصیبت کے وقت اُس کی فریاد سُنتا اور اُس کی مراد بر لاتا ہے۔ (...)۔ اللہ تعالیٰ نے اس حال میں بھی 'اُس لڑکے کی آواز سنی اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا'۔ خداوند کا ہاجرہ سے یہی ارشاد تھا جس نے اتنی برق رفتاری سے اور علی الاعلان اُسے ہمیشہ کے لیے مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر پُر مسرت اُمید کی روشنی عطا کی۔ دکھائی یہ دیتا ہے کہ گویا اُس کی مایوسی بے حقیقت تھی۔ کم از کم ان الفاظ کو دیکھتے ہوئے کہ 'ہاجرہ تو پریشان کیوں ہوتی ہے؟' تو واقعی اُس کی یہ مایوسی بالکل غیر ضروری نظر آتی ہے۔ (...)۔ جب اسماعیلؑ نے اپنے پیارے اور بچپن سے شناسا خیموں سے منہ موڑا اور سارہ پر آخری نظر ڈالی تو وہ، جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، حقیقت میں ایک ایسی عظیم الشان

میراث کی طرف روانہ ہو رہا تھا جو اسحاقؑ اور اُس کی نسل کو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوئی۔

ایک خاتون کے ظلم اور بدسلوکی اور دوسری خاتون کی اُس کے ہاتھوں محرومی اور بدنصیبی کا نہایت خوبصورت الفاظ میں ترتیب دیا ہوا یہ مؤثر اور دل گداز بیان ادبی تاریخ کا ایک عظیم شہ پارہ ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ بالکل ناقابلِ یقین ہے۔ یہ حضرت سارہ کو ایسی ظالم، حاسد، چڑچڑی، بدمزاج اور گھٹیا ذہنیت کی عورت کے طور پر پیش کرتا ہے، جو ایک ایسی عورت کے کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مصر میں ایسے عظیم الشان معجزات برپا کیے ہوں اور جو اپنے خاوند کے تکلیف دہ سفرِ ہجرت کی ساری مدت کے دوران میں اس کی انتہائی وفادار رہی ہو، بلکہ یہ کہانی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ایسے بے انصاف، نافرض شناس اور غیر ذمہ دار شخص کے رنگ میں پیش کرتی ہے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سوتیلی ماں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر اپنے پہلوٹھے بیٹے اور اس کی ماں کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں سے مجرمانہ چشم پوشی برتتا ہے۔ اس طرح اس بات میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا کہ کہانی کا یہ حصہ سراسر غلط ہے اور بائبل کے کسی تنگ دل اور متعصب مؤلف کی افترا پردازی کا نتیجہ ہے۔ بزرگ نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریکِ حیات ہونے کی حیثیت سے حضرت سارہ یقیناً ایک فیاض اور رحم دل خاتون ہوں گی۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ یہ کہانی سراسر ناقابلِ اعتبار ہے، بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی سوتیلی ماں کے حسد کا شکار ہو کر گھر سے نکالے ہوئے نہ تھے، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا منصوبہ تھا کہ سرزمینِ عرب کے قلب میں توحید کا ایک مرکز قائم کیا جائے۔ دوسری طرف یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفا کا امتحان بھی تھا اور حضرت ہاجرہ و اسماعیل علیہ السلام کی آزمائش اور تربیت کا ذریعہ بھی تھا تاکہ اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اعتماد مضبوطی سے راسخ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تسلی دی کہ وہ اس بچے اور اس کی ماں کو نہ تو بے سہارا چھوڑے گا اور نہ انھیں بیابان میں ہلاک ہونے دے گا، بلکہ 'دی بائبل نالج کومنٹری' صفحہ ۶۳ کے مطابق:

God assured Abraham that Ishmael would have a future because he too was Abraham's offspring (vv. 11-13) [*'The Bible Knowledge Com.'*, (Illinois: Victor Books, 1985), p. 63]

اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو یقین دلایا کہ اسماعیلؑ کا مستقبل بہت تابناک ہے، کیونکہ وہ بھی ابراہیمؑ کی نسل سے ہے۔

فیلو نے حضرت سارہ کی زبانی حضرت ہاجرہ کے اوصافِ حمیدہ بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

(....); whose good qualities I have for a long time proved and experienced from the day when she was first introduce into my house, being an Egyptian by blood, and a Hebrew by deliberate choice.(The Works of Philo, tr. C.D. Yonge [Hendrickson, Publishers, Inc. AGES Software Albany, OR USA, 1999], P.984, Para No. 251).

(....) جس (ہاجرہ) کے اوصافِ حمیدہ ایک طویل عرصے سے مجھ پر واضح ہو چکے اور میرے مشاہدے میں آئے ہیں جس دن سے وہ پہلی دفعہ میرے گھر میں آئی تھی۔ وہ اگرچہ نسلی اعتبار سے ایک مصری ہے، لیکن اپنے آزادانہ انتخاب و اختیار کے لحاظ سے ایک عبرانی ہے۔

۱۰۔ 'دی نیو جیروم تفسیر بائبل' (صفحہ ۲۴) میں وضاحت کی گئی ہے:

The peaceful playing of the two boys stirs in Sarah deep feelings of anxiety about her own son's inheritance, since both boys are sons of Abraham, (...), she wants Isaac alone to be the heir of the grand promises.

دو لڑکوں کو پُر امن طور پر آپس میں کھیلتے دیکھ کر سارہ کے دل میں اپنے بیٹے کی میراث کے بارے میں تشویش کے گہرے احساسات پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں ہی ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ (...)۔ وہ چاہتی ہے کہ وارث بننے کے سلسلے میں تمام عظیم وعدے صرف اسحاقؑ کی ذات ہی میں پورے ہوں۔

یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ حضرت سارہ ایسی بدنیت، حاسد، بے انصاف اور خود غرض ہو سکتی ہیں۔

۱۱۔ 'دی نیلسن اسٹڈی بائبل' (صفحہ ۴۳) میں بیان ہے:

But even in that culture it was reprehensible to send Ishmael away. When a surrogate wife had borne a son to one's husband, that mother and child could not be dismissed even if the first wife subsequently gave birth to a son. This partly explains Abraham's reluctance to do what Sarah demanded.

لیکن اُس کلچر میں بھی یہ بات بُری اور ناقابلِ قبول تھی کہ اسماعیلؑ کو اس طرح دُور بھجوا دیا جاتا۔ جب ایک متبادل بیوی کے ہاں کسی عورت کے خاوند کے لیے بیٹا پیدا ہو جاتا تو اس ماں اور بچے کو اس کے باوجود بھی برطرف نہیں کیا جا سکتا تھا کہ پہلی بیوی کے ہاں بھی بعد میں ایک بیٹا پیدا ہو جائے۔ اس سے ابراہیمؑ کی اس جھجک کی وضاحت ہو جاتی ہے جو انھوں نے سارہ کے مطالبے پر عمل کرنے میں ظاہر کی تھی۔

بی ووٹر (B.Vowter) نے بھی 'اے نیو کیتھولک کمنٹری' میں (صفحہ ۱۹۳ پر) ایسے ہی خیالات کا اظہار

کیا ہے:

Sarai did not have the right to send Hagar away, since Ishmael was Abraham's heir.

سارائی کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ ہاجرہ کو نکال باہر کرتیں، کیونکہ اسماعیلؑ ابراہیمؑ کے وارث تھے۔

اِسی تفسیر میں صفحہ ۱۹۵ پر وضاحت کی گئی ہے:

However, for a jealous mother, it sufficed to see her son together with the slave-girl's on a position of equality for her to demand the expulsion of Hagar and her child. If the situation presupposed is that which seems to underlie ch 16, then Sarah did not have the right to drive Hagar away; see on 16:1-6. As contrary to established social custom.

تاہم ایک حاسد ماں کے لیے اپنے بیٹے کو باندی کے بیٹے کے ساتھ برابری کی حیثیت میں دیکھنا ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ وہ ہاجرہ اور اُس کے بچے کو گھر سے نکالنے کا مطالبہ کر دیتی۔ اگر پہلے سے فرض کی ہوئی صورتِ حال یہی ہے جو باب ۱۶ کی تائید کرتی ہے تو سارہ کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ مسلّمہ معاشرتی رواج کے خلاف ہاجرہ کو نکال باہر کرتی۔ (ملاحظہ کیجیے ۱۶:۱-۶)

ایک شخص یہ کیسے یقین کر سکتا ہے کہ حضرت سارہ کے مرتبہ و مقام کی نیک اور شریف خاتون سے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے عظیم الشان پیغمبر کی رفیقِ حیات بھی ہو، ایسا گھناؤنا جُرم سرزد ہو سکتا ہے۔ اِس کے بعد بھی کوئی شخص اس من گھڑت افسانے کو حقیقت قرار دے سکتا ہے؟

۱۲ 'دی نیو جیروم تفسیر بائبل' نے بجا طور پر محسوس کیا ہے کہ:

To Abraham, the natural father of Ishma'el, Sarah's ultimatum causes great pain (24).

اسماعیلؑ کے فطری والد ابراہیمؑ کے لیے سارہ کا الٹی میٹم شدید اذیت کا باعث بنا۔

ایک نیک اور خدا ترس خاتون اپنے خاوند کے احساسات کو اس طرح مجروح نہیں کر سکتی۔ یہ بھی اِس واقعہ کے قابلِ اعتبار ہونے کی حیثیت کو مجروح کر دیتا ہے۔

۱۳ اِس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق فطری محبت آمیز رنج و الم کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اُن کو تسلی دیتا ہے کہ اُن کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جب تم یہ کام میرے حکم کے تحت سرانجام دے رہے ہو تو تمھیں یقین رکھنا چاہیے کہ میں اسے ہلاک ہونے کے لیے نہیں چھوڑوں گا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

اپنے پہلوٹھے اور اکلوتے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے۔

۱۴۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے لیے مکمل فطری اُنس اور لگاؤ رکھتے تھے۔ پھر وہ انھیں ان کی بے رحم اور حریف سوتن کے رحم وکرم پر کیسے چھوڑ سکتے تھے۔

۱۵۔ ہفتادی ترجمہ، ولگیٹ، سامری تورات اور سریانی بائبل میں لفظ 'قوم' سے پہلے 'عظیم' کا لفظ موجود ہے، جو یہاں حذف کیا ہوا ہے۔ اس سے بائبل کے بعد کے ایڈیشنوں کے مؤلفین کی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی نسل کے خلاف عداوت کا کھلم کھلا اظہار ہوتا ہے۔ 'نیو جیروم تفسیر بائبل' میں درج ہے:

Besides, from Ishmael "a great (LXX, Vg, Sam, Syr) people" will come forth. (24).

اس کے علاوہ اسماعیلؑ سے ایک بڑی قوم برپا ہوگی۔

'نیو جیروسلم بائبل' کے الفاظ یہ ہیں:

But the slave-girl's son I shall also make into a great nation, for he too is your child. (p.40).

لیکن باندی کے بیٹے کو بھی میں ایک عظیم قوم بناؤں گا، کیونکہ وہ بھی تمھارا بیٹا ہے۔

بائبل کے کچھ دوسرے تراجم نے بھی 'قوم' کے ساتھ 'عظیم' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً (۱) 'وکلف کی تفسیر بائبل'، (۲) 'کنٹمپریری انگلش ورشن' (CEV)، (۳) 'ناکس' (Knox)، (۴) 'نیو جیروسلم بائبل' (NJB)، (۵) 'نیو انگلش بائبل' (NEB)، (۶) 'نیو امیریکن بائبل' (NAB) اور (۷) 'کالج ولا تفسیر بائبل' وغیرہ۔ بعض مؤلفین کی طرف سے لفظ 'عظیم' کا حذف کرنا قابل توجہ ہے۔

۱۶۔ بائبل کے مندرجہ ذیل جملوں کا بغور مطالعہ کیا جائے:

کیونکہ تیری نسل اضحاق سے پکاری جائے گی۔ اور باندی کے بیٹے سے بھی میں ایک [بڑی] قوم بناؤں گا، کیونکہ وہ بھی تیری نسل ہے۔

پہلے جملے 'کیونکہ تیری نسل اسحاقؑ سے [کے نام کے ساتھ] پکاری جائے گی' کے الفاظ کا کیا مفہوم ہے؟ اس میں اور اس سے اگلے جملے 'اور باندی کے بیٹے سے بھی میں ایک [بڑی] قوم بناؤں گا، کیونکہ وہ بھی تیری نسل ہے' کے درمیان کیا فرق ہے؟

اگر کوئی شخص کہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کے نام کے ساتھ

پکاری جائے گی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے نام کے ساتھ نہیں پکاری جائے گی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جائز فرزند نہ تھے؟ اس طرح کے دو مترادف جملوں کے معانی مختلف کیسے ہو سکتے ہیں؟

۱۷ اس لفظ 'مشک یا بوتل' کے لیے عبرانی لفظ 'حمت' ہے، جس کے معنی ہیں: 'ایک کھال'۔ یہی ترجمہ (کھال) 'نیو جیروسلم بائبل' وغیرہ نے بھی کیا ہے۔ 'سٹرونگ کی مختصر عبرانی بائبل ڈکشنری' (اندراج ۲۵۷۳ صفحہ ۴۱) میں 'کھال کی بوتل' درج ہے۔ 'سمتھ کی بائبل ڈکشنری' لفظ 'بوتل' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتی ہے:

The Arabs keep their water, milk and other liquids in leathern bottles. These are made of goatskins. When the animal is killed they cut off its feet and its head, and draw it in this manner out of the skin without opening its belly.'

عرب کے لوگ اپنا پانی، دودھ اور دوسرے مائعات چمڑے کی بوتلوں (مشکیزوں) میں رکھتے ہیں۔ یہ بکرے کی کھال کے بنے ہوتے ہیں۔ جب جانور ذبح کیا جاتا ہے تو وہ اس کے پاؤں اور اس کا سر الگ کر دیتے ہیں اور اس کا پیٹ کھولے بغیر اسے کھال کے اندر سے کھینچ لیتے ہیں۔

۱۸ چند دوسرے تراجم اس طرح ہیں:

(i) and took bread and a skin of water, and gave it to Hagar, putting it on her shoulder, along with the child (RSVCT, p.16).

اور روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ لیا اور یہ ہاجرہ کو دیا، اسے اس بچے کے ساتھ اُس کے کندھے پر رکھا۔

(ii) gave bread and a skin bag of water. He put the child on her back-CCB, p. 72;

روٹی اور پانی کا مشکیزہ دیا۔ اس نے بچے کو اُس کی پشت پر رکھا۔

(iii) took some bread and a skin of water and, giving them to Hagar, put the child on her shoulder- (*Jerusalem Bible*, p. 40).

کچھ روٹی اور پانی کا مشکیزہ لیا اور انھیں ہاجرہ کو دے کر بچے کو اُس کے کندھے پر رکھا۔

(iv) and took bread and a skin of water, and gave it to Hagar, putting it on her shoulder, along with the child, (NOAB, p. 26).

اور روٹی اور پانی کا مشکیزہ لیا اور اسے ہاجرہ کو دیا، اسے اُس بچے کے ساتھ اُس کے کندھے پر رکھا۔

(v) took some bread and a skin of water, and gave them to Hagar. He placed them over her shoulder, together with the child, (*Massoretic Text*, Philadelphia,

1967) p. 34.

کچھ روٹی اور پانی کا مشکیزہ لیا اور یہ ہاجرہ کو دیے۔ اُس نے انھیں اپنے کندھے پر رکھا، اُس بچے سمیت۔

یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ بے چاری ہاجرہ روٹی کا ایک تھیلا، پانی سے بھرا ہوا ایک مشکیزہ اور اس پر مستزاد سترہ سال کے ایک لڑکے کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھا سکتی (کیونکہ اگر بائبل کا یہ بیان درست مان لیا جائے کہ یہ واقعہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا دودھ چھڑانے کی ضیافت کے موقع پر رونما ہوا تھا تو اُس وقت تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر سولہ سترہ سال بنتی ہے)۔ اور یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا نیک سرشت، خدا ترس، مہمان نواز، رحم دل اور بزرگ نبی اپنی دوسری بیوی کے لیے جو اس کے پہلوٹے بیٹے کی ماں بھی تھی، اتنا ظالم بن گیا ہو۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ بیٹا جو سترہ سال کا ایک نوجوان ہے، اپنی مہربان والدہ کی خدمت اور مدد کرنے کے بجائے اس کی تکلیف اور توہین میں اضافہ کرتے ہوئے چھلانگ لگا کر اُس کے کندھے پر سوار ہوگیا۔ کیا یہ سب حضرت سارہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسی نیک اور شریف ہستیوں کی کردار کشی کی ایک صریح سازش نہیں ہے؟ کیا کوئی شریف آدمی ایسی بزرگ ہستیوں کے بارے میں ایسی باتوں پر یقین کرسکتا ہے؟ 'نیو امریکن بائبل' کے ان آیات پر ایک ذیلی حاشیے (صفحہ ۲۰) سے ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل کے مؤلفین نے اس کے متن کو اپنے خیالات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کس آزادی اور بے تکلفی سے اس میں اصلاح (جسے اصل میں تحریف کہنا چاہیے) اور تبدیلیاں کی ہیں:

Placing the child on her back: the phrase is translated from an emended form of the Hebrew text. In the current faulty Hebrew text, Abraham put the bread and the waterskin on Hagar's back, while her son apparently walked beside her. This reading seems to be a scribal attempt at harmonizing the present passage with the data of the Priestly source, in which Ishmael would have been at least fourteen years old when Isaac was born; (...). But in the present Elohist story Ishmael is obviously a little boy, not much older than Isaac.

'بچے کو اپنی پشت پر رکھتے ہوئے': یہ عبارت بائبل کے عبرانی متن کی اصلاح شدہ شکل کا ترجمہ ہے۔ موجودہ ناقص عبرانی متن میں ابراہیم نے روٹی اور پانی کا مشکیزہ ہاجرہ کی پشت پر رکھا، جبکہ اس کا بیٹا بظاہر اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ قراءت بائبل کی موجودہ عبارت کو پریسٹلی ماخذ سے ہم آہنگ کرنے کی کاتب کی کوشش دکھائی دیتی ہے، جس میں اسماعیلؑ اُس وقت کم از کم چودہ سال کے ہونے چاہییں جب اسحاقؑ

پیدا ہوئے۔ (...)۔ لیکن موجودہ الوہسٹ کہانی میں اسماعیلؑ صریحاً ایک چھوٹے لڑکے ہیں، جو اسحاقؑ سے بڑے نہیں ہیں۔

۱۹ یہ بات بالکل غیر فطری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی سارہ کے حکم پر، جو حضرت ہاجرہ کی سوتن اور حریف تھیں، اپنے پیارے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ حضرت ہاجرہ کو اس طرح بے یارومددگار کر کے گھر سے نکال باہر کیا ہو کہ وہ صحرا نوردی کرتی پھریں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انصاف اور رحم کا نقیب ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنی بیویوں کے درمیان انصاف کرتے۔ معزز سارہ بھی ایسی ظالم نہیں ہو سکتی تھیں کہ وہ اپنے خاوند کو ایسے ظالمانہ اقدام کے لیے کہتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت سرزمین عرب کے قلب میں توحید کا یہ مرکز قائم کرنے کے لیے یہ فریضہ سرانجام دیا تھا۔ اور یہ بات پہلے سے طے شدہ تھی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کھلے اور بے آباد ماحول میں آزادانہ پروان چڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کے مہیا کردہ رزق اور تحفظ کا بچشمِ سر مشاہدہ کر سکیں، تا کہ اُن کے اندر اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت یہ چاہے کہ وہ اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کر دیں تو وہ اس میں کوئی پس و پیش نہ کریں۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اور اس کی توفیق سے سرانجام دیا تھا، اس لیے انھیں اس لڑکے اور اُس کی ماں کے مستقبل کے متعلق پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تسلی دی کہ وہ بچے اور اُس کی ماں کو نگرانی سے محروم نہیں رکھے گا اور نہ انھیں اس بیابان میں ہلاک ہونے دے گا، بلکہ 'دی بائبل نالج کمنٹری' میں صفحہ ۶۳ پر ایلن پی راس (Allen P. Ross) کی وضاحت کے مطابق:

God assured Abraham that Ishmael would have a future because he too was Abraham's offspring (vv. 11-13).

اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو یقین دلایا کہ اسماعیلؑ کا ایک [تابناک] مستقبل ہوگا، کیونکہ وہ بھی ابراہیمؑ کی نسل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے پہلے بے خطر آتشِ نمرود میں کود چکے تھے، جو بظاہر ایک خودکشی نظر

آتی ہے، جس کی کسی مذہب یا ضابطۂ حیات میں اجازت نہیں ہے۔ وہ دینِ حق کی خاطر بے جھجک اپنا وطن چھوڑ چکے تھے اور اُن [اسماعیلؑ] کی خاطر عظیم معجزات رونما ہوتے دیکھ چکے تھے، اس لیے انھیں اپنے اس پیارے اکلوتے بیٹے اور اس کی والدہ کے مستقبل کے لیے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ وہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے غیر مبہم اور واضح احکام کے تحت سرانجام دے رہے تھے۔ اس طرح کہانی کا یہ حصہ ایک صریح افترا کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

۲۰ یعنی بیر سبع (سات کا کنواں) کے اردگرد حیران اور پریشان کر دینے والی، خوف ناک، بے آباد، بنجر اور پہاڑی سرزمین۔

۲۱ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام سولہ سترہ سال کے پلے بڑھے ایک نوجوان ہوتے تو حضرت ہاجرہ کس طرح اس بچے کو ایک جھاڑی کے نیچے پھینک سکتی تھیں۔ اس طرح یہ بات بالکل فیصلہ کن انداز میں واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کو بیر سبع میں آباد کرنے کا واقعہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بچپن میں رونما ہوا تھا اور حضرت سارہ کے نام نہاد حسد اور اسحاق علیہ السلام کے دودھ چھڑانے کی ضیافت والا قصہ بالکل بے بنیاد ہے۔

۲۲ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو تنہا اور بے آسرا نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اگر اُن کے والد نے انھیں وہاں چھوڑا تھا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں چھوڑا تھا تو اللہ تعالیٰ اُس کے محافظ اور نشوونما کرنے والے کے طور پر وہاں موجود تھا۔

۲۳ حقیقت میں یہ خداوند کا فرشتہ نہیں، بلکہ بذاتِ خود اللہ تعالیٰ ہی تھا جس نے حضرت ہاجرہ کو پکارا تھا۔ یہ بائبل کے مؤلفین کی ایک طرح سے تحریف ہے جو انھوں نے اپنے توہمات کی تسکین کے لیے کی ہے۔ 'اے نیو کیتھولک کمنٹری' نے (صفحہ ۱۹۳ پر) وضاحت کی ہے:

Here and in 9f reference is made to the 'angel of Yahweh', while in 13 the Person who speaks to Hagar is identified with Yahweh himself. By some this is explained by assuming that in the most primitive form of the story the speaker was Yahweh himself, and only later out of reverence the word 'angel' was inserted in some places (...). However, it is doubtful in these ancient times whether the Israelites thought of the 'angel of Yahweh' as personage distinct from Yahweh himself. The 'angel' (malak), lit. 'messenger' was rather Yahweh himself made manifest to man.

یہاں اور آیت ۱۹ بعد میں 'اللہ تعالیٰ کے فرشتے' کا حوالہ دیا گیا ہے، جبکہ آیت ۱۳ میں جو شخص حضرت ہاجرہ سے کلام کر رہا ہے، وہ بذات خود اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ تاویل اختیار کرتے ہوئے اس کی تشریح کی ہے کہ کہانی کی انتہائی قدیم صورت میں متکلم بذات خود اللہ تعالیٰ ہی تھا اور یہ صرف بعد میں ادب کے طور پر بعض مقامات پر لفظ 'فرشتہ' داخل کر دیا گیا ہے۔ (...)۔ تاہم ان قدیم ایام میں یہ بات بھی مشکوک ہے کہ کیا اسرائیلی 'خداوند کے فرشتے' کو بذات خود اللہ تعالیٰ سے کوئی الگ شخصیت سمجھتے تھے۔ 'فرشتہ' (ملک)، جس کے لغوی معنی پیغام بر ہیں، اصل میں خود اللہ تعالیٰ ہی تھا جو انسان کے سامنے نمودار ہوتا تھا۔

یوجین ایچ مالی (Eugene H. Maly) نے بھی 'جیروم تفسیر بائبل' میں صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے:

The versions have the correct reading, as in the CCD. "God heard" is a play on the child's name (cf. 16:11), but, to avoid the anthropomorphism, E. has "the angel of God" speak to Hagar.

سی سی ڈی (Confraternity of Christian Doctrine Tr. of the Bible) کی طرح مختلف تراجم نے بھی صحیح قراءت 'خداوند نے سنا' ہی قرار دی ہے، جو بچے کے نام سے مناسبت رکھتی ہے (دیکھیے ۱۶:۱۱)، لیکن انسان کے ساتھ مشابہت سے بچنے کے لیے الوہسٹ (Elohist) نے 'خداوند کے فرشتے' کو حضرت ہاجرہ سے ہم کلام ہوتے دکھایا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس نے حضرت ہاجرہ سے خطاب کیا تھا، وہ خود اللہ تعالیٰ ہی تھا، لیکن بائبل کے مؤلف نے حضرت ہاجرہ کے متعلق اپنے ذاتی خیالات کی بنا پر یا کسی اور مناسبت سے اسے 'خداوند کا فرشتہ' میں بدل دیا ہے۔

۲۴۔ کیسی خوش نصیب ہے یہ ہاجرہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ آسمان سے بذات خود ہم کلام ہو رہا ہے (لیکن اس تحریف شدہ ترجمے کے مطابق یہ خطاب 'خداوند کے فرشتے کی طرف سے' تھا)۔

۲۵۔ کیا اس سے حضرت ہاجرہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم محبت اور انسیت ظاہر نہیں ہو رہی؟ کیا یہ جلاوطنی معزز ہاجرہ کے لیے برکت ہے یا کچھ اور؟

۲۶۔ کیونکہ تمھیں ہر قسم کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ بذات خود موجود ہے۔ وہ تمھاری تمام ضروریات، حالات اور متوقع مصائب سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور تمھیں اور تمھارے بیٹے کو ہر وہ چیز مہیا کرے گا جو تمھیں درکار ہے۔

۲۷۔ اس سے پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی محبت اور لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔

۲۸۔ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام سولہ یا سترہ سال کے بھرپور نوجوان ہوتے تو حضرت ہاجرہ کس طرح انھیں اُٹھا کر اپنے ہاتھوں میں تھام سکتی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کی بیر سبع (چاہ زمزم) میں آباد کاری حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بچپن میں رونما ہوئی تھی اور دودھ چھڑانے کی ضیافت کی کہانی اور خدا ترس اور معزز سارہ کا نام نہاد ظلم اور حسد بالکل بے بنیاد بات ہے۔

۲۹۔ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام سولہ یا سترہ سال کے نوجوان ہوتے تو یہ سارے کام اُنھیں سرانجام دینے چاہییں تھے، نہ کہ اُن کی والدہ ہاجرہ کو، جو ایک بوڑھی خاتون تھیں۔ یہ بات بھی قاری کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیر سبع اور فاران کے بیابان میں آباد کیے جانے کے وقت کے تعین میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اس سے کہانی کے اس حصے کا قابلِ اعتبار ہونا بھی متاثر ہوتا ہے۔

۳۰۔ اللہ تعالیٰ بار بار حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے اپنا لگاؤ ظاہر کر رہا ہے۔ یہ لڑکا کیسے ہلاک و برباد ہو سکتا تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کے متعلق پریشان ہونے کی کیوں ضرورت پیش آتی، جبکہ اللہ تعالیٰ اُس کی حفاظت اور نشو ونما کے لیے ہر وقت اُس کے ساتھ تھا (جس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود غیر مبہم الفاظ میں کیا ہے)۔

۳۱۔ یہاں جس 'فاران' کا ذکر کیا گیا ہے، وہ مکے کا نام ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو اس کتاب کے مصنف نے کسی اور جگہ کی ہے (لیکن کتاب ہذا میں نہیں)۔ یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسماعیل علیہ السلام کو جب فاران یا بیر سبع میں بھیجا گیا تھا، اُس وقت وہ دودھ پیتے بچے یا دودھ چھڑائے جانے کے قریب تھے، ورنہ حضرت ہاجرہ نہ تو اُس بچے کو اپنے کندھے پر رکھ سکتی تھیں نہ اس لڑکے کو اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں تھام سکتی تھیں اور نہ اُس بچے کو ایک جھاڑی کے نیچے پھینک سکتی تھیں۔ اس سے حضرت اسحاق علیہ السلام کے نام نہاد دودھ چھڑائے جانے کی ضیافت کا قصہ ایک بے بنیاد اور من گھڑت افسانہ ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر:

(الف) اسحاقؑ وہاں موجود ہی نہ ہو سکتے تھے کہ اسماعیلؑ ان کا منہ چڑاتے۔ بائبل میں صاف لکھا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اُس وقت اتنی چھوٹی عمر کے بچے تھے کہ اُن کی والدہ انھیں گود میں اٹھا سکتی تھیں، اس

لیے حضرت اسحاق علیہ السلام کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو اُس وقت پیدا ہوئے تھے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر پہلے ہی چودہ سال کی ہو چکی تھی۔

(ب) حضرت سارہ حسد، ظلم اور بربریت کے تمام الزامات سے بری قرار پاتی ہیں۔

۳۲۔ کتاب مقدس، پیدائش ۲۱: ۸-۲۱۔

۳۳۔ 'نیو جیروسلیم بائبل' نے یہاں (۲۱:۲۱) ذیلی حاشیے میں ایک تعارفی شذرہ 'الف' قلم بند کیا ہے:

At this point the three traditions are fused together: vv. 1a, 2a, 7 follow on from 18:15 and are Yahwistic; vv. 2b, 5 follow on from 17:21 and are priestly; vv. 1b, 6 are Elohist.

اس مقام پر تینوں روایتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں: (الف) آیات ۱۔الف، ۲۔الف اور ۷ کا تعلق باب ۱۸ آیت ۱۵ سے ہے۔ یہ یہوسٹ روایت کا حصہ ہیں۔ (ب) آیات ۲۔ب اور ۵ کا تعلق ۱۷:۲۱ سے ہے اور یہ پریسٹلی روایت کا حصہ ہیں۔ (ج) آیات ۱۔ب اور ۶۔ الوہسٹ روایت کا حصہ ہیں۔

پولین اے وی ویانو (Pauline A. Viviano) 'دی کالج وِلا تفسیر بائبل' (صفحہ ۵۹) پر لکھتا ہے:

All three sources are found in this account of the birth of Isaac.

اسحاقؑ کی پیدائش کے اس بیان میں تینوں مآخذ موجود ہیں۔

۳۴۔ 'دی کالج وِلا تفسیر بائبل' (صفحہ ۶۰) پر رقمطراز ہے:

The Elohist narrative of Isaac's birth (vv. 8-21) is a duplicate of the story of expulsion of Hagar and Ishmael found in the Yehwistic version in chapter 16.

اسحاقؑ کی پیدائش کے بارے میں الوہسٹ کا بیان (آیات ۸-۲۱) ہاجرہ اور اسماعیلؑ کے اخراج کی اُس کہانی کا مثنیٰ ہے جو باب ۱۶ کے یہوسٹ ورشن میں درج ہے۔

35. *The Collegeville Bible Com.*, 60.

۳۶۔ یہاں پر انگریزی کا لفظ 'Desolate' درج ہے اور اس کے معنی ہیں:

sad and without people, comfort, hope, or friends, etc.

'اداس' اور 'لوگوں، آسائش، امید، یا دوستوں وغیرہ کے بغیر'۔

بائبل میں اس کے لیے اصلی عبرانی لفظ 'بدد' (Badad) ہے، جس کا مطلب ہے:

alone, desolate, only, solitary.

'تنہا، اجاڑ، اکیلا'۔ ('سٹرونگ کی عبرانی ڈکشنری'، اندراج ۹۱۰، صفحہ ۱۹)۔

37. KJV-Isa. 27:10, p. 568.

38. *Enc. Biblica*, 1:1076-77.

39. *The Interpreter's Bible Dic.* (NY: Abingdon Press, Nashville, 1962), 5:946.

40. *The Interpreter's Bible Dic.*, 4:844.

41. William Smith, *A Dic. of the Bible*, p. 143.

42. *Harper's Bible Dic.*, p. 1133.

۴۳۔ 'بیر سبع' عبرانی زبان کا ایک مرکب لفظ ہے۔ بیر کے معنی کنواں اور سبع کے معنی ہیں 'سات' یا 'حلف'۔ اس کے اجزا کا تلفظ ہے: 'بیر' + 'سبع' ('سٹرونگ کی عبرانی بائبل ڈکشنری' اندراج ۸۸۳ صفحہ ۱۸)۔

۴۴۔ 'انسائیکلوپیڈیا ببلیکا' (۵۱۸:۱) میں ہے: 'i.e., well of seven'. یعنی 'سات کا کنواں'۔

'سٹرونگ کی عبرانی بائبل ڈکشنری' (اندراج ۸۸۴، صفحہ ۱۸) میں وضاحت ہے:

(...) Beer Sheba, be-ayr' sheh-bah; from 875 and 7651 (in the sense of 7650); (...) be-ayr; from 874; a pit; espec. a well,

(...)۔ بیر شیبا، اندراج ۸۷۵ اور ۷۶۵۱ سے (اندارج ۷۶۵۰ کے مفہوم میں)، بیر (...)، اندراج ۸۷۴ سے: 'ایک گڑھا، بالخصوص ایک کنواں'۔

اندراج ۷۶۵۱، صفحہ ۱۱۲ میں وضاحت ہے:

(...) shib`ah shib-aw`; from 7650; a prim. cardinal number; seven ,(as the sacred *full* one); also (adv.) seven times; by impl. a week; seven-fold, seventh.

شبع، اندراج ۷۶۵۰ سے، ایک عدد، سات، سات مرتبہ بھی، اطلاقی طور پر ایک ہفتہ، سات گنا، ساتواں۔

۴۵۔ عہد کے معنی ہیں خداوند اور اسرائیلیوں کے درمیان معاہدہ ('اوکسفرڈ انگلش ریفرنس ڈکشنری'، صفحہ ۳۳۰)۔

۴۶۔ 'سٹرونگ کی عبرانی بائبل کی مختصر ڈکشنری' (اندراج ۸۷۵، صفحہ ۱۸) میں وضاحت ہے:

... be-ayr; from 874; a pit; espec. a well.

بیر اندراج ۸۷۴ سے، ایک گڑھا، بالخصوص ایک کنواں۔

اندراج ۸۷۴، صفحہ ۱۸ پر ہے:

... ba`ar, baw-ar; a prim. Root: to dig;

باَر، ایک بنیادی مادہ، کھودنا۔

اندراج ۷۶۵۰، صفحہ ۱۱۲ پر درج ہے:

... shaba shaw-bah; a prim. Root; to seven oneself, i.e. swear (as if by repeating a declaration seven times): * adjure, charge (by an oath, with an oath), take an oath.

سبع ایک بنیادی مادہ، اپنے آپ کو سات بار کرنا، یعنی قسم کھانا (سات مرتبہ ایک بیان کو دہرانا) قسم دلانا، قسم لینا۔

'دی انسائیکلوپیڈیا ببلیکا' (۵۱۸:۱) میں وضاحت ہے:

It is taken as meaning 'well of the oath'. One of the Simeonite towns in the southern territory of Judah (Josh. 19.2), on the border of the cultivated land: came to be regarded, for the greater part of history, as the remotest point of Canaan in that direction; whence the phrase 'from Dan to Beersheba'.

اس کے معنی لیے جاتے ہیں 'حلف کا کنواں'۔ یہ مزروعہ زمین کی سرحد پر یہودہ کے جنوبی خطے میں ایک شمعونی شہر ہے (یوشع ۲:۱۹)، جسے تاریخ کے زیادہ تر ادوار میں اُس سمت میں کنعان کا دور ترین سرا سمجھا جاتا تھا۔ اسی سے 'دان سے بیر سبع' کا محاورہ مشہور ہوا۔

اسی صفحے کے ذیلی حاشیہ اول میں یہی انسائیکلوپیڈیا مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

The Hebrew word 'to swear' means literally 'to come under the influence of seven things.

عبرانی زبان کے لفظ 'قسم کھانا' کے لغوی معنی ہیں: 'سات چیزوں کے اثر کے نیچے آنا'۔

'آر ایس وی کیتھولک ٹرانسلیشن'، کتاب پیدائش ۲۱:۳۱ و بعد، صفحہ ۱۶ میں درج ہے:

Therefore that place was called Beer-sheba; because there both of them swore an oath. So they made a covenant at Beer-sheba.

کیونکہ وہاں اُن دونوں نے ایک حلف اٹھایا تھا، اس لیے وہ جگہ بیر سبع کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس طرح انھوں نے بیر سبع کے مقام پر ایک معاہدہ کیا۔

47. Hastings *Dic. of the Bible, Revised Ed.*,1963, p.94.
48. J. Hastings, *A Dic. of the Bible*, 1:265.
49. John L. McKenzie, *Dic. of the Bible*, 1984, p.87.
50. See Hastings *Dic. of the Bible, (Revised)*, NY, p.375.
51. *Harper's Bible Dic.*,101.
52. F. F. Bruce, *Places Abrahom Knew* (London: Scripture Union, ECIVZNJ, 130 City Road, 1984), p.53, 55f.
53. J. Hastings, *A Dic. of the Bible*, 1:265.

۵۴۔ میکنزی کی لغت بائبل' (John L. McKenzie, *Dic. of the Bible*) صفحہ ۸۶ پر ہے:

The name is literally "well of seven".

لغوی طور پر اس نام کے معنی ہیں سات کا کنواں۔

'انٹر پریٹرز ڈکشنری آف دی بائبل'۱:۳۷۵ میں بیان ہے:

It is the "well of seven," (...); but in [Gen. 21] vs 31 it is apparently the "well of the oath."

یہ 'سات کا کنواں' ہے(...) لیکن [کتاب پیدائش باب ۲۱ کی] آیت ۳۱ میں یہ ظاہراً 'قسم کا کنواں' ہے۔

S.H. HORN 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' میں صفحہ ۱۳۱ پر رقمطراز ہیں:

Heb. Be'er Sheba', "well of seven", or "well of an oath".

عبرانی بیر سبع؛ 'سات کا کنواں' یا 'حلف کا کنواں'

۵۵ 'دی انٹر پریٹرز بائبل'۱:۶۳۹ میں درج ہے:

'Where he is' is an allusion to the site of the 'well' mentioned in vs. 19, a sacred spot among the Ishmaelites.

'جہاں وہ ہے' میں اس کنویں کے محلِ وقوع کی طرف اشارہ ہے، جس کا آیت ۱۹ میں ذکر ہے۔ اور جو نسلِ اسماعیل کے لیے ایک مقدس مقام ہے۔

اور ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ یہ وہ 'چاہِ زم زم' ہے جو نسلِ اسماعیلؑ کے نزدیک ایک مقدس مقام ہے۔

56. *Shorter Enc. of Islam*, (Karachi; South Asian Publishers, 1981), p. 508.
57. *A Lion Handbook: the World's Religions* (1984), pp. 319f.

۵۸ بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالٰی واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا، رقم ۳۱۱۳۔

۵۹ یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ (ہاجرہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب سن کر کس قدر مطمئن اور پرسکون ہے اور اس عظیم بزرگ پیغمبر کے اہلِ خاندان کے کس قدر شایانِ شان ہے یہ ردِ عمل!

۶۰ کتابِ مقدس، پیدائش ۲۶:۲۶-۳۳۔

ضمیمہ۲

'کتابِ تواریخ' کی استنادی حیثیت

(بحوالہ باب ششم)

'کتابِ تواریخ' اگرچہ آج بائبل کی مستند کتابوں میں شامل ہے، لیکن علما کے نزدیک اس کی استنادی حیثیت مضبوط نہیں، اس لیے اس کا ہیکل سلیمانی کے محل وقوع کو 'موریاہ' کا نام دینا کوئی وزن نہیں رکھتا۔ ڈبلیو۔ ایچ بینٹ (W. H. Bennett) 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' میں ان الفاظ میں اس امر کی تصدیق کرتے ہیں:

Chronicles (from its position in many manuscripts [MSS], etc., after Nehemiah) only obtained its place in the canon by an afterthought.[1]

کتاب تواریخ (اس حیثیت سے کہ متعدد مسودات وغیرہ کی رو سے یہ کتابِ نحمیاہ کے بعد کی کتاب ہے) صرف بعد کی سوچ بچار ہی کے ذریعے سے بائبل کی مستند کتاب کی حیثیت اختیار کر سکی ہے۔

اس کا بیان ہے کہ یہ کتاب مسیحیوں کی مستند کتابوں کی بعض فہرستوں میں شامل نہیں تھی۔ وہ لکھتا ہے:

The omission[2] of Chronicles from some Christian lists of canonical books is probably accidental.[3]

کتاب تواریخ کا مستند کتابوں کی بعض مسیحی فہرستوں سے حذف ہونا غالباً ایک اتفاق کی بات ہے۔

جہاں تک اس کی تاریخِ تدوین کا تعلق ہے، وہ کہتا ہے:

It is part of a larger work, Chronicles-Ezra-Nehemiah, composed in the Greek period between the death of Alexander (B.C. 323) and the revolt of

the Maccabees (B.C. 167). (...). Chronicles-Ezra-Nehemiah must be later than the times of Ezra and Nehemiah (458-432). In style and language the book belongs to the latest period of Biblical Hebrew. The descendants of Zerubbabel (I Chron. iii. 24) are given, in Masoretic text, to the sixth generation (about B.C. 350); in the LXX, Syriac, and Vulgate, to the eleventh generation after Zerubbabel (about B.C. 200) [which shows that it was written or added after BC 200]. The list of high priests in Neh. xii. 10, 11, extends to Jeddua (c.330). These lists might, indeed, have been made up to date after the book was completed; but other considerations point conclusively to the Greek period; e.g., in Ezra vi. 22, Darius is called "the king of Assyria." On the other hand, the use of the book in the Ecclesiasticus (Sirach) referred to above, the absence of any trace of the Maccabean struggle, and the use of the LXX, Chronicles by Eupolemus (c. B.C. 150; see Swete, l.c. p. 24), point to a date not later than B.C. 200. Hence Chronicles is usually assigned to the period B.C. 300-250.[4]

یہ ایک بڑی کتاب 'تواریخ-عذرا-نحمیاہ' کا ایک حصہ ہے۔ جو سکندر اعظم کی وفات (۳۲۳ ق م) اور مکابیوں کی بغاوت (۱۶۷ ق م) کے درمیان یونانی دور میں مدوّن ہوئی۔ (...)۔ [کتاب] 'تواریخ-عذرا-نحمیاہ' یقیناً عذرا اور نحمیاہ (۴۵۸-۴۳۲ ق م) سے بعد کے زمانے میں لکھی گئی ہوگی۔ اسلوب اور زبان کے اعتبار سے یہ کتاب بائبل کی عبرانی زبان کے سب سے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے۔ مسوراتی متن میں زروبابل کی بعد کی نسلیں (تواریخ ۳:۲۴) چھٹی نسل (تقریباً ۳۵۰ ق م) تک دی گئی ہیں۔ ہفتادی ترجمے، سُریانی ترجمے اور ولگیٹ میں زروبابل کے بعد گیارھویں نسل (تقریباً ۲۰۰ ق م) تک کی نسلیں دی گئی ہیں [اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تحریر یا اس میں اضافہ ۲۰۰ ق م کے بعد کیا گیا تھا]۔ نحمیاہ ۱۲: ۱۰-۱۱ میں سردار کاہنوں کی فہرست جدّوعہ (قریباً ۳۳۰) تک چلتی ہے۔ یہ فہرستیں حقیقت میں کتاب کے مکمل ہو جانے کے بعد اپ ٹو ڈیٹ کی گئی ہوں گی، لیکن کچھ اور لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ واضح طور پر یونانی دور کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً عذرا (۶:۲۲) میں داریوس [دارا] کو 'شاہِ اشور' قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف [الف] اس کتاب کا محولہ بالا اَکلیسیاسٹکس [Ecclesiasticus] (یشوع بن سیراخ) میں استعمال [ب] اس میں مکابیوں کی جدوجہد کے کسی نشان کی غیر موجودگی اور [ج] اس میں ہفتادی ترجمے اور کتاب تواریخ از یوپلیمس (Eupolemus)، (تقریباً ۱۵۰ ق م، ملاحظہ کیجیے سویٹے، صفحہ ۲۴) کا استعمال ایک ایسی تاریخ

کی نشان دہی کرتے ہیں جو ۲۰۰ ق م سے بعد کی نہیں۔ اس طرح کتاب تواریخ عام طور پر ۳۰۰ سے ۲۵۰ ق م تک کے زمانے سے متعلق قرار دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ایمل جی ہراخ، پروفیسر، ربانیکل لٹریچر و فلسفہ، شکاگو یونیورسٹی 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' میں بیان کرتے ہیں کہ تالمود کے علما اس کتاب کی تاریخی صحت پر شک کا اظہار کرتے تھے۔ اور یہ کہ کتاب تواریخ کے مؤلف نے (اشخاص و اماکن کے) نام بیان کرنے میں 'بڑی آزادی' سے کام لیا ہے:

On the whole, Chronicles was regarded with suspicion; its historical accuracy was doubted by the Talmudic authorities, (…). The names were treated with great freedom;[5]

مجموعی طور پر کتاب تواریخ شک کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ تالمود کے علما اس کی تاریخی صحت پر شک وشبہ کا اظہار کرتے تھے۔ (…)۔ ناموں کو بڑی آزادی سے برتا گیا تھا۔

'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ تفسیر بائبل' کا خیال ہے کہ ہیکل کی تعمیر کا حال بیان کرتے وقت کتاب تواریخ کے مؤلف نے اپنی خواہش اور ڈیزائن کی مناسبت سے تفاصیل کو حذف کرنے یا ان میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں پوری آزادی سے کام لیا ہے:

Certain items concerning the building of the Temple have been omitted, others are presented more briefly, others are given in the same wording as Kings, while others are entirely new.[6]

ہیکل کی تعمیر کے سلسلے میں بعض امور حذف کر دیے گئے ہیں۔ کچھ دوسرے امور کو زیادہ مختصر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ کچھ مزید دوسری باتیں بعینہٖ کتاب ملوک کے الفاظ میں درج کی گئی ہیں، جبکہ کچھ اور باتیں ایسی بھی ہیں جو بالکل نئی ہیں۔

نورفوک انگلینڈ میں عبرانی کے پروفیسر ایچ ہینٹ 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' میں رقم طراز ہیں کہ اس میں مختلف قسم کی تحریفیں آزادی سے کی گئی تھیں۔ مصنف نے اس کی تدوین کے دوران میں جس طرح کی آزادیاں کھلے دل سے استعمال کی ہیں، ان کے علاوہ بعض بعد کے 'علما' نے اس کی تکمیل کے بعد بھی تحریف اور اضافے سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

(…) and perhaps additions were made to the book after it was

substantially complete. In dealing with matter not found in other books it is difficult to distinguish between matter which the chronicler found in his source, matter which he added himself, and later additions, as all the authors concerned wrote in the same spirit and style; (...). Where Chronicles contradicts Samuel-Kings preference must be given to the older work, except where the text of the latter is clearly corrupt. With the same exception, it may be assumed that sections of the primitive "Chronicles" [some older book on the annals of history of the concerned period other than the book of Chronicles of the Bible, which the Chronicler used as a source] are much more accurately preserved in Samuel-Kings than in Chronicles. (...) The consistent exaggeration of numbers on the part of the chronicler shows us that from a historical point of view his unsupported statements must be received with caution. (...). What they prove is that he did not possess that sense of historical exactitude which we now demand from the historian.[7]

(...)۔اس کتاب کے معقول حد تک مکمل ہو جانے کے بعد بھی شاید اس میں اضافے کیے جاتے رہے ہیں۔ اس مواد کے متعلق جو دوسری کتابوں میں دستیاب نہیں، کسی نتیجے تک پہنچنے کے سلسلے میں ایسے مواد کے درمیان امتیاز کرنا بہت مشکل ہے جو کتاب تواریخ کے مؤلف نے اپنے ماخذ سے نقل کیا یا جس کا اس نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے یا جو کچھ اس کے بعد میں اضافہ کیا گیا، کیونکہ تمام متعلقہ مصنفین نے اسے ایک ہی جذبے کے تحت اور ایک ہی اسلوب میں لکھا ہے۔(...)۔ جہاں کتاب تواریخ کا مصنف 'سموئیل۔ملوک' سے اختلاف کرتا ہے، وہاں پرانی کتاب (سموئیل وملوک) کو ترجیح دی جانی چاہیے، سوائے ایسی حالت کے کہ جہاں موخر الذکر کتاب کا متن واضح طور پر تحریف شدہ ہو۔[8] ایسے ہی استثنا کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا جانا چاہیے کہ قدیمی 'کتاب تواریخ' [یہ ایک قدیمی کتاب تواریخ ہے جس میں متعلقہ عہد کے تاریخی واقعات درج ہیں اور یہ بائبل کی کتاب تواریخ سے ایک مختلف کتاب ہے اور اسے بائبل کی کتاب تواریخ کے مصنف نے اپنے ماخذ کے طور پر استعمال کیا تھا] کے اجزا بائبل کی کتاب تواریخ کی نسبت بائبل کی کتب سموئیل وملوک میں کہیں زیادہ صحت و درستی کے ساتھ ضبط تحریر میں لائے گئے۔(...)۔ کتاب تواریخ کے مصنف کی اعداد کے سلسلے میں مسلسل مبالغہ آرائی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی نقطۂ نظر سے اس کے ایسے بیانات کو قبول کرنے میں احتیاط برتی جانی چاہیے، جن کی تائید میں کوئی دوسرا مواد موجود نہیں۔(...)۔ ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج ہم ایک

مؤرخ سے جس طرح کے واقعات کے ٹھیک ٹھیک بیان کی توقع رکھتے ہیں، وہ (کتاب تواریخ کا مؤلف) اس طرح کے مؤرخانہ شعور سے عاری تھا۔

جے ای گول ڈنگے، رجسٹرار شعبۂ عہد نامہ قدیم، سینٹ جان کالج، نوٹنگھم نے بھی 'نیو بائبل ڈکشنری' کے مقالے 'کتاب تواریخ' میں اسی طرح کے ملاحظات نقل کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

Like most OT books, however, Chronicle is of anonymous authorship, and no conclusions are possible as to who wrote it. (...), he did wish to bring a specific message from God applied to the people of his own day, and it is this that leads him to his extensive working of his text, omitting what was now irrelevant, adding material that was now newly relevant, changing what was now misleading, and so on. Chronicles has been regarded as poorer history than Samuel-Kings, (...). Some of its alterations to Samuel-Kings raise historical problems: (...) textual corruption or misunderstanding has often been suspected. (...) - here the author perhaps resembles an artist painting the figures of the past in the dress of his own age. Such characteristics have led to the questioning of the extra material Chronicles includes which does not appear in Samuel-Kings. (...), and the main narratives, as we have noted, are substantially derived from Samuel-Kings.[9]

تاہم عہد نامہ قدیم کی اکثر کتابوں کی طرح کتاب تواریخ کے مصنف کا نام بھی معلوم نہیں۔ اور یہ بات کسی طرح اخذ نہیں کی جا سکتی کہ یہ کس نے لکھی ہے۔ (...)، اُس کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے دور کے لوگوں پر لاگو کرنے کے لیے خداوند کی طرف سے خصوصی پیغام لائے۔ اور یہی وجہ ہے جس کے تحت اُس نے اپنے متن پر اس طرح کی شدید مشقت کی ہے کہ جو بات اسے موجودہ حالات میں غیر متعلق نظر آئی، وہ اس نے حذف کر دی، اور جو مواد آج کے حالات سے مطابقت رکھتا تھا، اس کا اُس نے اضافہ کیا، جو چیز موجودہ ماحول میں گمراہ کن دکھائی دی، وہ اُس نے تبدیل کر دی، علیٰ ہٰذا القیاس۔ کتاب تواریخ کو کتاب سموئیل وملوک کی نسبت گھٹیا درجے کی تاریخ قرار دیا گیا ہے۔ (...)۔ اس نے سموئیل وملوک میں جو تبدیلیاں کی ہیں، اُن سے بعض اوقات تاریخی نوعیت کے مسئلے پیدا ہوئے ہیں۔ (...)۔ اُس پر متنی تحریف یا غلط فہمی کا اکثر شک کیا گیا ہے۔ (...)۔ یہاں مؤلف غالباً ایک ایسے آرٹسٹ سے مشابہ نظر آتا ہے جو ماضی کے اشخاص کی تصویر کشی اپنے دور کے لباس میں کرتا ہے۔

اس طرح کی خصوصیات نے اُس زائد مواد کے متعلق سوالات کھڑے کر دیے ہیں جو کتاب تواریخ میں شامل ہیں، مگر سموئیل وملوک میں موجود نہیں ۔(...)،اور اہم بیانات، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، زیادہ تر سموئیل وملوک ہی سے ماخوذ ہیں۔

میکنزی نے بھی اپنی ڈکشنری آف بائبل میں لکھا ہے کہ کتابِ ملوک کا مؤلف تاریخ کے بجائے اپنے خودساختہ تین مقاصد میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ ہیکل اور طریقِ عبادت کو فوقیت دی جائے:

It may be summed up by saying that the Chronicler intended to write not what happened, but what ought to have happened; (...). This ideal is specified by three theological principles which he represents as governing events: (...), and the primacy of the temple and the cult. (...). The third principle appears in the space and importance which the Chronicler gives to the temple and its cult and personnel. (...). It is necessary to see the Chronicler's purpose.[10]

اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ کتابِ تواریخ کا مصنف یہ نہیں لکھنا چاہتا تھا کہ حقیقت میں کیا رونما ہوا ہے، بلکہ وہ یہ لکھنا چاہتا تھا کہ کیا رونما ہونا چاہیے تھا۔(...)۔اس نصب العین کی تین دینیاتی اصولوں کے ذریعے سے نشان دہی کی گئی ہے جن کو وہ مرکزی اور بنیادی واقعات کے طور پر پیش کرتا ہے: (...)۔ اور ہیکل اور طریق عبادت کی فوقیت (...)۔ تیسرا اصول اس مقام اور اُس اہمیت سے ظاہر ہوتا ہے جو کتابِ ملوک کا مؤلف ہیکل کو اس میں طریق عبادت اور اس کے افراد کو دیتا ہے، (...)۔ یہ ضروری ہے کہ کتابِ ملوک کے مؤلف کا مقصد پیشِ نظر رہے۔

ریورنڈ جے ملکاہی، پروفیسر صحفِ مقدسہ، روح القدس کالج، کنیج، ڈبلن نے بڑی دلچسپی کے ساتھ کتابِ ملوک کے مؤلف کے مضامین ومقاصد کا 'اے نیو کیتھولک کمنٹری' میں تجزیہ کیا ہے، اور اُس کی 'استنادی حیثیت' کا پول مندرجہ ذیل الفاظ میں کھولا ہے:

The claim of Jerusalem to be the only place where legitimate worship of Yahweh is possible is the second principal element in the Chronicler's theme. (...). In the neutral passages (...) there seems to be no reason to doubt the strictly historical character of the narrative. In the other passages, however, we should be doing an injustice to him, were we to judge him

merely as an historian. Since, for him, history is a handmaid of theology, it is the theological understanding that is important for him, not the naked historical fact. If he clothes this naked fact with somewhat imaginary adornments, we must accept this as his method of teaching theology and not reproach him for the lack of an historical exactness which a comparison between his text and that of Sm-Kgs shows that he never intended. On other matters, which were not affected by the Chronicler's special point of view and purposes, historical value is recognized in his traditions.[11]

یروشلم کا یہ دعویٰ کہ یہی وہ واحد جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی جائز عبادت کی جاسکتی ہے، کتابِ ملوک کے مصنف کے مضامین کا دوسرا بڑا عنصر ہے۔(...)۔غیر جانبدار عبارات میں (...)، اس بیان کے یقینی تاریخی کردار پر شک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، تاہم دوسری عبارتوں میں اگر ہم اسے محض ایک مؤرخ کی حیثیت سے پرکھیں تو ہم اُس کے ساتھ بے انصافی کریں گے، کیونکہ اُس کے خیال میں تاریخ تو شریعت کی ایک دست بستہ کنیز ہے۔ اس کے نزدیک تو اہمیت صرف الٰہیاتی فہم کو حاصل ہے، نہ کہ عریاں تاریخی حقائق کو۔ اگر وہ ان برہنہ حقائق کو کسی قدر تخیلاتی آرائشوں میں ملبوس کرتا ہے تو ہمیں اس بات کو اُس کے الٰہیات کی تعلیم کے طریقے کے طور پر قبول کرلینا چاہیے، اور اُسے اس بات پر ملامت نہیں کرنی چاہیے کہ اس میں تاریخی قطعیت کا فقدان ہے۔ اُس کے متن کا 'سموئیل۔ملوک' کے متن کے ساتھ موازنہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخی قطعیت کبھی اس کے پیشِ نظر تھی ہی نہیں۔ دوسرے معاملات میں، جو کتابِ ملوک کے مؤلف کے خصوصی نقطۂ نظر اور مقاصد سے متاثر نہیں ہوتے تھے، اس کی روایات کی تاریخی قدر و قیمت تسلیم کی جاتی ہے۔

ایچ فائفر نے 'انٹرپریٹرز بائبل ڈکشنری' میں کتابِ ملوک پر اپنے مقالے میں اس کا قدرے تفصیلی تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس کے مضمون سے چند اقتباسات دیکھ کر قاری کو ایک صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی:

The Chronicler not only teaches the proper faith in God, after the manner of the Priestly Code, by such graphic fictitious stories, (...). To raise the low morale at such times, the Chronicler exaggerated the splendor of the Jewish kingdom in the past, (...). In glorifying Judaism and the Jews through the centuries beyond all possibilities, the Chronicler necessarily rewrote the history from David to Cyrus; he freely omitted from his sources, added to them, modified them, being blissfully unaware of

anachronisms [12] and impossibilities. (...). In general the Chronicler modified our canonical sources with complete freedom to suit his ideas. (...), and modified what did not agree with his religious views or his notions of the facts of history. (...). Elsewhere the Chronicler rewrote the narration of Samuel and Kings in order to express his own views, which often differed from those of his sources; (...). These examples suffice to illustrate the various methods by which the Chronicler rewrote, edited, shortened, expanded, and arbitrarily changed the passages in Samuel and Kings which suited his purposes, omitting the rest, (...); in the other half the Chronicler, unless he had access to other sources unknown to us was able to display his vivid imagination by composing freely, without any guidance. (...). A date ca 250 B.C. or a little earlier is far more probable than 400-350 B.C. [13]

کتابِ تواریخ کا مؤلف پریسٹلی کوڈ کے انداز میں اس طرح کی خوبصورت جعلی کہانیوں کے ذریعے سے خداوند پر صحیح ایمان کی تعلیم دیتا ہے۔(...)۔ ایسے مواقع پر پست حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے کتابِ ملوک کا مؤلف ماضی کی یہودی سلطنت کی عظمت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ (...)۔ پچھلی تمام صدیوں میں یہودیت اور یہودیوں کی تمام امکانات سے ماورا عظمت بیان کرنے کے لیے کتابِ ملوک کے مؤلف نے داؤد سے سائرس تک کی تاریخ کو ضرورتاً نئے سرے سے رقم کیا ہے۔ اس نے پوری آزادی سے اپنے مآخذ میں سے [جو چاہا] حذف کر دیا، [جس چیز کا چاہا] ان میں اضافہ کر دیا، انھیں [اپنی مرضی کے مطابق] جس رنگ میں چاہا، ڈھال دیا۔ اس کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اسے یہ تک خبر نہیں کہ یہ باتیں غیر ممکن الوقوع ہیں یا تاریخی نظامِ اوقات کے خلاف ہیں۔(...)۔ عمومی طور پر کتابِ ملوک کے مؤلف نے ہمارے مستند مآخذ کو اپنے نظریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے انھیں نئے رنگ میں ڈھالنے کے سلسلے میں مکمل آزادی سے کام لیا۔(...)، اور جو چیزیں اس کے مذہبی نظریات یا تاریخی حقائق کے متعلق اس کے خیالات سے موافقت نہیں رکھتی تھیں، انھیں اس نے اپنی ضرورت کے مطابق تبدیل کر لیا۔(...)۔ بعض دوسرے مقامات پر 'کتابِ تواریخ' کے مؤلف نے کتابِ سموئیل اور کتابِ ملوک کے بیانات کو نئے سرے سے لکھا ہے تاکہ وہ اپنے ان ذاتی نظریات کو نمایاں کر سکے جو اکثر اس کے مآخذ کے نظریات سے مختلف ہوتے تھے۔(...)۔ وہ مختلف طریقے جن کے ذریعے سے کتابِ تواریخ کے مؤلف نے کتابِ سموئیل اور کتابِ ملوک کی عبارتیں دوبارہ لکھیں، یا انھیں ایڈٹ کیا، یا ان میں اختصار کیا، یا انھیں پھیلایا، یا ان کو

من مانے انداز میں اپنے مقاصد کے مطابق تبدیل کر کے بقایا کو حذف کر دیا۔ ان سب کی وضاحت کے لیے اس طرح کی کافی مثالیں موجود ہیں، (...) ۔ [کتاب کے] دوسرے نصف حصے میں 'کتاب تواریخ' کا مؤلف بغیر کسی رہنمائی کے آزادانہ انداز میں عبارت آرائی کر کے اپنے واضح تخیلات کا مظاہرہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ہاں اگر اس کی رسائی کچھ ایسے دوسرے ماخذ تک تھی، جن کا ہمیں علم نہیں تو اور بات ہے۔ (...) ۔ [اس 'کتاب تاریخ' کی تالیف کی تاریخ کے سلسلے میں] بہ نسبت اس بات کے کہ یہ ۴۰۰ - ۳۵۰ ق م کے دوران میں لکھی گئی ہو، یہ امکان غالب ہے کہ یہ تقریباً ۲۵۰ ق م میں یا اس سے کچھ پہلے لکھی گئی ہو۔

تقریباً ہر اس عالم نے جس نے اس کتاب تواریخ کے متعلق کچھ لکھا ہے، اس کے متعلق اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں اِن کا ایک ملخص درج ہے:

۱۔ ابتدا میں 'کتاب تواریخ اس قابل نہ سمجھی گئی کہ اسے عہد نامہ قدیم کی مستند کتابوں کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ اسے بعد کے کسی دَور میں اس فہرست میں شامل کیا گیا۔

۲۔ اسے مستند کتابوں کی بعض مسیحی فہرستوں سے حذف بھی کر دیا گیا تھا۔

۳۔ عہد نامہ قدیم کی اکثر کتابوں کی طرح 'کتاب تواریخ' کے مصنف کا نام بھی معلوم نہیں۔ اور اس بات کا کوئی اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے کس نے لکھا تھا (نیو بائبل ڈکشنری)۔

۴۔ 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' کے مطابق 'کتاب تواریخ' کا عہدِ تصنیف عام طور پر ۳۰۰ ق م سے ۲۵۰ ق م تک قرار دیا جاتا ہے۔

۵۔ کیونکہ یہ واقعے کے رونما ہونے سے تقریباً سات سو سال بعد کسی نامعلوم مؤلف کی لکھی ہوئی ہے، اس لیے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مصنف واقعہ کا عینی شاہد نہ تھا۔

۶۔ جیسا کہ 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' میں درج ہے: 'مجموعی طور پر کتاب تواریخ کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تالمود کے مستند علما کے نزدیک اس کی تاریخی صحت مشکوک تھی۔'

۷۔ کتاب تواریخ کے مؤلف نے وہ 'تواریخ' دوبارہ بیان کی ہے جو اس سے پہلے کتاب سموئیل،

کتابِ ملوک وغیرہ میں لکھی ہوئی تھی، لیکن 'نیو بائبل ڈکشنری' کے مطابق یہ سموئیل اور ملوک سے گھٹیا درجے کی تاریخ ہے۔

۸۔ کتاب تواریخ کا مؤلف کچھ خود ساختہ مقاصد اور نظریات کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے، جیسا کہ 'انٹرپریٹرز ڈکشنری آف بائبل' میں بیان کیا گیا ہے، حضرت داؤدؑ سے سائرس تک کے دور کی تاریخ اپنی اس ضرورت کے تحت دوبارہ لکھی ہے۔ اُس نے اپنے ماخذ سے [جو باتیں اُسے ناپسند محسوس ہوئیں اُنھیں] پوری آزادی سے حذف کر دیا، اُن میں اضافہ کیا اور انھیں نئے رنگ میں ڈھالا۔ اُس کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ ان ناممکن الوقوع چیزوں اور سنین واوقات میں اس بے ربطی کے بارے میں بالکل بے خبر ہے۔(...)۔ عمومی طور پر 'کتاب تواریخ' کے مصنف نے ہمارے مستند ماٰخذ کو اپنے نظریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مکمل آزادی کے ساتھ اُن میں تبدیلیاں کی ہیں۔(...)۔ اُس کے مذہبی نظریات یا تاریخی حقائق سے متعلق جو بات اُس کے نظریات سے مطابقت نہ رکھتی تھی، اُسے اُس نے اپنی مرضی کا رنگ دے دیا۔ اُس نے یہودیت اور یہودیوں کو اتنا عظیم الشان بنا کر پیش کیا جو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔(...)۔ کسی دوسری جگہ کتاب تواریخ کے مؤلف نے کتاب سموئیل اور کتاب ملوک کے بیانات کو اپنے ذاتی خیالات کے رنگ میں ڈھالنے کے لیے انھیں نئے سرے سے تحریر کیا، جو اکثر اصل ماٰخذ سے مختلف تھے۔(...)۔ یہ مثالیں ان مختلف طریقوں کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں جن کے مطابق کتاب تواریخ کے مؤلف نے کتاب سموئیل اور کتاب ملوک کی عبارتوں کو دوبارہ لکھا، مدون کیا، مختصر کیا، پھیلایا اور من مانے طریقے سے اُس میں تبدیلیاں کیں اور جو کچھ باقی بچا، اُسے حذف کر دیا۔ یہ سب کچھ اُس نے اس طرح کیا کہ اُس کے مقاصد پورے ہو سکیں۔

۹۔ میکنزی کے الفاظ میں 'ہیکل کی فوقیت' اُس کے خود ساختہ مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا اور یہ بات نہایت ضروری ہے کہ کتاب ملوک کے مؤلف کے مقاصد کو ملحوظ رکھا جائے۔

۱۰۔ اپنے اس خود ساختہ نصب العین کے پیش نظر اُس نے ہیکل سلیمانی کو تقدس اور عظمت دینے کی کوشش کی۔ اور واقعات کو ایسا رنگ دیا کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کرنے کے محل وقوع کو موریاہ سے منسلک کر سکے۔

حواشی ضمیمہ ۲ 'کتاب تواریخ' کی استنادی حیثیت

1.*The Jewish Enc.*, 4:60.

2.*The Jewish Enc.*, 4:60.

۳۔ اگر یہ 'حذف' صرف ایک فہرست سے ہوتا تو پھر بھی اسے بہ یک جنبشِ قلم، بغیر کسی وجہ جواز کے، 'اتفاقی' قرار نہیں دیا جاسکتا تھا، لیکن یہاں یہ حذف 'مستند کتابوں کی بعض مسیحی فہرستوں' سے ہوا ہے (فہرستوں کا صیغۂ جمع میں ہونا قابلِ توجہ ہے)، اور اس کا مستند کتابوں کی بعض فہرستوں جیسی اہم دستاویزات سے یوں حذف ہونا اس فیاضی اور بے نیازی سے 'حادثاتی یا اتفاقی' قرار نہیں دیا جاسکتا۔

4.*The Jewish Enc.*, 4:60.

5.*The Jewish Enc.*, 4:60.

6.*The 7th-Day Adventist Bible Com.*, 3:118.

7.*The Jewish Enc.*, 4:62-63.

۸۔ یہاں لفظ 'مؤخر الذکر' (latter) صریحاً 'سموئیل۔ملوک' کا حوالہ دے رہا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' کے اس آرٹیکل کے مصنف کے مطابق 'سموئیل۔ملوک' بھی 'تحریف' سے محفوظ نہیں۔

9. *New Bible Dic., 2nd Ed.*, 187-88.

10. *J. L. McKenzie's Dic. of the Bible*, 131-32.

11. *A New Catholic Commentary on Holy Scripture, revised and updated* 1975, Ed. Rev. Reginald C. Fuller, (Hong Kong: Thomas Nelson Ltd., 1981), pp. 353, 55f.

۱۲۔ 'anachronisms' کا مطلب ہے: 'وقت کی غلطی، جس کی وجہ سے کوئی چیز غلط وقت سے منسوب کردی جاتی ہے، کوئی بے وقت چیز یا بعد از وقت چیز۔'

13. *The Interpreter's Dic. of the Bible*, 1:574-80.

ضمیمہ ۳

’ہیکلِ سلیمانی‘ کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ

(بحوالہ باب دہم)

حضرت سلیمان علیہ السلام سے پہلے اسرائیلیوں کے ہاں ہیکل کی کسی عمارت کا وجود نہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس قوم کی بدویانہ زندگی میں کسی ہیکل کی ایک متعین عمارت کے لیے کوئی جگہ ممکن ہی نہ تھی۔ ’خیمۂ اجتماع‘، جو متعین لمبائی، چوڑائی اور اونچائی وغیرہ کا ایک خیمہ ہوتا تھا، ہیکل کا کام دیتا تھا اور عہد کا تابوت (تابوتِ سکینہ) اس میں رکھا ہوتا تھا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام (قریباً ۱۰۱۰-۹۷۰ ق م) نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اپنے لیے ایک مستقل محل تعمیر کر لیا تو اللہ تعالیٰ کے معبد کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ بادشاہ نے کہا: ’میں تو دیودار کی شان دار لکڑی سے بنے ہوئے ایک محل میں رہتا ہوں، مگر خداوند کا تابوت ایک خیمے میں پڑا ہوا ہے (۲۔ سموئیل ۷:۲)۔ اُس نے تعمیراتی میٹیریل بہم پہنچایا، خزانہ اکٹھا کیا اور معبد کی عمارت کے لیے ارونا یبوسی سے اس کا کھلیان خریدا (۱۔ تواریخ ۲۲:۸؛ ۲۔ سموئیل ۲۴:۱۸-۲۵)۔ اُس کے بیٹے سلیمان (جو اسرائیل کی متحدہ بادشاہت پر قریباً ۹۷۰-۹۳۰ ق م حکمران رہا) نے اپنی حکومت کے چوتھے سال میں ہیکل کی باقاعدہ تعمیر شروع کی اور سات سال بعد ہیکل مکمل ہو گیا (قریباً ۹۶۰ ق م میں؛ لیکن سمتھ کی لغت، صفحہ ۹۷۶ کے مطابق قریباً ۱۰۰۵ ق م میں، جو قطعی ناممکن ہے)۔ یہودیہ کے بادشاہوں نے مختلف حکومتوں سے تعلقات استوار کرنے کی غرض سے خراج ادا کرنے کے لیے اس ہیکل کے خزانے متعدد مرتبہ لوٹے (۲۔ سلاطین ۱۲:۱۸؛ ۱۶:۸؛ ۱۸:۱۵)۔ یوسیاہ نے (جس نے قریباً ۶۴۰-۶۰۹ ق م یہودیہ پر

حکومت کی) ہیکل کی تعمیر و مرمت کا حکم صادر کیا۔ یوسیاہ کے فرمان کے تحت کی جانے والی مرمت (قریباً ۶۲۲ ق م) کے دوران میں سردار کاہن حلقیاہ نے شریعت کی کتاب دریافت کی۔ اس بات پر عمومی اتفاق ہے کہ یہ اَسفارِ خمسہ (تورات) کی کتاب استثنا کی اصلی حالت تھی۔ یوسیاہ نے دینی اصلاحات کے نفاذ کا عمل شروع کیا' جو اُس تورات کی تعلیمات پر مبنی تھا جو حلقیاہ نے ہیکل میں دریافت کی تھی (۲۔ سلاطین ۲۲: ۸ و بعد)۔ بابل کے حکمران نبوکدنضر نے ۵۸۶-۵۸۷ ق م میں اپنی یروشلم کی فتح کے موقع پر ہیکلِ سلیمانی کو تباہ و برباد کر دیا اور یروشلم کے اسرائیلیوں کو اسیر بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اگلے قریباً ۷۰ سال تک ہیکلِ سلیمانی کا صفحۂ ہستی پر کوئی وجود نہ تھا۔ فارس کے شاہ سائرس نے بابل کے ولی عہد بل شعصر کو ۵۳۹ ق م میں شکست دی اور بابلی سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ سائرس ایک منصف مزاج اور رحم دل حکمران تھا۔ اُس نے اسرائیلیوں کو آزاد کر دیا اور انھیں اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ وہ یروشلم میں واپس جا کر آباد ہو جائیں۔ اُس نے انھیں اپنا ہیکل دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی اور اس غرض کے لیے انھیں مناسب مدد فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ ہیکل کی (دوسری) تعمیر ۵۳۷ ق م میں شروع ہوئی۔ 'سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ بائبل ڈکشنری' میں وضاحت کی گئی ہے:

But the builders encountered so much opposition from enemies in their homeland that the work soon came to a virtual stop and remained interrupted until the reign of Darius 1. In the 2nd year of his reign the prophets Haggai and Zechariah encouraged Zerubbabel, the governor, and Joshua, the high priest, to make another effort to rebuild the Temple. They responded, and with the enthusiastic support of the whole nation and the good will of the Persian officials and of the king himself, the new Temple, usually referred to as the Second Temple [or the Temple of Zerubbabel], was completed, along with its auxiliary structures, in the period of 4½ years, from 520 to 515 B.C. (Ezr. 3:8 to 4:5; 4:24 to 6:15). (…). Antiochus IV Epiphanes desecrated the Temple in 168 B.C. by erecting an altar dedicated to Jupiter Olympius in the Temple court and sacrificing swine on it. He stole the sacred furniture from the holy place and removed all Temple treasures (Jos. Ant. xii 5, 4; 1 Macc 1:21-23). However, the Temple was repaired, refurnished, and rededicated in 165 B.C., after the Maccabean forces took Jerusalem (1 Mac 4:43-59) (…). When Pompey conquered

Jerusalem in 63 B.C. the Temple was spared any damage, but it was later pillaged by Crassus [in 54 BC]. It may have suffered some further damage in the conquest of Jerusalem by Herod in 37 B.C. (...). When Herod announced his intention of rebuilding a new Temple [commonly called 'Temple of Herod'], the Jews feared he would tear down the old one and then fail to rebuild it. Consequently, Herod devised a method of reconstruction by which the old was demolished only as the new construction progressed; it appeared at the different stages as if he were doing nothing but repairing the older structures, while in reality a completely new complex of buildings was erected without interrupting the services. He first rebuilt the Temple proper. This work was begun in 20/19 B.C. and lasted 18 months. He had all building material finished to size before it was brought to the Temple area, and employed only priests to work on the inner Temple structure. After that was finished, most of the outer buildings, including the cloisters, were completed during the next 8 years, but the work of decoration and embellishment went on until the procuratorship of Albinus (A.D. 62-64), immediately before the outbreak of the Jewish war. Since building activities were still going on during Christ's ministry, it is understandable that the Jews said the Temple had been in building for 46 years (Jn. 2:20). (...). The whole Temple with all its buildings was destroyed by fire during the capture of Jerusalem by the forces of Titus in A.D. 70. (...). Although the Temple built by Herod the Great was actually a new structure, the Jews always referred to it as still the Second Temple, considering his work no more than a repair and remodeling. Because of the Jews' hatred for him, the orthodox Jewish writings, like the Mishnah, which gives detailed descriptions of this Temple, never mention the name of its builder. (...). The old Temple area was enlarged to twice its former size, including also the palace grounds of Solomon's time. Archeological investigations show that the present Moslem enclosure, the Haram esh-Sherif, almost exactly covers Herod's Temple area, and large parts of the present walls rest on foundations or wall stumps of Herod's time.[3]

لیکن تعمیر کا کام سرانجام دینے والوں کو اپنے ہم وطن دشمنوں کی اتنی زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کہ تعمیراتی کام جلد ہی عملی طور پر بند ہو گیا اور دارا (Darius) اوّل کے دورِ حکومت تک مداخلت ہی کا شکار رہا۔ اُس کی حکمرانی کے دوسرے سال میں حجی اور زکریاہ نبیوں نے وہاں کے گورنر زروبابل اور سردار کاہن یوشواہ (یوشع) کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ ہیکل کی تعمیر ثانی کی دوبارہ کوشش کریں۔ انھوں نے مثبت ردِ عمل کا اظہار کیا اور پوری قوم کی پر جوش تائید اور ایرانی حکام اور بذاتِ خود بادشاہ کی

اشیرباد سے ہیکلِ ثانی [یا ہیکلِ زروبابل] اپنی اضافی تعمیرات سمیت ساڑھے چار سال کے عرصے میں ۵۲۰-۵۱۵ ق م (عزرہ ۳:۸-۴:۵؛ ۶:۱۴-۱۵) پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ (...)۔ انطیوکس چہارم اپی فینز نے ۱۶۸ ق م میں ہیکل کے صحن میں جیوپیٹر اولمپیس کے نام سے منسوب چبوترہ تعمیر کر کے اور اس پر خنزیروں کی قربانیاں پیش کر کے ہیکل کے تقدس کو پامال کیا۔ اُس نے اس مقدس مقام سے متبرک فرنیچر چرا لیا اور ہیکل کے تمام خزانے وہاں سے ہٹا دیے (جوزیفس، انٹی کوئٹیز دوازدہم ۵، ۴: ۱-مکابیون ۱: ۲۱-۲۳)، تاہم ۱۶۵ ق م میں مکابی فوجوں کے یروشلم پر قبضے کے بعد (۱-مکابیون ۴: ۴۳-۵۹) ہیکل کی مرمت کرا دی گئی، اس میں نئے سرے سے فرنیچر فراہم کیا گیا اور اسے دوبارہ مراسمِ قربانی و عبادت کے لیے وقف کر دیا گیا۔ (...)۔ جب پومپی نے ۶۳ ق م میں یروشلم پر قبضہ کیا تو ہیکل کو کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا، لیکن بعد میں [۵۴ ق م میں] کریسس نے اسے تاراحت و تاراج کیا۔ عین ممکن ہے کہ ہیرود کی ۳۷ ق م میں فتح یروشلم کے موقع پر بھی اسے مزید نقصان پہنچایا گیا ہو۔ (...)۔ جب ہیرودِ اعظم نے ایک نئے ہیکل [جسے عام طور پر 'ہیرود کا ہیکل' کہا جاتا ہے] کی تعمیر نو کے ارادے کا اظہار کیا تو یہودیوں کو اس بات کا خوف محسوس ہوا کہ وہ پرانا ہیکل توڑ پھوڑ ڈالے گا اور پھر اس کی تعمیر نو نہیں کرا سکے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہیرود نے تعمیر نو کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس کے ذریعے سے پرانے ہیکل [کے صرف وہی حصے] گرائے جاتے تھے جس کی تعمیر پر عمل درآمد شروع ہو جاتا تھا۔ تعمیر کے مختلف مراحل کے دوران میں یوں لگتا تھا کہ وہ پرانی تعمیرات کی مرمت کے علاوہ کچھ نہیں کر رہا، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ مراسمِ قربانی و عبادت میں کسی طرح کا خلل واقع ہوئے بغیر عمارات کا مکمل طور پر ایک نیا ڈھانچا تعمیر ہو رہا تھا۔ ابتدائی مرحلے میں اُس نے اصل ہیکل کو دوبارہ تعمیر کیا۔ یہ کام ۱۹ یا ۲۰ ق م میں شروع ہوا اور ۱۸ ماہ تک جاری رہا۔ اُس نے تمام تعمیراتی سامان کو ہیکل کے علاقے میں لائے جانے سے پہلے ہی بالکل سائز کے مطابق تیار کروایا اور ہیکل کے اندرونی ڈھانچے پر کام کے لیے صرف کاہنوں ہی کو مقرر کیا۔ جب یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا تو اگلے آٹھ سالوں کے درمیان میں اکثر بیرونی عمارتیں بشمول خانقاہ کے حجرات مکمل کیے گئے، لیکن تزئین و آرائش کا کام، یہودی جنگوں کے پھوٹ پڑنے سے فوراً پہلے، البانس

(۶۲ء-۶۴ء) کے دورِ انتداب تک جاری رہا۔ چونکہ حضرت مسیحؑ کے دورِ نبوت کے دوران تک تعمیراتی سرگرمیاں ابھی جاری تھیں تو یہ بات قابلِ فہم ہے کہ یہودیوں نے یہ (کیوں) کہا تھا کہ ہیکل میں تعمیراتی کام ۴۶ سال سے جاری ہے (یوحنا۲:۲۰)۔(...)۔سارے کا سارا ہیکل اپنی تمام تعمیرات سمیت ۷۰ء میں ٹائیٹس کی فوجوں کے ہاتھوں یروشلم کے قبضے کے دوران میں آگ کے ذریعے سے نیست و نابود کر دیا گیا۔(...) اگرچہ ہیرودِ اعظم کا تعمیر کردہ ہیکل عملی طور پر ایک نئی عمارت تھی، لیکن یہودی ہیرودِ اعظم کے کام کو مرمت اور تعمیرِ جدید سے زیادہ نہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ اس کا ہیکلِ ثانی کے طور ہی پر ذکر کرتے تھے۔ یہود کی ہیرودِ اعظم سے نفرت کی وجہ سے مِشنا کی طرز کی متعصب یہودی تحریریں، جو اس ہیکل کی مکمل تفصیل بتاتی ہیں، اس کے معمار کا نام کبھی نہیں لیتیں۔ (...) ہیکل کا پرانا رقبہ بڑھا کر پہلے سے دوگنے سائز کا کر دیا گیا اور اس میں عہدِ سلیمان کے محل کے میدان بھی شامل کر لیے گئے۔ آرکیالوجی کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمانوں والا حصہ یعنی حرم شریف ٹھیک ٹھیک ہیکلِ ہیرود کے رقبے پر مشتمل ہے اور موجودہ دیواروں کے زیادہ تر حصے ہیرود کے زمانے کی بنیادوں پر قائم ہیں۔[۲]

اس جگہ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جب مسجدِ عمر تعمیر ہوئی، اُس سے قریباً سات صدیاں پہلے تک ہیکل کی کوئی عمارت موجود نہ تھی۔ 'جیوئش انسائیکلوپیڈیا' کے مطابق:

The mosque was built over a rock the traditions of which were sacred, probably the site was the same as that of the Temple which Hadrian erected to Jupiter. This in turn was on the site of Herod's Temple.[۳]

مسجد ایک چٹان پر تعمیر کی گئی تھی، جس سے متعلق روایات یہ ہیں کہ وہ مقدس تھی۔ غالب امکان یہی ہے کہ اس کا محلِ وقوع وہی تھا جو اُس ہیکل کا تھا، جسے ہیڈرین نے جوپیٹر [کے مراسمِ قربانی و عبادت] کے لیے تعمیر کیا تھا۔ اور اسی طرح یہ بھی ہیرودِ اعظم کے ہیکل کے محلِ وقوع پر واقع تھا۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پچھلے قریباً دو ہزار سال سے اس مقام پر ہیکلِ سلیمانی کا کسی حالت میں بھی وجود نہیں رہا۔

حواشی ضمیمہ ۳ 'ہیکلِ سلیمانی' کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ

۱ مکینزی بحوالہ خروج ۲۵: ۱۰ او بعد (صفحہ ۵۴ پر) 'تابوت' کی حسب ذیل وضاحت کرتا ہے:

A small portable box or chest: 3¾ X 2¼ X 2¼ ft, made of acacia wood, overlaid with gold inside and out. On its top were two cherubim facing each other. This is the place where Yahweh meets Israel and reveals His commandments. It contained the two tablets of stone which were thought to go back to the Mosaic period, a vessel of manna and the rod of Aaron. It was carried on the head of the column when the Hebrews traveled through the desert and before the army in battle. After the settlement of the Israelites in Canaan the ark was finally established at Shiloh, [Shiloh was 9 mi NNE of Bethel, in the central mountain range.] It was taken into battle against Philistines, who defeated Israel and captured the ark. It was finally placed in the temple of Solomon.

[تابوتِ سکینہ یا عہد کا تابوت] کیکر کی لکڑی کا بنا ہوا ایک چھوٹا دستی طور پر قابلِ منتقلی بکس یا صندوقچہ جو پونے چار ضرب سوا دو ضرب سوا دو فٹ کا تھا اور جس پر اندر اور باہر سونا جڑا ہوا تھا۔ اس کے اوپر دو کروبی ایک دوسرے کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ اسرائیل سے ملاقات کرتا اور اپنے احکامات کا القا کرتا تھا۔ اس میں پتھر کی وہ دو الواح بھی موجود تھیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ وہ عہدِ موسوی کا بقیہ ہیں اور ایک 'مَنّ' کا برتن اور ہارونؑ کا عصا بھی تھا۔ جب عبرانی لوگ صحرا میں سفر کرتے تو اُس وقت اس طرح لے جایا جاتا کہ یہ قطاروں سے آگے ہو اور جنگوں میں اسے فوج کے آگے آگے لے جایا جاتا تھا۔ اسرائیلیوں کے کنعان میں آباد ہو جانے کے بعد تابوت کو بالآخر شیلوہ [یہ مرکزی پہاڑی سلسلے میں بیت ایل کے شمال شمال مشرق میں نو میل کے فاصلے پر واقع تھا] کے مقام پر مستقل طور پر رکھ دیا گیا۔ اسے فلسطینیوں کے خلاف جنگ میں لے جایا گیا جنھوں نے اسرائیل کو شکست دی اور اس تابوت پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر اسے ہیکلِ سلیمانی میں رکھ دیا گیا۔

2. *Smith's Dic. of the Bible*, 679 observes:

The gold and silver alone accumulated by David are at the lowest reckoned to have amounted to between two and three billion dollars.

داؤدؑ نے [بیت المقدس کی تعمیر کے لیے] جو سونا اور چاندی جمع کیا تھا صرف اسی کی قیمت کا کم از کم تخمینہ

دو اور تین بلین ڈالر کے درمیان بنتا ہے۔

بظاہر یہ ناممکن نظر آتا ہے۔ لگتا یہ ہے کہ لغت نگار نے اس کا حساب کتاب تواریخ کے مطابق لگایا ہوگا جو اپنی مبالغہ آرائیوں کے لیے مشہور ہے (ملاحظہ کیجیے ا۔ تواریخ ۲۲:۱۴)۔

3. *7th Day Adventist Bible Dic.*, p. 1099 ff.

۴۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ حرم شریف سے مراد نہ تو مسجدِ عمر ہے اور نہ مسجدِ اقصیٰ، بلکہ اس سے مراد وہ سارا رقبہ ہے، جو ہیرودِ اعظم کے ہیکل میں شامل تھا۔

5. *The Jewish Enc.* 12:100.

ضمیمہ ۴

'یروشلم' کی مختصر تاریخ

(ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری)

کیا یروشلم دار السلام ہے؟

'یروشلم' کنعان کے قدیم شہروں میں سب سے معروف شہر ہے۔ آج سے قریباً تین ہزار سال قبل حضرت داؤد علیہ السلام نے اس شہر کو اپنی عظیم سلطنت 'اسرائیل' کا دار الحکومت بنایا۔ یہیں سے اس شہر کی عظمت اور مرکزی حیثیت کو ایک نیا مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔ یہی شہر ہے جو حضرت عیسٰیؑ کی زندگی کے اہم ترین ایام کا شاہد تھا۔ اسی شہر میں آپؑ نے اپنی دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا اور مسیحی عقائد کے مطابق یہیں ان کو مصلوب کیا گیا۔ دین اسلام میں بھی اس شہر کی اہمیت مسلمہ ہے۔ پیغمبر اعظم و آخر ﷺ نے تمام انبیاے کرامؑ کی امامت بھی اسی شہر میں فرمائی اور معراج کے سفر کا آغاز بھی اسی مقام سے ہوا۔ گویا یہ شہر بہ یک وقت دنیا کے تین اہم ترین ادیان کے لیے دینی مرکز کی حیثیت کا حامل ہے۔

مقالہ ہذا میں یروشلم کی تاریخی حیثیت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ امن یا سلامتی کے اعتبار سے اس شہر کی کیا نوعیت ہے۔

'یروشلم' کا لغوی مفہوم

'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ بائبل انسائیکلوپیڈیا' میں اس کے لفظی معانی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

With regard to the meaning of the original name there is no

concurrence of opinion. The oldest known form, Ura-sa-lim, has been considered by many to mean either the 'City of Peace' or the 'City of (the god) Salem,' but other interpreters, considering the name as of Hebrew origin, interpret it as the 'possession of peace' or 'foundation of peace.' It is one of the ironies of history that a city which in all of its long history has seen so little peace and for whose possession such rivers of blood have been shed should have such a possible meaning for its name.[1]

جہاں تک یروشلم کے اصل نام کے معنی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی قدیم ترین صورت Ura-sa-lim کا مفہوم اکثر لوگوں نے یا تو 'امن کا شہر' لیا ہے یا پھر اسے 'دیوتا سالم کا شہر' قرار دیا ہے، لیکن بعض دیگر شارحین نے اسے عبرانی الاصل قرار دے کر اس کا مفہوم 'غلبۂ امن' یا 'امن کی اساس' سمجھا ہے۔ تاریخ کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ایک ایسا شہر جس نے اپنی طویل تاریخ کے دوران میں شاذ ہی امن دیکھا ہو اور جس پر تسلط حاصل کرنے کے لیے اتنی خون کی ندیاں بہائی گئی ہوں، اُس کے نام کے یہ معنی قرار دیے جائیں۔

'یروشلم' تاریخ کے آئینے میں

زمانہ قبل از داؤدؑ

بائبل کے عہد نامہ قدیم کی کتاب پیدائش (۱۴:۱۸) میں اس شہر کا نام 'Salem' درج ہے۔ مزمور داؤدؑ (۷۶:۳) اور قدیم یہودی روایات میں اسے یروشلم کا نام دیا گیا ہے۔ جدید علما بھی اسی روایت کو درست قرار دیتے ہیں۔ انیسویں صدی ق م میں جب حضرت ابراہیمؑ یہاں تشریف لائے، اُس وقت خداوند تعالیٰ کا کاہن ملک صِدق (Melchizedek) سالم (Salem) کا بادشاہ تھا۔ اس کی قدامت کے متعلق 'یروشلم' نامی کتاب میں وضاحت کی گئی ہے:

Various pre-historic sites of the Lower Paleolithic period have been found. in the Mesolithic period, which followed, the climate was stabilized in its present form and, due to the prevailing dryness, conditions became much more difficult for prehistoric man in the Jerusalem area. Only two sites are dated to this period. the agricultural revolution of the Neolithic period enabled man to make progress against the desert: 16 sites are indicated for this period. in the Chalcolithic period, settlement contracted somewhat, probably because of the strong attraction of the Jordan Valley

and the Negev, which led to a relative decline of the mountain area.[2]

زمانہ قبل از تاریخ کے پتھر کے عہد[۳] کے ابتدائی دور سے متعلق مختلف مقامات دریافت ہوئے ہیں۔ بعد والے پتھر کے زمانے کے درمیانی دور[۴] میں آب وہوا موجودہ دور جیسی ہی ہوگئی تھی۔ (موسم میں) خشکی کا دور دورہ ہونے کی وجہ سے یروشلم کے علاقے میں زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کے لیے مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ اس دور کے صرف دو مقامات کے زمانے کا تعین کیا جاسکا ہے۔ پتھر کے آخری زمانے[۵] کے زرعی انقلاب نے انسان کو صحرا کی تسخیر میں پیش رفت کی صلاحیت عطا کی۔ اس دور کے سولہ مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ دھات کے زمانے[۶] میں غالباً وادیٔ اردن اور نجف کی اس مضبوط کشش کی وجہ سے آبادکاری میں کچھ کمی واقع ہوئی، جس کے نتیجے میں پہاڑی خطوں کی آبادی میں نسبتاً زوال آیا۔

'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ بائبل انسائیکلوپیڈیا' اس کی قدامت کی نشان دہی ان الفاظ میں کرتا ہے:

Pre-Israelite period, --- The beginnings of Jerusalem are long before recorded history; at various points in the neighborhood, e.g. at el-Bukei'a to the Southwest, and at the northern extremity of the Mount of Olives to the Northeast, were very large settlements of Paleolithic man, long before the dawn of history, as is proved by the enormous quantities of Celts[7] scattered over the surface. It is certain that the city's site itself was occupied many centuries before David, and it is a traditional view that the city called SALEM (Genesis 14:18), over which Melchizedek was king, was identical with Jerusalem.[8]

The first certain reference to this city about 1450 BC, when the name Ur-u-salem occures in several letters belonging to the Tell el-Marna Letters correspondence. In 7 of these letters occurs the name Abd Khiba, and it is clear that this man was 'king,' or governor of the city, as the representative of Pharaoh of Egypt. (...). Incidently we may gather that the place was then a fortified city, guarded partly by mercenary Egyptian troops, and there are reasons for thinking that then ruler of Egypt, Amenhotep IV, had made it a sanctuary of his god Aten --- the sun-disc.[9]

قبل از اسرائیل دور: یروشلم کی ابتدا تاریخ کے ضبطِ تحریر میں لائے جانے سے بہت پہلے ہوگئی تھی۔ قرب وجوار کے مختلف مقامات پر (مثلاً جنوب مغرب میں البقیعہ اور شمال مشرق میں کوہِ زیتون کے انتہائی شمالی علاقے میں) تاریخ کی ابتدا سے بہت پہلے پتھر کے ابتدائی زمانے کے انسان کی

بہت بڑی بڑی نو آبادیاں تھیں، جیسا کہ سطح زمین پر بکھری ہوئی پتھر کے اوزاروں کی بڑی تعداد سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ بذاتِ خود شہر کے محلِ وقوع پر داؤد سے کئی صدیاں پہلے کسی نہ کسی کا قبضہ تھا۔ روایتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ شہر، جسے سالم (Salem) کہا جاتا تھا (کتاب پیدائش ۱۴:۱۸) اور جس پر ملکِ صدق کی حکمرانی تھی، وہ یروشلم ہی تھا۔

اس شہر کا پہلا یقینی حوالہ ۱۴۵۰ ق م کے قریب ملتا ہے، جب یوروسالم (Ur-u-salem) کا نام ان متعدد مکتوبات میں وارد ہوا، جن کا تعلق تل الامرنا کے خطوط سے ہے۔ ان خطوط میں سے سات خطوط ایسے ہیں جن میں عبد خیبا (Abd Khiba) کا نام مذکور ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ شخص فرعونِ مصر کے نمائندے کے طور پر اس شہر کا 'بادشاہ' یا گورنر تھا۔ (....)۔ اتفاق سے اس بات کے شواہد بھی ملے ہیں کہ یہ مقام اُس وقت ایک قلعہ بند شہر تھا، جسے جزوی طور پر مصر کے اجرتی سپاہیوں کا تحفظ بھی حاصل تھا۔ یہ سوچنے کے لیے مضبوط شواہد موجود ہیں کہ اس وقت کے مصری حکمران امن ہوتپ چہارم (Amenhotep IV) نے اس علاقے کو اپنے دیوتا آتن (Aten) کی عبادت گاہ کے لیے منتخب کیا تھا۔ آتن (Aten) سے مراد ہے سورج کی طشتری۔

ایک روایت کے مطابق ۳۲۰۰ ق م سے بھی پہلے یہاں آبادی موجود تھی[۱۰]۔ یروشلم شہر کی کھدائی کے نتیجے میں چار ہزار سال ق م کے ظروف ملے ہیں[۱۱]۔ ابتدائی کانسی کے دور (Early Bronze Age 3150-2200 BCE) اور وسطی کانسی کے دور (Middle Bronze Age 2200-1550 BCE) کے دستیاب ظروف سے ثابت ہوتا ہے کہ اس علاقے میں تیسرے اور دوسرے ہزارے قبل مسیح کے نصف اول میں بھی لوگ آباد تھے۔ ایک مشہور مستشرق، مؤرخ اور مصنف Stewart Henry Perowne لکھتے ہیں:

Excavation has shown that a settlement existed on the site south of the Temple platform, possibly in the Early Bronze Age and certainly by 1800 BC. A massive town wall still survives, just above the spring that determined the location of the ancient settlement.[۱۲]

علاقے کی کھدائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممکنہ حد تک ابتدائی کانسی عہد اور یقینی طور پر ۱۸۰۰ ق م تک ہیکل کے چبوترے (Temple Platform) کے جنوب میں ایک آبادی موجود تھی۔ چشمے کے بالائی طرف اب بھی ایک بھاری بھرکم فصیلِ شہر موجود ہے، جس کے ذریعے سے قدیم آبادی کے محلِ وقوع

کا تعین ہوتا ہے۔

اس دور کا فصیل والا یہ شہر بہت چھوٹا تھا جو صرف نو یا دس ایکڑ رقبے پر محیط تھا۔ چشمے کے قدرے شمال میں بالائی سرے پر ایک مقدس مقام تھا۔ شاہی محل اور قبرستان اس کے نیچے واقع تھے اور باقی ماندہ پہاڑی اپنے جنوبی سرے تک شہر پر مشتمل تھی۔ ابتدائی کانسی دور کی فصیل کی باقیات اس پہاڑی کے اسی حصے میں دریافت ہوئی ہیں۔ پندرھویں صدی ق م میں Hurrians یا Horites نامی اقوام فلسطین میں وارد ہوئیں۔ مراسلاتِ امرنا لکھنے والوں میں سے ایک شخص عبد حبا ('Abd Hiba) یا ارتی ہیپا (Arti-Hepa) تھا جو چودھویں صدی ق م میں یروشلم پر حکمران تھا۔ اوفیل (Ophel) کی مشرقی ڈھلوان پر پتھر سے بنے ہوئے ایک قلعے کی مضبوط فصیل اسی دور سے تعلق رکھتی ہے۔[۱۳] بارھویں صدی ق م کی ابتدا میں 'بنی یہودا [اسی طرح بنی شمعون بھی (دیکھیے قضاۃ ۱:۸)] نے یروشلم کے خلاف جنگ لڑی اور اسے فتح کرلیا۔ انھوں نے اس شہر کے باشندوں کو قتل کیا اور شہر کو نذرِ آتش کردیا'۔[۱۴] اس آیت کے حوالے سے W. Smith ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

In the fifteen centuries which elapsed between this siege and the siege and destruction of the city by Titus, A.D. 70, the city was besieged no fewer than seventeen times; twice it was razed to the ground, and on two other occasions its walls were levelled. in this respect it stands without a parallel in any city, ancient or modern.[15]

۷۰ عیسوی میں Titus رومی کے ہاتھوں شہر کی تباہی اور ان محاصروں کے درمیان جو پندرہ صدیاں گزریں اُن میں اس شہر کا سترہ سے زیادہ مرتبہ محاصرہ کیا گیا۔ دو مرتبہ تو اسے پیوندِ خاک کردیا گیا۔ دیگر دو مواقع پر اس کی فصیل منہدم کردی گئی۔ اس لحاظ سے اس شہر کا موازنہ کسی بھی قدیم یا جدید شہر سے نہیں کیا جاسکتا۔

یبوسی قوم (Jebosites) نے جلد ہی اس شہر پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور شہر کو از سرِ نو تعمیر کیا۔[۱۶]

حضرت داؤد کا دورِ حکومت

دسویں صدی ق م کے ربع اول میں حضرت داؤد علیہ السلام نے یبوسی قوم کو شکست دے کر یروشلم

پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنی عظیم سلطنت کا دار الحکومت بنا لیا۔ یہ بڑی تاریخی اہمیت کا اقدام تھا۔ یہ شہر نہ تو بنی اسرائیل کے شمالی قبائل کے علاقے میں واقع تھا اور نہ جنوبی قبائل کے علاقے میں۔ لہٰذا اس کے جغرافیائی محل وقوع نے ریاست کے اتحاد میں اہم کردار ادا کیا۔ آپؑ نے اپنے محل کے قریب ایک خیمہ لگا کر اور تابوت سکینہ (Ark of Covenant) کو اس میں منتقل کر کے اس شہر کو قوم کا مذہبی دار الحکومت بھی بنا دیا۔ آپؑ ایک خانۂ خدا بھی بنانا چاہتے تھے، البتہ کاتبِ تقدیر نے انھیں اس بات کی اجازت نہ دی (۲۔سموئیل ۷)۔[17]

حضرت سلیمان علیہ السلام نے یروشلم میں اپنا محل اور ہیکل (بیت المقدس) تعمیر کروایا۔ انھوں نے شہر کے گرد ایک فصیل بھی تعمیر کرائی، کیونکہ یہ شہر ان کے اور اُن کے والد حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں کافی وسعت اختیار کر چکا تھا، تاہم حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد یہ عظیم سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ شمالی سلطنت کا نام اسرائیل تھا اور اُس کا دار الحکومت سامرہ (Samariah) تھا۔ جنوبی سلطنت کا نام یہودیہ (Judea) تھا اور اس کا دار الحکومت یروشلم تھا۔ شمالی سلطنت میں بنی اسرائیل کے بارہ میں سے دس قبائل آباد تھے، جبکہ جنوبی ریاست میں دو قبائل بس گئے۔ ان دونوں ریاستوں کے مابین اگلی دو صدیوں تک شدید چپقلش چلتی رہی، تاہم ہیکل کی موجودگی کی وجہ سے یروشلم کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد کا زمانہ

اس شہر کو ۹۲۲ ق م میں فرعون مصر شیشک (Sheshak) یا شیشونق (Sheshonq I) نے خوب لوٹا۔ نویں صدی ق م کے وسط میں بھی یہ شہر فلسطینیوں اور عربوں کے ہاتھوں کئی مرتبہ لوٹا گیا۔

By the reign of Jehoshapht the city had again largely recovered its importance (cf. I Kings 22), but in his son Jehoram's reign (849-842 BC) Judah was invaded and the royal house was pillaged by Philistians and Arabs (2 Chron. 21: 16-17).[18]

یہوشافت (Jehoshapth) کے دورِ حکومت میں شہر نے اپنی اہمیت بڑی حد تک دوبارہ حاصل کر لی تھی، لیکن اس کے بیٹے یہورام (Jehoram) کے دورِ حکومت (۸۴۹-۸۴۲ ق م) میں

فلسطینیوں اور عربوں نے سلطنت یہودیہ پر چڑھائی کر کے شاہی محلات کو تاخت و تاراج کر دیا (۲-تواریخ ۲۱: ۱۶-۱۷)۔

۷۸۶ ق م میں بادشاہ امازیہ (Amaziah) کے دورِ حکومت (۷۹۷-۷۶۷ ق م) میں شمالی ریاست اسرائیل کے بادشاہ یہوعاش (Jehoash) (۷۹۸-۷۸۲ ق م) نے یروشلم پر چڑھائی کی[19]۔ اور بیت شمس (Beth-shemesh) کے مقام پر جنوبی ریاست یہودیہ کو شکست دی۔

(...), and [Jehoash of Israel] brake down the wall of Jerusalem from the gate of Ephraim unto the corner gate, 400 cubits. And he took all the gold and silver, and all the vessels that were found in the house of the Lord [Temple of Solomon], and in the treasures of the king's house, and hostages, and returned to Samaria.[20]

(...) اور [اسرائیل کے بادشاہ یہوعاش (Jehoash) نے] یروشلم کی فصیل میں سے بابِ افرائیم کے مقام سے لے کر بغلی دروازے تک چار سو کیوبٹس (ہاتھ) حصہ گروا دیا۔ اُس نے خانۂ خدا اور شاہی محل کے خزانوں سے ملنے والے تمام سونے چاندی، برتنوں اور یرغمالیوں پر قبضہ کر لیا اور سامرہ واپس چلا گیا۔

عمازیہ (Amaziah) کے بیٹے عزاریا (Uzziah/Azariah) نے ۷۶۷ ق م سے لے کر ۷۴۰ ق م تک یہودیہ پر حکمرانی کی۔ اس نے شہر کی فصیل کی مرمت کرائی اور اس کی مضبوطی بڑھانے کے لیے بُرج تعمیر کرائے۔ عزاریا (Azariah) کے بیٹے احاز (Ahaz) نے اپنی چھوٹی سی ریاست کی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے ہمسایہ اشوری سلطنت کے بادشاہ تغلث پائلسر سوم (Tiglath-pilser III) کے ساتھ ایک خطیر رقم کے عوض اتحاد کر لیا۔ اُس نے اپنے دین و مذہب کے بارے میں بھی اس حد تک کمزوری کا مظاہرہ کیا کہ ہیکل میں اپنی ذاتی عبادات کے لیے تغلث پائلسر کے عبادت کے چبوترے سے ملتا جلتا ایک چبوترہ تعمیر کیا (۲-سلاطین ۱۶: ۱۰-۱۲)۔ اُس کا دورِ حکومت مشرکانہ رسوم و عبادات سے داغ دار ہے۔ اُس نے یہاں تک کیا کہ بلی دان (انسانی قربانی) کے طور پر اپنے بیٹے کو آگ پر سے گزارا (۱-سلاطین ۱۶: ۳-۴؛ مزید دیکھیے ۲-تواریخ ۲۸: ۳)۔

اشوریوں کے ہاتھوں تباہی

ہوشیاہ (Hoshea) کے دورِ حکومت (۷۳۱-۷۲۲ ق م) میں ۷۲۲ ق م میں اشوری بادشاہ شلمانسر (Shalmaneser) کے بیٹے سارغون دوم (Sargon II) نے شمالی سلطنت اسرائیل کے دارالحکومت سامرہ پر قبضہ کر کے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور قریباً 27,290 بنی اسرائیلیوں کو اسیرِ جنگ بنا کر سامریہ سے گوزان (Gozan)، حاران (Harran)، میڈیا (Media)، حولہ (Hullah)، اور نینوا (Ninevah) میں لے جا بسایا۔ اُس وقت جنوبی ریاست یہودیہ پر بادشاہ احاز (Ahaz) (۷۳۲-۷۱۶ ق م) کی حکومت تھی۔

جنوبی سلطنت یہودیہ پر شاہ احاز (Ahaz) کے بعد اس کا بیٹا حزقیاہ (Hezekiah) (۷۱۶-۶۸۶ ق م) تخت نشین ہوا۔ اُس نے بعض مذہبی اصلاحات نافذ کیں۔ حزقیاہ (Hezekiah) کے بعد اس کا بیٹا منسی (Manasseh) (۶۸۶-۶۴۲ ق م) حکمران بنا۔ اس نے قریباً پچاس سال یہودیہ پر حکومت کی۔ اُس کا دورِ حکومت اسرائیلی مذہب کے لیے تاریک زمانہ ثابت ہوا۔ اس نے ہیکل سلیمانی تک میں بتوں کی پرستش کو رواج دیا۔ وہ اسرائیلی مذہب کو بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اشوری بادشاہ سینا قرب (Sennacherib) (۷۰۵-۶۸۱ ق م) ۷۰۱ ق م میں قید کر کے اُسے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ نامعلوم عرصے تک وہاں قید رہنے کے بعد وہ واپس یروشلم آ گیا۔

یہودیہ کی تاریخ نے ایک اور کروٹ لی اور عمون (Amon) کا بیٹا یوسیاہ (Josiah) ۶۴۰ ق م میں یہاں کا بادشاہ بنا۔ اس نے ہیکل میں موجود بت پرستی کی تمام باقیات کو وہاں سے ہٹایا اور ہیکل کے تقدس اور عظمت کو بحال کیا اور اس کی مرمت اور تزئین کے کام کا آغاز کیا۔ دورانِ مرمت قریباً ۶۲۱ ق م میں اس وقت کے سردار کاہن حلقیاہ (Hilkiah) کو ہیکل میں سے 'خداوند کے قانون کی کتاب' کا ایک نسخہ ملا۔ یرمیاہ نبی نے حلقیاہ کی سلطنت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تعلیم و تربیت کی توسیع و اشاعت کے سلسلے میں اُس کی مدد کی۔ اُس نے بت پرستی اور اوہام پرستی کا ہر نقش مٹا دینے کی کوششیں کیں۔ یوسیاہ کو ۶۰۹ ق م میں فرعون مصر نیخو (Necho) کے ساتھ جنگ کے دوران

میں اِسدرالون (Esdraelon) کی وادی میں ایک مہلک ضرب آئی اور یروشلم پہنچنے سے قبل ہی وہ موت کی آغوش میں چلا گیا۔[۲]

یہودیہ کے مشرق کی جانب اسی دوران میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ بابلیوں نے اشوری سلطنت کے دارالحکومت نینوا پر قبضہ کرلیا۔ ۶۱۲ ق م میں بابلیوں نے اشوریوں سے یروشلم کی حکمرانی بھی چھین لی۔ انھوں نے ۶۰۹ ق م میں اشوری سلطنت کا مکمل خاتمہ کردیا۔ انھوں نے یروشلم کو تاخت وتاراج کیا اور اس کے بادشاہ کو بابل لے گئے۔

اسی دوران میں یرمیاہ نبی (تقریباً ۶۴۰-۵۸۰ ق م) نے بیالیس (تقریباً ۶۲۶-۵۸۴ ق م) سال تک نبوت کے فرائض سرانجام دیے۔ وہ یروشلم کے گلی کوچوں اور ایوانِ اقتدار میں جاکر اس بات کی پیشین گوئی کرتے رہے کہ شہر پر تباہی آنے والی ہے۔ بادشاہ اور اُس کے دربار میں یہ پیغامات سخت غصے اور نفرت کے ساتھ سنے گئے (کتاب یرمیاہ ۳۶:۲۳)۔

بابلیوں کے ہاتھوں تباہی

نبوکدنضر دوم (Nebuchadnezzer II) نے ۱۵ مارچ ۵۹۷ ق م میں یروشلم پر قبضہ کرلیا۔ یروشلم کا تمام خزانہ لوٹ لیا گیا۔ بہت سے یہودی بشمول یہویاکین (Jehoiachin) اور حزقی ایل (Ezekiel) جلاوطن کردیے گئے۔ نبوکدنضر (معروف نام بخت نصر) نے صدقیاہ (Zedekiah) کو یروشلم کا بادشاہ نامزد کردیا۔ صدقیاہ (Zedekiah) نے دس سال بعد نبوکدنضر کے خلاف بغاوت کا اعلان کردیا۔ نبوکدنضر نے ایک برس سے زائد عرصہ تک شہر کا محاصرہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ قحط نے شہر کو ویران کردیا۔ رات کے وقت تمام جنگجو دو دیواروں کے درمیان والے دروازے سے، جو شاہی باغ کے قریب تھا، فرار ہوگئے۔ بادشاہ خود بھی عربہ (Arabah) کی طرف چلا گیا، لیکن یریحو کے میدان میں اُسے گرفتار کرلیا گیا۔ بابل سے غداری اور بے وفائی کی وجہ سے اُسے عبرت ناک سزا دی گئی (۲-سلاطین ۲۵:۱-۷)۔ شہر اور ہیکل میں لوٹ مار کے بعد آگ لگا دی گئی۔ یروشلم کی فصیل کو گرا دیا گیا (۲-سلاطین ۲۵:۸ و بعد اور ۲-تواریخ ۳۶:۷ او بعد)۔ غالب

امکان یہ ہے کہ تابوتِ سکینہ کو بھی اسی دوران میں غائب کر دیا گیا۔

شہنشاہ ایران کے تحت باج گزاری

۵۳۸ ق م میں ایرانی بادشاہ خورس (Cyrus) نے بابلی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے یہودیوں کو یروشلم واپس جانے اور خداوند کا گھر دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی (عزرا ۱:۱ و بعد)۔ یہودیہ کے شہزادے شش بضر (Sheshbazzar)، جو ایک صوبے کا گورنر بھی تھا، کی سربراہی میں چالیس ہزار سے زیادہ لوگ واپس آئے اور ہیکل کے مقدس ظروف بھی اپنے ساتھ لائے۔ روزانہ کی قربانیوں کا دوبارہ اجرا ہوا اور دعوتیں اور روزے بحال کر دیے گئے (عزرا ۳:۱-۷)۔ واگزار کردہ ہیکلِ سلیمانی کی بنیادیں رکھی گئیں (عزرا ۳:۱۰، ۵:۱۶)، لیکن سامریوں اور علاقے کے لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے عمارت کی تعمیر کہیں بیس سال بعد جا کر مکمل ہو سکی (عزرا ۶:۱۵)۔

مارچ ۵۱۶ ق م میں معبد کی عمارت مکمل ہو گئی اور ۵۱۵ ق م میں یروشلم کو خود مختاری کا درجہ دے دیا گیا اور اسے سلطنت یہودیہ کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

نحمیاہ نبی نے ۴۴۴ ق م میں شہر کی قلعہ بندیوں اور فصیل کی تعمیر کی۔ یہ نئی تعمیر باون دنوں میں مکمل ہوئی۔ بلاشبہ یہ دیوار اُس دیوار کی نسبت کمزور تھی جسے نبوخذنضر نے ۱۴۲ سال پہلے گرا دیا تھا، تاہم نئی تعمیر کردہ دیوار کو انھی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا اور اس کا ڈھانچا بھی وہی تھا۔ اس شہر کے آیندہ سو سال کی تاریخ 'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ بائبل انسائیکلوپیڈیا' میں ان الفاظ میں بیان کی ہے:

For the next 100 years we have scarcely any historical knowledge of Jerusalem. A glimpse is afforded by the papyri of Elephantine where we read of a Jewish community in Upper Egypt petitioning Bagohi, the governer of Judea, for permission to rebuild their own temple to Yahweh in Egypt; incidently they mention that they had already sent an unsuccessful petition to Johanan the high priest and his colleagues in Jerusalem. In another document we gather that this petition to the Persian governor was granted. These documents must date about 411-407 BC. Later, probably about 350, we have somewhat ambiguous refernece to the destruction of Jerusalem and the captivity of numbers of Jews in the time of Artaxerxes (III) Ochus (358-337 BC). With the battle of Issus and Alexander's

Palestinian campaign (ca. 332 BC), we are upon surer historical ground.[22]

یروشلم کی آیندہ سو سال کی تاریخ کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ اس کی ایک معمولی سی جھلک ایلیفنٹائن پیپائرس میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں ہم بالائی مصر کی ایک یہودی کمیونٹی کے متعلق پڑھتے ہیں کہ انھوں نے یہودیہ کے گورنر بگوہی (Bagohi) کے دربار میں درخواست دائر کی کہ انھیں مصر میں یہوواہ (Yahweh) یعنی اللہ تعالیٰ کے ہیکل کی تعمیر نو کی اجازت دی جائے۔ ضمنی طور پر انھوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ انھوں نے پہلے بھی سردار کاہن یوحانن (Johanan) اور اُس کے یروشلم کے دیگر رفقا کو ایک درخواست پیش کی تھی جو شرف قبولیت حاصل نہ کر سکی تھی۔ ایک اور دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ یہ درخواست علاقے کے ایرانی گورنر کو پیش کی گئی تھی اور اسے قبول کر لیا گیا تھا۔ یہ دستاویزات ۴۱۷ تا ۴۱۱ ق م کے دوران کی معلوم ہوتی ہیں۔ بعد ازاں غالباً ۳۵۰ ق م کے قریب، ہمیں کچھ مبہم سے حوالے ملتے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارطخشس سوم اُوخوس (Artaxerxes III Ochus) کے زمانے (۳۵۸-۳۳۷ ق م) میں یروشلم تباہ کر دیا گیا اور یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو غلام بنا لیا گیا۔ جنگ عیسوس (Issus) اور اسکندر اعظم کی فلسطین پر چڑھائی (قریباً ۳۳۲ ق م) کی بدولت ہمیں زیادہ قابلِ یقین تاریخی بنیاد دستیاب ہوئی ہے۔

یونانی دور

سلطنت فارس کے زوال پذیر ہونے میں مقدونیہ (یونان) کے عظیم فاتح اسکندر کی فتوحات کا بہت عمل دخل ہے۔ اسکندر کی فتوحات کا آغاز قریباً ۳۳۳ ق م سے شروع ہوا اور ۳۲۳ ق م میں اس کی وفات تک تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ مصر کے بطلیموسوں اور انطاکیہ (شام) کے سلوسیوں (Seleucids) میں گھر کر فلسطین کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ باری باری اس کے حکمران بنتے رہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک موقعے پر فلسطینیوں کی طرف سے ادا کردہ خراج ان دونوں کے درمیان تقسیم ہوا۔ بطلیموس نے اسکندریہ فتح کر کے اسے ریاست کا دارالحکومت بنا دیا۔ ۳۲۱ ق م میں بطلیموس سوتر (Ptolemy Soter) نے فلسطین پر حملہ کیا اور کہا یہ جاتا ہے کہ چال بازی سے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ قربانی ادا کرنے کے لیے بے تاب ہے اور اس بہانے سبت

کے دن شہر میں داخل ہوگیا۔ وہ اپنے بہت سے یہودی اسیروں کو مصر لے گیا اور انھیں وہاں آباد کر دیا۔ اِن متحارب بادشاہیوں کے درمیان آویزشوں میں اگرچہ فلسطین کو بہت نقصان اٹھانا پڑا، تاہم بذاتِ خود دارالحکومت مصر کی حکمرانی کے تحت محفوظ رہا، کیونکہ یہ الگ تھلگ جگہ پر واقع تھا۔ ۲۱۷ق م میں بطلیموس چہارم فِلو پیٹر (Ptolemy IV Philopator) نے رافیہ کے مقام پر انطیوکس سوم (Antiochus III) کو شکست دینے کے بعد یروشلم میں واقع ہیکل کا دورہ کیا اور قربانیاں پیش کیں۔ بیان کیا جاتا ہے (۳-مکابیون ۱:۱-۷) کہ وہ قدس الاقداس میں بھی گیا تھا۔

انطیوکسِ اعظم سوم (۲۲۳-۱۸۷ق م) نے ۱۹۸ق م میں بطلیموس پنجم کو شکست دی جس کے نتیجے میں فلسطین پر سلوسیوں کا قبضہ ہوگیا۔ یہودیوں نے عکرہ کے مقام پر مصریوں کی چھاؤنی کا محاصرہ کرنے میں اُس کی مدد کی۔ یسوع بن سیرہ نے اس زمانے کے قریب (۱۹۰-۱۸۰ق م) شہر کی خوش حالی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہودیوں کو مصریوں کے ماتحت کافی حد تک خوش حالی اور مذہبی آزادی حاصل تھی، لیکن سلوسیوں کے نئے حکمران نے ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا اور یہودی عقائد پر ایمان کو سلوی حکمرانی کے خلاف بغاوت تصور کیا جانے لگا۔ انطیوکس سوم کو ۱۹۰ق م میں میگنیشیا (Magnesia) کے مقام پر رومیوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔ جو اُس کے بیٹے انطیوکس چہارم کو یرغمال بنا کر روم لے گئے۔ انطیوکس چہارم کو ۱۷۵ق م میں دیمیتریس (Demetrius) کے بدلے میں رہا کر دیا گیا اور اُسے شام کے تخت پر قابض ہونے (۱۷۵تا۱۶۴ق م) کی اجازت دے دی گئی۔ انطیوکس چہارم نے جلدی سے ایک بڑی فوج کے ساتھ یروشلم پر حملہ کیا، اس پر قبضہ کر لیا، لوگوں کا قتلِ عام کیا اور ہیکل کو تاخت وتاراج کر دیا (۱-مکابیون ۱:۲۰-۲۴)۔ ایسا لگتا ہے کہ دو سال بعد مصر میں رومیوں کے تسلط سے خوف زدہ ہوکر انطیوکس نے مُصمّم ارادہ کرلیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر یروشلم میں مصر کے حمایتیوں کو نہیں رہنے دے گا۔ ۱۶۸ق م میں اُس نے اپنے خراج کے مُنتظمِ اعلیٰ کو اُدھر روانہ کیا جس نے ایک مضبوط فوج کے ساتھ شہر پر حملہ کیا اور اُس میں داخل ہوگیا (۱-مکابیون ۱:۳۰)۔ اُس نے شہر میں خوب لوٹ مار کا بازار گرم کیا، اُسے نذرِ آتش کر دیا اور فصیلِ شہر

اور آبادیوں کو مسمار کردیا۔ اُس نے لوگوں کا قتل عام کیا اور بہت سی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کردیا (۱-مکابیون ۱: ۳۱-۳۵، ۲-مکابیون ۵: ۲۴)۔ اُس نے یروشلم کے عظیم ہیکل کو نیست و نابود کردیا اور یہودیہ کے لوگوں کو بت پرست بنانے کی کوشش کی۔

'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ انسائیکلوپیڈیا' واضح کرتا ہے:

He [Antiochus Iv] sacrificed swine upon the holy altar, and caused the high priest himself --- a Greek in all his sympathies --- to partake of the impure sacrificial feasts; he tried by barbarous cruelties to suppress the ritual of circumcision. In everything he endeavoured, (...), to organize Jerusalem as a Greek city, and to secure his position he built a strong wall, and a great tower for the Akra, and, having furnished it well with armor and victuals, [23] he left a strong garrison. But the Syrians had overreached[24] themselves this time, and the reaction against persecution and attempted religious suppression produced the great uprising of the Maccabeans.[25]

اُس [انطیوکس] نے مقدس چبوترے پر خنزیروں کی قربانیاں پیش کیں اور سردار کاہن کو، جو خود بھی اپنی تمام ہمدردیوں کے لحاظ سے ایک یونانی تھا، ان ناپاک قربانیوں کی ضیافتوں میں شامل کیا۔ اُس نے وحشیانہ مظالم کے ذریعے سے ختنے کی رسم ختم کرنے کی کوشش کی۔ ہر بات میں اُس نے کوشش کی کہ (...) یروشلم کو ایک یونانی شہر کی طرح منظم کرے اور اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے اُس نے ایک مضبوط دیوار اور عکرہ کے لیے ایک عظیم برج تعمیر کیا اور اِسے اچھی طرح اسلحے اور سامانِ رسد فراہم کر کے وہاں ایک مضبوط فوج مقرر کی، لیکن اس دفعہ شامیوں کو اپنی ناممکن الحصول کاوشوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور جبر و استبداد اور مذہبی تشدد سے شدید ردِعمل پیدا ہوا اور مکابی اِس کے خلاف پوری طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔

مکابی (حسمونی) بغاوت

۱۶۷ق م میں مودن شہر کے ایک یہودی پیشوا متاتیاس (Mattathias) نے انٹیوکس کی عائد کردہ پابندیوں کو ماننے سے انکار کردیا اور اپنے بچوں کو ساتھ لے کر لُد (Lydda) کی بیرونی پہاڑیوں کی طرف فرار ہوگیا اور علم بغاوت بلند کردیا۔ ۱۶۵ق م میں متاتیاس (Mattathias) انتقال کر گیا اور اُس کے بعد اُس کے بیٹوں نے بغاوت جاری رکھی۔ یہودہ مکابی اور اس کے بھائیوں

نے یروشلم کو شامیوں کے قبضے سے واگزار کرایا۔ انھوں نے عظیم ہیکل کو مشرکانہ آلائشوں اور بتوں سے پاک کیا، مقدس قربان گاہ کو از سرِ نو تعمیر کیا اور ہیکل کی عبادتی سرگرمیوں کو بحال کیا۔

ابتدا میں یہودہ (مکابی) نے تین شامی افواج کو کھلے میدان میں شکست دی، لیکن وہ عکرہ میں تعینات فوجی دستوں کو نہ نکال سکا۔ ۱۶۳ ق م میں ایک عظیم شامی لشکر ان دستوں کی مدد کے لیے بھیجا گیا جو سخت دباؤ میں تھے۔ لائیسیاس (Lysias) اپنے نوجوان بادشاہ (انٹیوکس پنجم) کی بذاتِ خود معیت میں جنوبی سمت سے بیت زور (Beth-Zur) کے راستے شہر میں پہنچا۔ بیت زکریا (Beth-Zachariah) کے مقام پر یہودیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور یہودہ کا بھائی الیعزر (Eleazer) مارا گیا۔ جلد ہی یروشلم پر بھی قبضہ ہوگیا۔ کوہِ صیہون (Zion) پر واقع قلعہ جس نے بیتِ مُقدّس کو گھیرا ہوا تھا، ایک معاہدے کے تحت اُن کے حوالے کردیا گیا، مگر جب بادشاہ کو اُس کی قوت کا علم ہوا تو اُس نے اپنا معاہدہ ختم کردیا اور قلعہ بندیوں کو تباہ و برباد کردیا۔ (۱-مکابیون ۶:۶۲)، لیکن اِس مایوس کن صورت حال میں بھی یہودہ اور اُس کے پیروکار محفوظ رہے۔ فلپس نامی ایک جھوٹے مدعی نے سلطنت کے کسی دور دراز علاقے میں علمِ بغاوت بلند کردیا۔ اور لائیسیاس (Lysias) کو مجبوراً قوم پرست یہودیوں کے ساتھ ایسی شرائط پر صلح کرنی پڑی جو یہودہ کی شکست سے پہلے سے بھی زیادہ اُن کے حق میں تھیں، تاہم عکرہ کی فوجی چھاؤنی برقرار رہی تاکہ یہودیوں کو یہ بات یاد رہے کہ وہ آزاد نہیں ہیں۔ ۱۶۱ ق م میں ایک دوسرے شامی جرنیل نکانور (Nicanor) کو یہودہ کے خلاف بھیجا گیا، لیکن وہ پہلے تو دوستی کے جال میں پھنس گیا اور بعد میں یونانیوں کے گروہ کے برانگیختہ کرنے پر جب وہ یہودہ پر حملہ کرنے کے لیے مجبور ہوگیا تو اُس نے جلدی میں ترتیب دی ہوئی فوج کے ساتھ حملہ کیا اور یروشلم کے قدرے شمال میں عداسہ کے مقام پر شکست سے دوچار ہوا، تاہم یہودہ یہ جشن فتح منانے کے لیے زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔ ایک ماہ بعد ہی یروشلم کے سامنے بکائیڈز (Bacchides) نمودار ہوا اور اپریل ۱۶۱ ق م میں یہودہ اُس کے ساتھ جنگ میں بریع (Berea) کے مقام پر مارا گیا۔[۲۶]

۱۵۲ اق م تک اس علاقے پر عملاً یہودہ کے بھائی جوناتھن (Jonathan) کی حکمرانی تھی۔ اس نے اتنی کامیابیاں حاصل کیں جو اس کے خاندان میں اس سے پہلے کبھی کسی نے حاصل نہ کی تھیں۔ اسے سردار کاہن مقرر کر دیا گیا اور ریاست یہودیہ کے بادشاہ کا نائب بھی بنا دیا گیا۔ اس نے شہر کی مرمت کی اور ہیکل کی قلعہ بندیوں کو بحال کیا۔ اس نے فصیلِ شہر کو مزید بلند کیا اور مشرقی فصیل کا ایک وسیع حصہ تعمیر کیا۔ اس نے شامی دستوں کو الگ تھلگ کرنے کے لیے عکرہ (Akra) اور شہر کے درمیان ایک بڑا ٹیلہ بھی تعمیر کرایا۔

جوناتھن کے بعد سائمن یہاں کا حکمران بنا۔ اس نے ۱۳۹ اق م میں عکرہ (Akra) پر قبضہ کرکے اسے تاخت و تاراج کیا۔ اور اُس پہاڑی کو پیوند خاک کر دیا جس پر یہ قائم تھا۔ ۱۳۵ اق م میں سائمن کا بیٹا جون ہارکینس (John Hyrcanus) اُس کا جانشین بنا۔ اُس نے ۱۳۵ سے ۱۰۴ اق م تک یہودیہ پر حکومت کی۔

مکابی کی اصطلاح عام طور پر متاتھیاس (Mattathias) اور اس کے بیٹوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، جبکہ حسمونی (Hashmonean) کی اصطلاح جون ہارکینس (John Hyrcanus) اور اس کی اولاد کے دورِ حکمرانی (۱۳۵ - ۶۳ ق م) کے لیے مستعمل ہے۔ ۱۳۴ ق م میں انٹیوکس ہفتم (Antiochus VII Sidetes) نے یروشلم پہنچ کر جون ہارکینس کا محاصرہ کر لیا۔ جون ہارکینس نے یرغمالی اور بھاری خراج دے کر اپنی جان چھڑائی۔ مکینزی (McKenzie) اپنی لغتِ بائبل میں لکھتا ہے:

After the death of Antiochus VII in 128 Judea was practically independent. John ruled with the title of ethnarch and high priest. He extended Jewish rule over E Palestine and Edom, where he forced the Edomeans to submit to circumcision. He attacked Samaria and destroyed the temple of Samaritans on Mt. Gerizim. The Pharisees, alarmed at his ambitions and secular character of his rule, broke with Hasmoneans during his reign.

Aristobulus I (105-104), son of John Hyrcanus: He imprisoned his mother, to whom the sovereignty had been bequeathed by the will of John, and imprisoned his brothers except Antigonus, whom he associated with himself in government but later assassinated. Aristobulus assumed the title of king.

Alexander Jannaeus (Jonathan), brother of Aristobulus I

(104-76): Salome Alexandra, widow of Aristobulus, released her brothers-in-law from prison and set Jonathan, who preferred to go by his Greek name, upon the throne. Alexander extended the Jewish kingdom, in spite of a number of setbacks, almost to the limits of the ancient kingdom of David. (...). Alexander extended his rule over Philistia (capturing it from Ptolemy Lathyrus of Egypt's Control) and (..) some of the Hellenestic cities. In his expansion northward in Palestine he confronted the Nabatean king Obadath, who held Damascus and halted his advance in that direction. This defeat aroused his adversaries among his own people, who summoned help from the Selucid king Demetrius III Eukairos. Demetrius invaded Judea and defeated Alexander. The defeat, however, turned the patriotism of the Jews to sympathy with Alexander; Demetrius, thus deprived of support, was forced to withdraw. Alexander revenged himself by having 800 of his Jewish captives and their wives and children executed before their eyes; he himself dined with his concubines, watching the spectacle. Antiochus XII Dionysus, the successor of Demetrius III, invaded Palestine, and Alexander was unable to resist him; but after Antiochus was defeated and killed by the Nabateans, Alexander continued his conquest in E Palestine. (...).

Salome (75-67), widow of Alexander Jannaeus: She appointed Hyrcanus II, the elder son of Alexander, high priest and recognizing the unchecked ambition of Aristobulus II, the younger son, kept him in private life. After her death the civil war between Hyrcanus and Aristobulus led each brother to seek the assistance of Pompey, then engaged in his eastern conquests. Aristobulus, however, finally refused Roman arbitration; and Pompey attacked and took Jerusalem in 63 BC. He ended the Hasmonean monarchy, detached the territories conquered by earlier Hasmonean rulers, and made Judea part of the province of Syria.[28]

۱۲۸ ق م میں انٹیوکس ہفتم کی موت کے بعد یہودیہ عملاً آزاد ہوگیا۔ جون نے قومی حکمران اور سردار کاہن کے لقب کے ساتھ حکمرانی کی۔ اُس نے مشرقی فلسطین اور ادوم تک یہودی حکمرانی کی توسیع کی، جہاں اُس نے ادومیوں کو ختنہ کی رسم اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اُس نے سامریہ پر حملہ کیا اور کوہِ جریزیم (Gerizim) پر واقع سامریوں کا ہیکل تباہ کردیا۔ فریسیوں نے اُس کی امنگوں اور اس کی حکمرانی کے لادینی کردار سے بدک کر اُس کے دورِ حکومت میں حسمونیوں سے اپنا رابطہ منقطع کرلیا۔

جون ہارکینس کے بیٹے ارسطوبیولس اول (Aristobulus I) نے، جو ۱۰۵ سے ۱۰۴ ق م تک حکمران رہا، اپنی والدہ کو گرفتار کرلیا جس کے حق میں جون ہارکینس نے حکمرانی کی وصیت کی تھی۔ اُس

نے انٹی گونس (Antigonus) کے سوا اپنے تمام بھائیوں کو بھی گرفتار کرلیا۔ انٹی گونس کو اُس نے اپنے ساتھ شریکِ اقتدار کرلیا، لیکن بعد میں اُس کو بھی قتل کردیا۔ ارسطو بیولس نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔

ارسطو بیولس کی بیوہ سلومی الیگزنڈرا (Salome Alexandra) نے ارسطو بیولس کے بھائی اور اپنے دیور سکندر جینیئس (Alexander Jannaeus or Jonathan) کو قید سے رہا کر کے اُسے تخت پر بٹھا دیا۔ اُس نے اپنے لیے جوناتھن کا یونانی نام اختیار کرنا پسند کیا۔ الیگزنڈر جوناتھن نے یہودی حکمرانی کو، متعدد مشکلات کے باوجود، قریباً قدیم سلطنتِ داؤد کی حدود تک وسیع کردیا۔ (...)۔ الیگزنڈر نے اپنی حدودِ سلطنت کو بعض یونانی شہروں تک اور فلسطیہ تک، جسے اُس نے مصر کے بطلیموس لیتھارَس (Ptolemy Lathyrus) کے قبضے سے چھڑایا تھا، پھیلا دیا۔ شمال کی طرف فلسطین میں اپنی توسیعی سرگرمیوں کے سلسلے میں اُس کو نبطیوں (Nabatean) کے بادشاہ عبودت (Obodath) کا سامنا کرنا پڑا جو دمشق پر قابض تھا۔ اُس نے اس سمت میں جوناتھن کی پیش قدمی کو روک دیا۔ اس شکست نے اُس کی اپنی قوم ہی میں سے اُس کے مخالفین پیدا کردیے، جنھوں نے سلوسی بادشاہ دیمتریس سوم یوکیراس (Demetrius III Eukairos) سے امداد طلب کرلی۔ دیمتریس نے یہودیہ پر حملہ کردیا اور الیگزنڈر کو شکست دی، تاہم اس شکست نے یہودیوں میں جذبۂ قومیت بیدار کر کے اُن کے دل میں الیگزنڈر کے لیے ہمدردی پیدا کردی۔ اس طرح اُن کی مدد سے محروم ہوکر دیمتریس کو دُم دبا کر بھاگنا پڑا۔ الیگزنڈر نے اپنے ۸۰۰ یہودی اسیروں اور اُن کے بیوی بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے تہ تیغ کرا کے اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا اور اس دوران میں وہ اس منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی کنیزوں کے ساتھ ناؤ ونوش کے مزے لیتا رہا۔ دیمتریس سوم کے جانشین انٹیوکس دوازدہم ڈائیونائی سس (Antiochus XII Dionysus) نے فلسطین پر حملہ کیا اور الیگزنڈر اُس کا مقابلہ نہ کرسکا، لیکن نبطیوں کے ہاتھوں انٹیوکس کے شکست کھانے اور مارے جانے کے بعد الیگزنڈر نے مشرقی فلسطین میں اپنی فتوحات جاری رکھیں۔ (...)۔

الیگزنڈر کی بیوہ سلومی (۷۵-۶۷ ق م) نے الیگزنڈر کے بیٹے ہارکینس دوم کو سردار کاہن مقرر کیا اور اُس کے چھوٹے بیٹے ارستوبیولس دوم کی غیر محدود امنگوں کو بھانپتے ہوئے اُسے منظرِ عام پر نہ آنے دیا۔ سلومی کی موت کے بعد اُن دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کی وجہ سے ہر

ایک پومپی (Pompey) سے مدد کا طالب ہوا، جو اُس وقت اپنی مشرقی فتوحات میں مصروف تھا، تاہم بالآخر ارستوبیولس نے رومیوں کی ثالثی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور پومپی نے ۶۳ ق م میں یروشلم پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے حسمونیوں کی حکمرانی ختم کر دی، قدیم حسمونی حکمرانوں کے مفتوحہ علاقوں کو اس سے الگ کر دیا اور یہودیہ کو شام کے صوبے کا حصہ بنا دیا۔

رومی دور

یونانی حکومت کے زوال کے بعد اس مقدس سرزمین پر رومیوں کی فرماں روائی قائم ہوگئی۔ رومی دورِ حکومت میں خطۂ اسرائیل کو فلسطین (Palestine) کے نام سے موسوم کیا جانے لگا اور یروشلم شہر کو ایلیا کے نام سے۔

رومی فرماں روا پومپی (Pompey) نے ہائرکینس (Hyrcanus) کو سردار کاہن کے منصب پر تو برقرار رکھا، لیکن اُسے 'بادشاہ' کا لقب اختیار کرنے سے منع کر دیا۔ اس نے احتراماً ہیکل کے خزانے پر کوئی دست درازی نہ کی، البتہ شہر پر بہت معمولی سا ٹیکس عائد کر دیا اور شہر کی فصیل کو منہدم کرا دیا، ارستوبیولس دوم (Aristobulus II) کو قیدی بنا کر روم منتقل کر دیا گیا اور شہر رومی سلطنت کا باج گزار بن گیا۔ پومپی نے احتراماً ہیکل کا جو خزانہ وغیرہ محفوظ رہنے دیا تھا، اُسے ایک لالچی رومی جرنیل کراسس (Crassus) نے ۵۴ ق م میں تاخت و تاراج کر دیا۔

انٹی پیٹر (Antipater) کی مصر میں رومی بادشاہ جولیس سیزر (Julius Caesar) کے لیے گراں قدر خدمات کے عوض میں ۴۷ ق م میں اُسے ملک کا نگران مقرر کر دیا گیا۔ اسی دوران میں سیزر نے ہائرکینس کو فصیل شہر کی تعمیر نو کی اجازت بھی دے دی۔ انٹی پیٹر نے اپنے بڑے بیٹے فیسلس (Phasealus) کو یروشلم کا گورنر بنایا اور چھوٹے بیٹے ہیرڈ (Herod) کو گلیلی (Galilee) کا تخت سونپ دیا۔

جولیس سیزر نے ہائرکینس کو سردار کاہن کے طور پر برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ اسے قومی حکمران کے اختیارات بھی تفویض کر دیے۔ اُس نے ہیرود کے باپ انٹی پیٹر ادومی کو اس کا وزیر اعظم اور یہودیہ کا نگران مقرر کیا۔ انٹی پیٹر کے قتل پر اُس کے بیٹوں ہیرود اور فیسلس نے ہائرکینس

کے ساتھ مل کر (ہارکینس کے بھتیجے اور ارسطوبیولس کے بیٹے) انٹی گونس (Antigonus) کا مقابلہ کیا۔ جس۔نے ایک پارتھی (Parthians) فوج کے ساتھ یروشلم پر چڑھائی کردی۔ ہیرود بچ نکلا۔

۴۰ ق م میں رومی سلطنت کی سینیٹ کے حکم سے ہیرود کو اس کے باپ کے بعد یہودیہ کے نگران کے طور پر اُس کا جانشین مقرر کردیا گیا، لیکن اسی سال پکورس (Pacorus) اور برزافارنیز (Barzapharnes) کی سربراہی میں پارتھیوں نے یروشلم پر قبضہ کرکے یہاں خوب لوٹ مار کی۔ اور انٹی گونس کو دوبارہ یروشلم کی حکومت سونپ دی۔ انتھونی نے ۳۷ ق م میں ہیرود کو یہودیہ کا حاکم مقرر کردیا۔ اس نے پانچ ماہ کے محاصرے کے بعد یروشلم کو فتح کرلیا۔ انتھونی کے حکم پر انٹی گونس کو قتل کردیا گیا۔ ہیرود نے حسمونی سرداروں کو، یہودیوں کی فقہی کونسل (Sanhedrim) کے تمام اراکین کو، اور بالآخر آخری حسمونی سردار ہارکینس کو بھی قتل کردیا۔

ہیرود کا سب سے نمایاں کارنامہ ہیکل کو نئے سرے سے اس کی اصل بنیادوں سے تعمیر کرنا تھا۔ اس کی تعمیرنو کے کام کا آغاز ۱۹ یا ۲۰ ق م میں ہوا۔ قریباً ایک ہزار خصوصی طور پر تربیت یافتہ کاہنوں کی مدد سے اس مقدس عبادت گاہ کی تعمیر ۱۰ یا ۱۱ ق م میں مکمل ہوئی۔ ہیکل سے متصل ایوان کی تعمیر ۹ ق م میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، تاہم ہیکل کی تعمیر کی حتمی تکمیل ہیرود اگرپا دوم (Herod Agrippa II) اور نگران حکمران البائینس (Albinus) کے زیرِ انتظام ۶۳ یا ۶۴ء میں ہوئی۔ ہیرود اول نے قدیمی فصیل پر چار عظیم برج بھی تعمیر کیے تھے۔ ۴ ق م میں ہنگامے شروع ہوگئے اور تھوڑے عرصے بعد ہی ہیرود اول فوت ہوگیا۔ اس کا انتقال حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کے چند مہینے بعد ہوا تھا۔ حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کی پیدائش ۱-۵ عیسوی کے دوران میں کسی وقت ہوئی تھی۔ آپ کی وفات کے متعلق فوسٹ کی لغاتِ بائبل میں درج ہے:

At the Passover A.D. 30 our Lord's crucifixion and resurrection took place.[29]

سن ۳۰ عیسوی میں عید فصح کے موقع پر ہمارے خداوند کی سولی اور قیامت کا واقع رونما ہوا تھا۔

رومی بادشاہ کیلیگولا (Caligula) نے حکم دیا کہ ہیکل میں اس کا مجسمہ تعمیر کیا جائے۔ یہود نے

اس مشرکانہ حرکت کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بالآخر اگرپا (Agrippa) کی مداخلت کے نتیجے میں کیلیگولا اپنا حکم واپس لینے پر راضی ہوگیا۔ ۴۵عیسوی میں فلسطین شدید قحط سالی کا شکار ہوگیا جو قریباً دو سال تک جاری رہا۔

رومی بادشاہ جیسیس فلورس (Gessius Florus) نے اہل یہودیہ کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے تمام شہروں کو تاخت و تاراج کرایا اور لٹیروں کو بلاخوف عقوبت تمام جرائم کی کھلی چھٹی دے دی۔ اس نے ہیکل سے بھی خزانہ لوٹنے کی کوشش کی، لیکن شہر کے بالائی حصے کی لوٹ مار کے بعد اس میں ناکام رہا۔ انانیاس (Ananias) کے جواں سال بیٹے الیعزر (Eleazer) کے زیر قیادت اہل یہودیہ کے ایک گروہ نے رومی بادشاہ کو باقاعدہ نذرانے پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا یہ انکار دراصل رومیوں کی وفاداری سے انکار کے مترادف تھا۔ اس بغاوت کے نتیجے میں رومیوں کی آخری جنگ کا آغاز ہوگیا۔ باغیوں نے اپنی مسلح بغاوت کا آغاز ہیکل اور شہر کے نشیبی علاقے سے کیا۔ انھوں نے 'شہر کے حساس اور اعصابی مراکز' یعنی حسمونی محل، سردار کاہن کی رہائش گاہ اور سرکاری دستاویزات محفوظ کرنے کی جگہ کو نذر آتش کر دیا۔ انھوں نے رومی فوجی دستوں کو قتل کر دیا اور انطونیا کو جلا دیا۔ سردار کاہن اور اس کے بھائی کی لاشیں پانی فراہم کرنے والی گزرگاہ سے ملیں۔

کیسٹیس گیلس (Cestius Gallus) شہر پر حملہ آور ہوا، لیکن اسے ہیکل کی شمالی دیوار کے قریب سے سکوپس (Scopus) کی طرف واپس ہٹنا پڑا جہاں اُسے نومبر ۶۶ء میں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ کیسٹیس گیلس کی پہلی پیش قدمی اور پسپائی نے عیسائیوں کو فرار ہونے کا موقع فراہم کیا، جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ 'جب تم یروشلم پر فوجوں کا ہجوم دیکھو تو جو لوگ بھی یہودیہ میں ہوں وہ پہاڑوں کی طرف فرار ہو جائیں' (متی ۲۴:۱۶)۔ جب تک اکتوبر یا نومبر ۶۷ء میں گستالہ (Gistala) فتح نہیں ہوگیا، ویسپیسین (Vespasian) شمالی علاقوں کو زیر نگیں کرنے میں مصروف رہا۔ لاوی کا بیٹا جون بچ کر یروشلم کی طرف فرار ہوگیا۔ اڑھائی سال بعد (۷۰ء میں)

ٹائیٹس (Titus) نے محاصرہ شروع کر دیا۔ اُس وقت پر جوش گروہ معتدل مزاج گروہ پر غالب آ چکا تھا۔ پر جوش اور انتہا پسندوں کے دو گروہ تھے: ایک گروہ جون آف جسکالہ (John of Giscala) اور الیعزر کے ماتحت تھا جو ہیکل اور انطونیا پر قابض تھا اور اس میں ۸۴۰۰ لوگ تھے۔ دوسرا گروہ شمعون برجیورس (Simon Burgioras) کی سربراہی میں برج پر متعین تھا، بالائی شہر کینا کولم (Coenaculum) سے لاطینی کونونٹ تک اور زیریں شہر کی وادی اور ہیکل کے شمال میں عکرہ اُس کے قبضے میں تھے۔ یہ دس ہزار (یہودی) افراد اور پانچ ہزار ادومیوں پر مشتمل تھا۔ اجنبی اور حجاج کی تعداد بڑھ کر چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ جوزیفس کہتا ہے کہ اس محاصرے میں دس لاکھ افراد کام آئے اور چالیس ہزار کو دیہاتی علاقوں کی طرف جانے دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد فوج کے ہاتھوں فروخت کر دی گئی۔ پوری جنگ کے دوران میں ستانوے ہزار لوگوں کو اسیر بنا لیا گیا، لیکن یہ تعداد مبالغہ آرائی پر مشتمل نظر آتی ہے۔[۳۱]

۷ ستمبر ۷۰ء کو یروشلم پر ویسپیسین (Vespasian) کے بیٹے ٹائیٹس (Titus) نامی رومی جرنیل کا قبضہ ہو گیا۔ رومی سپاہیوں نے شہر کو نذر آتش کر دیا اور تیسرے ہیکل (Herode's Temple) کا اکثر حصہ تباہ و برباد کر دیا۔ صرف ایک دیوار گریہ (Wailing Wall) کھڑی رہنے دی گئی۔ رومیوں نے یہودیوں کی کہانت اعلیٰ اور فقہی کونسل (Sanhedrin) کا خاتمہ کر دیا۔

اس وقت شہر اپنے باشندوں کی شدید باہمی آویزشوں کی وجہ سے سراسیمگی کی حالت میں تھا۔ جنگجو یہودیوں کے ایک گروہ کے سربراہ سائمن نے شہر کے بالائی اور زیریں حصوں پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا تھا، جبکہ جون آف جسکالہ نے ہیکل اور اوفیل (Ophel) کو اپنا مرکز بنا لیا۔ ادومی (Idumeans)، جو انتہا پسند یہودی گروہ (Zealots) کے پروردہ تھے، محض اپنے دفاع کے لیے برسرپیکار رہے، تاہم اہل یہود کے ایک نسبتاً کمزور گروہ نے فاتح رومی افواج کے ساتھ مفاہمت کا رویہ اپنایا۔ اگر بروقت یہی رویہ رومی جرنیل ٹائیٹس کے ساتھ روا رکھا جاتا تو غالب امکان یہی ہے کہ ٹائیٹس ایسی بربریت اور غم و غصے کا مظاہرہ نہ کرتا۔ محاصرے کی صعوبتیں اور جانی و مالی نقصانات جتنے فاتحین کے

ہاتھوں ہوئے تھے، اتنے ہی خود یہودیوں کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ تھے۔ محاصرے کے پندرھویں دن 'اگرپا' کی تعمیر کردہ تیسری دیوار پر رومی قبضہ ہو گیا۔ محاصرے کے چوبیسویں دن شہر کی دوسری دیوار بھی رومیوں کے قبضے میں آ گئی۔ بہترویں دن ہیکل سے متصل انطونیا کا قلعہ بھی یہودیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سقوطِ انطونیا کے بارھویں دن ہیکل کے دامن میں قربان گاہ پر قربانی کی رسم کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۰۵ دن بعد ہیکل اور زیریں شہر کو جلا دیا گیا اور بعد میں پورا شہر ہی نذرِ آتش کر دیا گیا۔

تمام شہر اور ہیکل مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیے گئے۔ صرف بالائی شہر کی مغربی دیوار اور ہیرودِ اعظم کے تعمیر کردہ تین عظیم برج ہی اس تباہی کے چشم دید گواہ کے طور پر قائم رہے۔ یہ تباہی صرف عمارتوں تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ شہر میں مقیم بوڑھے اور کمزور تہ تیغ کر دیے گئے۔ سترہ سال سے کم عمر کے بچے غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے۔ باقی ماندہ افراد کو مصر کی کانوں، روم اور دیگر مقامات کی تماشا گاہوں میں خوں خوار جانوروں سے لڑائی کے تماشے کا حصہ بننے کے لیے بھیج دیا گیا۔ رومی افواج کی مشہور زمانہ دسویں لجن (10th Legion) نے شہر کو اس انداز سے کھود کر ہموار کر دیا اور اس طرح اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا کہ یروشلم آنے والا کوئی شخص یہ باور نہ کر پاتا تھا کہ یہ شہر کبھی آباد بھی رہا ہوگا۔ شہنشاہ ہیڈرین (Hadrian) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق اس شہر کے بچے کھچے کھنڈروں کو بھی بالکل مسمار کر دیا[۲۲] اور ہیکل کی بنیادوں کو کھدوا کر اس کا نام و نشان ہی مٹا دیا۔

اس تباہی کے ساٹھ سال بعد تک یروشلم شہرِ خموشاں کا منظر پیش کرتا رہا۔ یہاں محافظ فوج تو بھیجی جاتی رہی، البتہ اس کی تعمیرِ نو پر بالکل توجہ نہ دی گئی۔ ۱۳۰ء میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے یہاں کا دورہ کیا اور اسے صرف چند ہی عمارتیں کھڑی نظر آئیں۔ دو سال بعد (۱۳۲ء–۱۳۵ء) یہودیوں کی آخری اور عظیم بغاوت برپا ہوئی۔ اس بغاوت کا روحِ رواں بارکوکبہ (Bar Kokeba) تھا جسے مشہور مذہبی پیشوا ربی عقیبہ (Rabbi Akiba) کی سرپرستی حاصل تھی، تاہم یہ بغاوت بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی اور رومی جرنیل جولیس سیویرس (Julius Severus) کے ہاتھوں یہود کی آزادی کی آخری کوشش کے خاتمے کے ساتھ ہی یہودیت کے باقی ماندہ آثار بھی مٹ گئے، بلکہ

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ٹی۔ اینیس روفس (T. Annius Rufus) نے ہیکل کے مقام پر ہل چلا کر اسے برابر کردیا۔ بعدازاں ہیکل کے مقام پر زحل (Jupitar) دیوتا سے منسوب ایک قربان گاہ تعمیر کردی گئی اور یہودیوں کو اس شہر سے بے دخل کردیا گیا۔

۱۳۸ء میں ہیڈرین نے شہر کو ازسرِنو تعمیر کیا اور شہر کا نام یروشلم کے بجاے ایلیا کیپیٹولینا (Aelia Capitolina) رکھا۔ ہیکل کے قدس الاقداس (Holy of Holies) کی جگہ پر ہیڈرین کا گھوڑے پر سوار ایک مجسمہ ایستادہ کردیا گیا۔ یا تو بذاتِ خود ہیڈرین نے، یا انطونی حکمرانوں میں سے کسی نے، شمال مغربی پہاڑی کے مقام پر زہرہ (Venus) دیوی کا ایک معبد تعمیر کیا۔ جہاں بعد میں مشہور کلیسیاے مقدس سپلکر (Church of Holy Sepulchre) تعمیر کیا گیا۔ لگتا یہ ہے کہ ان مقدس مقامات کی زیارت کی روایت غالباً اسی دوسری صدی عیسوی میں شروع ہوئی جو اگلی دو صدیوں کے دوران میں خوب رواج پا گئی۔

'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ بائبل انسائیکلوپیڈیا' لکھتا ہے:

In 362 Julian is said to have attempted to rebuild the temple, but the work was interrpted by an explosion. The story is doubtful.[33]

ایک قول کے مطابق ۳۶۲ء میں جولین نے ہیکل کی تعمیرِ نو کی کوشش کی، لیکن ایک (ناگہانی) دھماکے کی وجہ سے (تعمیرِ نو کا) کام منقطع ہوگیا۔ یہ روایت مشکوک ہے۔

'فاسیٹس بائبل ڈکشنری' (Fausset's BD) نے ان واقعات کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

In the apostate Julian's reign the Jews at his instigation attempted with great enthusiasm to rebuild the temple; but a whirlwind and earthquake shattered the stones of the former foundation, and a fire from the temple mount consumed their tools. Ammianus Marcellinus (23:1), the emperor's friend, attests the fact. Providence baffled Julian's attempt to falsify Christ's words.[34]

جولین کی مشرکانہ حکومت میں یہودیوں نے اس کی تحریک پر نہایت جوش وخروش سے ہیکل کو تعمیر کرنے کی کوشش کی، لیکن ہوا کے ایک طاقت ور بگولے اور زلزلے نے پہلے سے موجود بنیادوں کو بھی درہم برہم کردیا۔ ہیکل کے احاطے سے بلند ہونے والی آگ نے ان کے اوزاروں کو جلا کر راکھ

کردیا۔ شہنشاہ (جولین) کا دوست امیانس مارسیلنس (Ammianus Marcellinus) ان واقعات کی تصدیق کرتا ہے۔ منشاے ایزدی نے جولین کی جانب سے مسیح کی پیشین گوئی کو جھٹلانے کی اس کوشش کو ناکام بنادیا۔

'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ بائبل انسائیکلوپیڈیا' میں مذکور ہے:

> The site of the temple itself appears to have remained in ruins down to the seventh century.[35]

لگتا یہ ہے کہ بذاتِ خود ہیکل کی جاے وقوع ساتویں صدی تک کھنڈرات کی صورت میں برقرار رہی۔

۶۱۵/۶۱۴ء میں فارس کے بادشاہ خسرو دوم (Chosroes II) نے فلسطین فتح کرلیا۔ یہ واقعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے مکی دور اور قیصرِ روم ہرقل کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآنِ مجید کی سورۂ روم میں اس واقعے کے تناظر میں ایک اہم پیشین گوئی کی گئی ہے۔ یہ معجزانہ طور پر حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اس کا تفصیلی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کے لیے ملاحظہ کیجیے مولانا وحید الدین خان، علم جدید کا چیلنج (کراچی: مجلس نشریات اسلام) ۱۹۸۴ء، صفحات ۱۹۸ - ۲۱۱؛ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور: سروسز بک کلب)، ۱۹۸۷ء، جلد ۳، صفحات ۲۴۷ - ۲۴۸ (تعارف سورۂ روم)۔ خسرو نے یروشلم کو تباہ کردیا اور ہولی سپلکر چرچ کو زمین بوس کرنے کے بعد اس میں محفوظ اُس اصل صلیب کو بھی مالِ غنیمت کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی صلیب پر سزاے موت دی گئی تھی۔ خسرو نے اس پیش قدمی میں ہزاروں مذہبی اور روحانی پیشواؤں کو قتل کیا۔ یہ تمام واقعات روم کی عیسائی سلطنت کے لیے انتہائی شرم ناک تھے۔ انھوں نے ذلت کا یہ داغ دھونے کے لیے خوب تیاری کی اور جوابی حملہ کیا۔

یروشلم پر رومیوں کے ایک مرتبہ پھر قبضے کے متعلق 'انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ بائبل انسائیکلوپیڈیا' رقم طراز ہے:

> In 629 Heracleus, (...), reached Jerusalem in triumph, bearing back the captured fragment of the cross, (...). The triumph of Christendom was but

short. Seven years earlier had occured the historic flight of Mohammad from Mecca (the Higira), and in 637 the victorious followers of the Prophet appeared in the Holy City. After a short siege, it capitulated, but the Khalif [or 'khalifah'?] Omar treated the Christians with generous mercy. The Christian sites were spared, but upon the temple-site, which up to this [time] had apparently been occupied by no important Christian building but was of peculiar sanctity to the Moslems through Mohammad's alleged visions there, a wooden mosque was erected, capable of accommodating 3,000 worshippers.[36]

۶۲۹ء میں ہرقل (...) فاتحانہ انداز سے چھینی ہوئی صلیب کا ٹکڑا اٹھائے یروشلم میں داخل ہوا۔ (...)۔ مسیحیت کی یہ فتح بہت قلیل عرصے پر محیط رہی۔ سات سال قبل ہی [حضرت] محمد [ﷺ] کی مکہ سے [مدینہ کی جانب] ہجرت کا عظیم واقعہ پیش آیا تھا۔ ۶۳۷ء میں پیغمبر کے پیروکار فاتحانہ انداز سے شہر یروشلم میں داخل ہوئے۔ ایک مختصر محاصرے کے بعد انھوں [اہل شہر] نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن خلیفہ [حضرت] عمر [رضی اللہ تعالیٰ عنہ] نے مسیحیوں کے ساتھ نہایت فراخ دلانہ رحم دلی کا سلوک کیا۔ مسیحی مقدس مقامات کو نقصان نہ پہنچایا گیا۔ ہیکل کے مقام پر اس وقت تک کوئی قابل ذکر مسیحی عمارت موجود نہ تھی، لیکن یہ مقام مسلمانوں کے لیے اس وجہ سے خصوصی تقدیس کا حامل تھا، کیونکہ اس جگہ کا [حضرت] محمد [ﷺ] کے سفرِ معراج سے تعلق مشہور تھا، اس لیے اُس جگہ لکڑی کی ایک مسجد تعمیر کی گئی، جس میں قریباً تین ہزار اشخاص عبادت کر سکتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی پیش قدمی کی بابت 'فاسیٹس بائبل ڈکشنری' میں درج ہے:

Caliph Omar (637 A.D.) took the city from the Patriarch Sophronius, who said, 'Verily, this is the abomination of desolation spoken of by Daniel the prophet, standing in the holy place.' Christians were allowed liberty of worship.[37]

(۶۳۷ء میں) [حضرت] عمرؓ (خلیفہ ثانی) نے اسقفِ اعظم سفرانیئس (Patriarch Sophronius) سے شہر کی چابی وصول کی۔ [اس موقع پر] سفرانیس نے کہا: 'یقیناً یہ وہ مذموم بے کسی ہے جس کا دانیال نبی نے اس مقدس مقام پر کھڑے ہو کر ذکر کیا تھا۔' مسیحیوں کو اپنی عبادت کی انجام دہی کی مکمل آزادی دے دی گئی۔

ڈاکٹر طارق السویدان نے فلسطین پر اپنی معروف کتاب میں اس واقعے کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

جب اسقفِ اعظم [سفرانیس] نے یہ منظر دیکھا تو وہ بہت متاثر ہوا اور [اس کے دل میں] اسلام کی عظمت کا نقش اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہم وطنوں سے کہا کہ زمین پر کوئی بھی اس قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اپنی جانوں کو نجات دلانے کے لیے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو۔ فریقین کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا۔ [حضرت] عمر نے ان کو شہر میں حفاظت اور سلامتی عطا کی۔ انھوں نے اس بات کی ضمانت دی کہ ان کی عبادت گاہیں، کلیسیا اور مقدس مقامات کو چھوا جائے گا اور نہ تباہ کیا جائے گا۔ یوں اس شہر نے اپنی تاریخ کے سب سے رحم دل فاتح [کے رحم] کا مظاہرہ دیکھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مقدس شہر کی تاریخ میں جب کسی فاتح نے یہاں غلبہ حاصل کیا، اس نے اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا اور اس کے باشندوں کو تہِ تیغ کر دیا۔[۳۸]

ڈاکٹر طارق مزید لکھتے ہیں:

اس معاہدے کے بعد مقدس شہر کے دروازے [حضرت] عمرؓ بن خطاب کے لیے کھول دیے گئے اور آپ اس میں داخل ہو گئے۔ آپ نے شہر کا دورہ کیا۔ جب آپ کلیسیائے مقدس سپلکر کے نزدیک پہنچے تو اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اسقفِ اعظم نے آپ سے کہا کہ یہیں کلیسیا ہی میں نماز ادا فرمالیں۔ [حضرت] عمرؓ نے اس سے کہا: نہیں، اگر میں نے اس جگہ نماز ادا کی تو ہو سکتا ہے کہ بعد کے زمانے میں مسلمان تم سے یہ جگہ چھین لیں۔' یہ کہہ کر آپ نے (دوسرے مقام پر) نماز ادا فرمائی۔ (....)۔ [حضرت] عمرؓ مسجد اقصیٰ کی تلاش میں شہر میں گھومتے رہے، لیکن اُسے تلاش نہ کر سکے۔ [بالآخر] آپ نے اسقفِ اعظم سے [اس کی بابت] دریافت فرمایا۔ اس نے پوچھا: 'کیا یہ وہ [مقام] تو نہیں جو یہودیوں کے لیے مقدس ہے۔' [حضرت] عمرؓ نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ آپ کو اس مقام کی جانب لے گیا۔ وہاں آپ نے دیکھا کہ مسیحیوں نے [اہلِ یہود سے نفرت کے باعث] اس مقام کو جائے غلاظت بنا رکھا ہے۔ [حضرت] عمرؓ نے اپنی آستین چڑھائی اور اس جگہ کی صفائی کرنے لگے۔ مسلمان سرداروں اور فوجی دستوں نے جب یہ دیکھا تو سب مل کر اس مقدس

مقام کی صفائی میں مصروف ہوگئے۔(...)۔ بعدازاں [حضرت] عمرؓ نے اپنا جبہ اتارا اور [اسے بچھا کر] اس پر نماز ادا کی اور اسے وہیں پڑا رہنے دیا۔ [معراج کے موقع پر] پیغمبر اسلام [محمد ﷺ] کی مسجد اقصیٰ میں نماز کے بعد وہاں کسی مسلمان کی یہ پہلی نماز تھی۔(...)۔ آلائشوں اور گندگی کے ڈھیر ہٹانے کے بعد [حضرت] عمرؓ نے اس مقام پر مسجد الاقصیٰ کی تعمیر شروع کرنے کا حکم دیا۔(...)۔[۳۹]

حضرت عمرؓ بن خطاب کے ہاتھوں یروشلم شہر کی فتح کے دو سال بعد (قریباً ۶۴۰ء میں) حضرت امیر معاویہؓ کو ملک شام اور فلسطین میں موجود اسلامی فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ انھوں نے قریباً چالیس سال اس علاقے پر حکمرانی کی، ابتدائی مرحلے میں بطور عامل (Governor) اور بعدازاں بطور خلیفہ۔ ذیل میں 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' سے بعض دیگر اہم واقعات پیش کیے جاتے ہیں:

During the long rule of Mu'awiya, the Muslim place of worship on the Temple area, approximately described by Bishop Arculfus in ca. 680 must have taken shape. (...) Mu'awiya built the Muslim sanctuary there "after 'Umar". It stands also to reason that the plan for erection of the Dome of the Rock, which needed immense preparations, was made during the protracted and orderly rule of Mu'awiya. The inscription in the dome bears the year 72/691-2, but the beginning of 'Abd al-Malik reign (65-86/685-705) was extremely turbulent. 'Abd al-Malik had good reasons to make efforts towards the completion of the building, which would show him as the great champion of Islam, but the early years of his caliphate were hardly suited for both conceiving such an enormous undertaking and carrying it out to its very end during a comparatively short period. Contrari-wise Mu'awiya is known also by his extensive buying and building activities in Mecca, in which he was not followed by later Umayyads. (....).

The real urge for the erection of the Dome of the Rock on the site where it stands and in the form which it has, was religious, in addition, of course, to the natural acculturation of the Arabs to an environment, where magnificent edifices were the eloquent witnesses of a triumphant Church and of great rulers. (....).

The end of Umayyad rule was for Jerusalem (ca. 750 AD), (...), a period of great tribulations. In the wake of a rebellion against the last Umayyad Marwan II, the walls of Jerusalem were pulled down and its inhabitants punished. Earthquakes aggravated the situation.[40]

احاطۂ ہیکل میں مسلمانوں کی عبادت گاہ کا حتمی تعین، جیسا کہ بشپ آرکلفس (Bishop Arculfus)

نے قریباً ۶۸۰ء کے دوران میں اندازاً بیان کیا ہے، [حضرت] معاویہ کے طویل دورِ حکمرانی میں ہو گیا تھا۔ (...)۔ [حضرت] معاویہ نے [حضرت] عمر کے تتبع میں وہاں مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہ تعمیر کی۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ قبۃ الصخریٰ، جس کی تعمیر کا منصوبہ طویل توجہ اور تیاری کا متقاضی تھا، [حضرت] معاویہ کے طویل اور منظم دورِ حکمرانی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔ قبہ میں موجود ایک کتبے پر سال [تعمیر] ۷۲ھ/۶۹۱ء-۶۹۲ء درج ہے۔ عبدالملک کا عرصۂ حکمرانی (۶۵ھ-۸۶ھ/۶۸۵ء-۷۰۵ء) بہت پر آشوب تھا۔ عبدالملک کے لیے خود کو اسلام کا عظیم ہیرو ثابت کرنے کے لیے یہ بہت اہم موقع تھا کہ وہ اس عمارت کی تکمیل کے لیے پوری کوشش کرے، لیکن اس کی خلافت کے ابتدائی سال اس بات کے لیے قطعاً سازگار نہ تھے کہ وہ نسبتاً ایک تھوڑے وقت میں ایسی عظیم ذمہ داری کے متعلق سوچے اور اُس پر عمل درآمد کر کے اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ اس کے برعکس [حضرت] معاویہ مکہ میں تعمیری اشیا کی بڑی مقدار میں خریداری اور تعمیراتی سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ اس معاملے میں بعد کے اموی خلیفہ ان کی پیروی نہ کر سکے۔ (...)۔

قبۃ الصخریٰ جس حالت میں اور جس مقام پر تعمیر ہوا، اس کی بنیاد میں مذہبی داعیہ موجود تھا۔ مزید براں یہ یقیناً اس ماحول میں عربوں کے تہذیبی نفوذ کے لیے ایک اہم کاوش تھی جہاں [مسیحیوں کے] عظیم حکمرانوں اور ایک فاتح کلیسیا کی کامیابیوں کی شہادت کے طور پر بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں قائم تھیں۔ (....)۔

یروشلم کے لیے اموی خلافت کے آخری ایام [قریباً ۷۵۰ء] بڑے پر آشوب تھے۔ آخری اموی حکمران مروان ثانی کے خلاف بغاوت کے آغاز میں یروشلم کی فصیلیں مسمار کر دی گئیں اور اس کے باشندوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ زلزلوں نے اس صورت حال کو مزید ناگفتہ بہ بنا دیا تھا۔

ڈاکٹر طارق السویدان لکھتے ہیں:

عبدالملک بن مروان نے مسجد اقصیٰ کی مکمل تعمیر کا آغاز کیا اور قبۃ الصخریٰ نامی ایک عظیم عمارت بنوائی۔ (....)، لیکن عبدالملک اس عمارت کی تکمیل سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے الولید نے اسے مکمل کیا۔[41]

مسجدِ عمر اَب بھی مسجدِ اقصیٰ کے جنوب مشرقی کونے پر واقع ہے۔ سلیمان بن عبدالملک نے، جبکہ وہ ابھی ولی عہدِ سلطنت ہی تھا، صوبہ فلسطین کے دارالحکومت کے طور پر رملہ[42] کی تعمیر شروع کرا دی تھی۔

اموی دور کے خاتمے کے بعد ۷۵۰ء سے ۹۶۹ء تک یروشلم پر عباسی خاندان کی حکومت قائم رہی۔ ۸۷۰ء میں بطریق تھیودوسیس (Patriarch Theodosius) نے اس بات پر مسلمانوں کی تعریف کی کہ انھوں نے مسیحیوں کو کلیسیا تعمیر کرنے اور بغیر کسی ظلم و تشدد کے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دی تھی۔

۹۶۹ء سے ۱۰۹۹ء تک یروشلم فاطمیوں، ترکمانوں اور سلجوقیوں کے زیر اقتدار رہا۔ فوسٹ اپنی لغت میں لکھتا ہے:

The crusaders [laid siege on June 6, and] took Jerusalem in A.D. 1099, July 15th, and it remained in Christian possession 88 years, [until] Saladin retook it in 1187.[43]

صلیبی جنگجوؤں نے [۶/ جون کو شہر کا محاصرہ کیا] اور ۱۵/ جولائی ۱۰۹۹ء میں یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اور مسیحیوں کا یہ قبضہ ۸۸ سال تک برقرار رہا [حتیٰ کہ] صلاح الدین نے اسے ۱۱۸۷ء میں دوبارہ واگزار کرایا۔

'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' میں بیان کیا گیا ہے:

The massacre of the Muslims and the Jews in the town was perpetrated out of military and religious considerations alike. (....). There was a gruesome bloodbath, no doubt. (...). Jerusalem became a Christian city, where no Muslim or Jewish cult was permitted and no non-Christian could take residence permanently. The mosques were turned into churches or used as secular buildings. The newly-founded kingdom was appropriately called the kingdom of Jerusalem, since the conversion of the Holy City into a Christian sanctuary had been the purpose of its erection. (...). Jerusalem remained closed to Muslims and Jews, but, in the course of time, they were permitted to come there for business and prayer. (...).

After the decisive victory of Hattin (July 1187), Saladin advanced towards Jerusalem and laid siege on the city. After prolonged negotiations,

in which the defenders threatened to kill the Muslim prisoners and all non-combatants, to burn all the valuables and to destroy the buildings on the Haram al-Sharif, an agreement was reached in November 1187, which permitted the inhabitants to ransom themselves after surrender. Only the Eastern Christians remained, and Jerusalem soon assumed the character of a predominantly Muslim city. (....). The influx of Learned Jews from France attested for the period ca. 1210-15 in both literary texts and Geniza letters proves that Ayyubid rule at that time must have had a reputation of an orderly government able to guarantee the safety of foreigners. (...). The Khwarazmians over-ran Syria and Palestine, took Jerusalem in August 1244 and plundered and murdered in the town, desecrating the Holy Sepulchre and other churches.[44]

شہر میں مسلمانوں اور یہودیوں کے قتل عام کے پیچھے مذہبی اور دفاعی تحفظات یکساں طور پر کارفرما تھے۔(....)۔ بلاشبہ ہولناک خون ریزی کا بازار گرم کیا گیا۔(...)۔ یروشلم [اس تباہی کے نتیجے میں مکمل طور پر] مسیحی شہر بن گیا۔ یہاں کسی مسلمان یا یہودی کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی اجازت نہ تھی اور کوئی بھی غیر مسیحی وہاں مستقل رہائش اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ مساجد کو کلیساؤں میں تبدیل کر دیا گیا۔ انھیں دنیاوی ضرورت کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ یہ نئی قائم شدہ [مسیحی] بادشاہت بجا طور پر سلطنت یروشلم کہلائی جانے لگی، کیونکہ اس سلطنت کے قیام کا اصل مقصد ہی اس مقدس شہر کو مسیحی مقدس مقام میں تبدیل کرنا تھا۔(...)۔ [جو شہر یہودیوں اور مسلمانوں ہی کا شہر تھا] اب اس میں یہودیوں اور مسلمانوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں یہاں صرف عبادت اور کاروبار کی غرض سے آنے کی اجازت دے دی گئی۔(...)۔

(جولائی ۱۱۸۷ء میں) حطین کی فیصلہ کن فتح کے بعد صلاح الدین ایوبی نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ طویل گفت و شنید کے بعد نومبر ۱۱۸۷ء میں ایک معاہدہ طے پایا جس میں وہاں کے باشندوں کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے بعد معاوضہ دے کر اپنے آپ کو آزاد کرا لیں۔ اس گفت و شنید میں زیر محاصرہ مسیحیوں نے مسلمان قیدیوں اور تمام غیر محاربین کو قتل کرنے، تمام قیمتی اشیا کو نذر آتش کرنے اور حرم الشریف کی تمام عمارتوں کو تباہ و برباد کرنے کی دھمکی دی تھی۔ صرف مشرقی مسیحی ہی شہر میں باقی رہ گئے اور یروشلم نے جلد ہی غالب طور پر ایک مسلمان شہر کی حیثیت اختیار کر لی۔(...)۔ فرانس سے آنے والے بکثرت یہودی علما نے اس

بات کی تصدیق کی ہے کہ قریباً ۱۲۱۰ء-۱۲۱۵ء کے بارے میں ادبی متون اور جنیزہ (Geniza) کے خطوط دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس دور کی ایوبی حکمرانی کی شہرت ایک منظم سلطنت کی تھی جو غیر ملکیوں کے تحفظ کی ضمانت دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔ (...)۔ خوارزمیوں نے فلسطین اور شام کو تاخت وتاراج کیا، اگست ۱۲۴۴ء میں یروشلم پر قبضہ کر لیا، شہر میں لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم کیا، کلیسیائے مقدس سپلکر اور دوسرے کلیسیاؤں کی بے حرمتی کی۔

ممالیک کے دور (۱۲۵۰ء-۱۵۱۶ء) کے آغاز میں یروشلم زیادہ تر ویران اور کھنڈر تھا۔ ممالیک نے شہر کی تعمیر نو کی ذمہ داری سنبھالی۔ ان دنوں میں اس شہر میں مقدس صوفیوں کا بسیرا تھا۔ یروشلم پر ۱۵۱۶ء سے ۱۸۳۱ء تک عثمانی ترکوں کی حکومت رہی۔ 'فوسٹ بائبل ڈکشنری' میں اس کا خلاصہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

In a dismantled state it was ceded to the Christians [or Muslims?] by the treaty with the emperor Frederick II, in 1219, and has ever since remained in the Mahometans' hands. From the first siege by the children of Judah (Judges 1:8), 1400 B.C., to A.D. 1244 Jerusalem underwent 27 sieges, the last being by the Kharesmian hordes who slaughtered the priests and monks. There was the city before David, the second that of Solomon 1000 to 597 B.C., the third city that of Nehemiah which lasted for 300 years. A Grecised city under Herod (the fourth city) succeeded. This city, destroyed by Titus A.D. 70, was followed by a Roman city, the fifth, which lasted until the Mahometan time, the sixth city. Then followed the Christian city of Godfrey and the Baldwins, the seventh; lastly the eighth, the modern city of 600 years of Moslem rule. The Ottoman Suleiman in 1542 built the present walls. After a brief possession by the [Ibrahim] Pasha of Egypt from 1832 to 1840, Jerusalem was restored to the Sultan of Turkey, in whose hands it continues.[45]

۱۲۱۹ء میں شاہ فریڈرک دوم (Frederic II) کے ساتھ ایک معاہدے کے ذریعے سے یہ شہر برباد شدہ حالت میں مسیحیوں نے مسلمانوں کے سپرد کیا۔ اُس کے بعد سے یہ شہر ہمیشہ مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ یہودہ کی نسل کے ہاتھوں پہلے محاصرے (قضاۃ ۱:۸) کے بعد سے، یعنی ۱۴۰۰ ق م سے ۱۲۴۴ء تک، یروشلم کا ۲۷ مرتبہ محاصرہ کیا گیا جن میں سے آخری محاصرہ وہ تھا جو خوارزمی افواج نے کیا تھا، جنھوں نے مسیحی کاہنوں اور راہبوں کو خوب تہ تیغ کیا تھا۔ پہلا شہر داؤد سے پہلے کا تھا۔

دوسرا شہر [حضرت] سلیمان (۱۰۰۰-۵۹۷ ق م) کے دور والا تھا۔ تیسرا شہر [حضرت] نحمیاہ والا تھا جو ۳۰۰ سال تک باقی رہا۔ اس کے بعد چوتھا شہر آیا جو ہیرود کے زیرِ اقتدار یونانی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ یہ شہر ٹائیٹس نے ۷۰ء میں تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے بعد پانچواں شہر رومیوں کا تھا جو مسلمانوں کے دورِ اقتدار تک باقی رہا، جو چھٹا شہر ہے۔ پھر اس کے بعد ساتواں شہر گوڈ فرے (Godfrey) اور بالڈوینوں (Baldwins) کا مسیحی شہر تھا۔ آخری اور آٹھواں جدید شہر ہے، جو ۶۰۰ سال سے مسلم حکمرانی کے زیرِ تسلط ہے۔ عثمانی شہنشاہ سلیمان [ذیشان] نے ۱۵۴۲ء میں موجودہ فصیل تعمیر کی۔ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۰ء تک مصر کے ابراہیم پاشا کے مختصر سے تسلط کے بعد یروشلم دوبارہ ترکی سلطان کے زیرِ اقتدار چلا گیا اور اب تک یہ [عثمانی] ترکوں ہی کے قبضے میں ہے۔

۱۸۶۵ء میں یروشلم کا تار (ٹیلی گراف) کے ذریعے سے بیرونی دنیا سے رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ ۱۸۶۸ء میں یروشلم اور یافہ کے درمیان پہلی سڑک پایۂ تکمیل کو پہنچی جو پہیوں والی گاڑیوں کے لیے قابلِ استعمال تھی۔ اس کے بعد ۱۸۹۲ء میں ریلوے لائن بھی بن گئی۔

۱۱ دسمبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی جرنیل ایلن بائی (Allenby) یروشلم میں داخل ہوا۔ یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو برطانوی فوج کی ملٹری حکومت کی جگہ سول ایڈمنسٹریشن نے لے لی۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق شہر کی آبادی ۹۰۵۰۳ نفوس پر مشتمل تھی، جن میں سے ۵۱۲۲۲ یہودی تھے، ۱۹۸۹۴ مسلمان تھے اور ۱۹۳۳۵ مسیحی تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کی ابتدا تک یہ آبادی قریباً ڈیڑھ لاکھ نفوس تک پہنچ گئی۔ میونسپل کارپوریشن کا میئر ہمیشہ مسلمانوں میں سے مقرر کیا جاتا تھا۔[۴۶]

اپریل ۱۹۲۰ء میں یروشلم میں یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان پہلا خونی تصادم رونما ہوا جس میں بہت سے لوگ مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ نئے برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سموئیل (Sir Herbert Samuel) نے الحاج امین الحسینی کو یروشلم کا مفتی مقرر کیا۔ ۱۹۲۱ء میں انھیں حکومت کی بنائی ہوئی مسلم سپریم کونسل کا سربراہ چن لیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء میں یروشلم کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس طلب کی۔ اسی سال مولانا محمد علی جوہر کو حرم شریف کی حدود میں دفن کیا گیا۔ ۱۹۳۳ء

اور اس کے بعد میں رونما ہونے والی یہودی پناہ گزینوں کی اجتماعی ہجرت کے نتیجے میں یہودیوں اور عربوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔

آج کل یروشلم اسرائیل کی اُس جدید ریاست کا دارالحکومت ہے جو ۱۴رمئی ۱۹۴۸ء کو بطور ایک یہودی ریاست کے اُس سرزمین پر قائم ہوئی تھی جسے پہلی جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز نے برطانوی حکومت کے کنٹرول میں دیا تھا۔

'انسائیکلوپیڈیا امریکانا' نے یروشلم کی تاریخ کے اس مرحلے کے حالات جامع انداز میں اس طرح بیان کیے ہیں:

In the 19th century, Jerusalem and the rest of Palestine, then part of the Ottoman Empire, became the focus of international concern. For several centuries European countries had had political and commercial interests in Palestine because of its position at the crossroads to India and the Far East. Several of these countries had attempted to expand their influence there from the 16th century on by extending their protection and patronage over the Christian Holy Places and the Christian subjects of the Ottomans. They also sought certain privileges within the empire. It was such privileges that the Ottomans had granted to the French and the Russians that the British, Austrians, Prussians, and Italians attempted to have set aside in their favor in the 19th century.

The Ottoman Turks were defeated in World War I and evicted from Palestine by the British, to whom the League of Nations awarded the Palestine mandate. The mandate period witnessed an immense struggle between Arab and Jewish nationslist movements for control of Palestine, with Jerusalem as the chief prize and heart of the conflict. (...).

By the end of World War II the British had despaired of unreveling the tangled issue, and it was turned over to United Nations. A UN resolution of November 29, 1947, recommended the partition of the country between Arabs and Jews and the internationalization of Jerusalem. The Palestinian Arabs and the Arab states rejected the plan. The day after its adoption a general attack was launched against the Jews throughout the area. As a result of the ensuing war, Jerusalem was divided by an armistice agreement in 1949 between Jordan and Israel, with the Old (Walled) City and East Jerusalem under Jordanian control and West Jerusalem (the New City) under Israeli rule.

Jordan ruled East Jerusalem for 19 years, until 1967. On June 5, 1967, after war broke out between Israel and Egypt, Jordan's King Hussein opened hostilities in the Jerusalem sector. The Israeli Army conquered and occupied East Jerusalem on June 7, and on June 27 the city was annexed to the state of Israel.[47]

انیسویں صدی میں یروشلم اور بقیہ فلسطین جو اُس وقت عثمانی سلطنت کا حصہ تھا، بین الاقوامی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ کئی صدیوں تک یورپی ممالک کے فلسطین کے ساتھ سیاسی اور تجارتی مفادات وابستہ رہے تھے، کیونکہ یہ انڈیا اور مشرقِ بعید کے چوراہے پر واقع تھا۔ سولھویں صدی سے لگاتار ان میں سے اکثر ممالک اس بات کی کوشش میں تھے کہ مسیحی مقدس مقامات اور عثمانیوں کی مسیحی رعایا کے تحفظ اور سرپرستی کے بہانے اپنا اثر و رسوخ وہاں تک پھیلا لیں۔ انھوں نے سلطنتِ عثمانی میں بعض خصوصی مراعات بھی حاصل کر لی تھیں۔ یہ اُسی طرح کی خصوصی مراعات تھیں جو عثمانیوں نے فرانسیسیوں اور روسیوں کو عطا کی تھیں۔ انیسویں صدی میں برطانیہ، آسٹریا، پرشیا اور اٹلی والوں نے کوشش کی کہ یہ مراعات فرانس اور روس والوں کے بجائے انھیں عطا کی جائیں۔

جنگِ عظیم اول میں عثمانی ترکوں نے شکست کھائی اور برطانیہ نے انھیں فلسطین سے بے دخل کر دیا۔ لیگ آف نیشنز نے برطانیہ کو فلسطین کا مینڈیٹ عطا کیا۔ مینڈیٹ کے زمانے کے دوران میں عرب اور یہودی قومی تحریکوں کے درمیان فلسطین کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے شدید کشمکش جاری رہی۔ اس کشمکش کا مرکز و محور یروشلم پر تسلط حاصل کرنا تھا۔ (...)۔

دوسری جنگِ عظیم کے اختتام تک برطانیہ اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا، اس لیے اِسے اقوامِ متحدہ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ ۲۹ رنومبر ۱۹۴۷ء کو اقوامِ متحدہ کی ایک قرارداد میں سفارش کی گئی کہ ملک کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے اور یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دے دیا جائے۔ فلسطینی عربوں اور عرب ریاستوں نے یہ منصوبہ مسترد کر دیا۔ اس قرارداد کے پاس ہونے کے ایک دن بعد ہی یہودیوں کے خلاف پورے علاقے میں ایک عمومی حملہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد جو جنگ برپا ہوئی، اُس کے نتیجے میں ۱۹۴۹ء میں اردن اور اسرائیل کے درمیان ایک معاہدۂ صلح کے ذریعے سے یروشلم کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ فصیل کے اندر والا پرانا شہر اور مشرقی یروشلم اردن کے کنٹرول میں دے دیا گیا اور مغربی یروشلم (نیا شہر) اسرائیل کی حکمرانی میں چلا گیا۔

اردن نے ۱۹۶۷ء تک پورے انیس سال مشرقی یروشلم پر حکومت کی۔ ۵ رجون ۱۹۶۷ء کو جب اسرائیل اور مصر کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو اردن کے شاہ حسین نے بھی یروشلم سیکٹر میں جنگی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ ۷ رجون کو اسرائیلی فوج نے مشرقی یروشلم کو فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور ۲۷ رجون کو یہ شہر اسرائیلی ریاست میں ضم کر دیا گیا۔

'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' بیان کرتا ہے:

The Peel Royal Commission, sent out in 1936 to investigate the situation, for the first time recommended the creation of an Arab and a Jewish state and the conversion of Jerusalem, together with Bethlehem, into a separate unit remaining under British mandate. But neither this nor any other of the subsequent attempts of the mandatory government to find a solution led to results. On 29 November 1947, the General Assembly of the United Nations adopted Resolution 189 (II) calling for the division of Palestine into two states, but united by economic union. Jerusalem was to be "internationalized".

Immediately after this decision the country was in flames. Jerusalem in particular suffered great losses in life and property even before 15 May 1948, the official end of the British mandate. (….). The ceasefire divided Jerusalem by a line slightly west of the western wall of the old city. (….). On 13 Dec. 1948 the Transjordonian parliament resolved the annexation of the areas of Palestine occupied by the Arab Legion. Israel followed suit by transferring its parliament from Tel Aviv to Jerusalem in Feb. 1949 and proclaiming Jerusalem its capital on 13 Dec. 1949. Both actions were in contradiction of the UN resolution of Nov. 1947, which had foreseen Jerusalem as a corpus separatum. The matter came up repeatedly in the UN until 1952, when it was left dormant, until the war of 1967 created an entirely new situation.[48]

پیل رائل کمیشن (Peel Royal Commission) نے، جو ۱۹۳۶ء میں صورتِ حال کی تفتیش کے لیے بھیجا گیا تھا، پہلی دفعہ یہ سفارش کی تھی کہ عربوں اور یہودیوں کی الگ الگ ریاستیں قائم کر کے یروشلم بشمول بیت اللحم کو برطانوی انتداب میں برقرار رکھتے ہوئے ایک الگ یونٹ بنا دیا جائے، لیکن برطانیہ کی انتدابی حکومت کی نہ تو یہ اور نہ بعد میں کی جانے والی کوئی دوسری کوشش نتیجہ خیز ثابت ہو سکی۔ ۲۹ رنومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد نمبر ۱۸۹ (II) منظور کی، جس میں

کہا گیا کہ فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے، لیکن معاشی یونین کے طور پر متحد رکھا جائے۔ (البتہ) یروشلم کو بین الاقوامی تحویل میں دیا جانا تھا۔

اس فیصلے کے فوری بعد ملک میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ بالخصوص یروشلم نے ۱۵ رمئی ۱۹۴۸ء کے سرکاری طور پر برطانوی انتداب کے خاتمے سے بھی پہلے بڑے جانی اور مالی نقصانات برداشت کیے۔ (....)۔ جنگ بندی میں یروشلم کو پرانے شہر کی مغربی دیوار سے ذرا مغرب میں کھینچی گئی ایک لائن کے ذریعے سے (دو حصوں میں) تقسیم کر دیا گیا۔ (....)۔ ۱۳ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو شرق اردن کی پارلیمنٹ نے ایک قرارداد کے ذریعے فلسطین کے ان علاقوں کا اپنے ساتھ الحاق کر لیا جن پر عرب لجن (فوج) نے قبضہ کیا تھا۔ اسرائیل نے بھی اسی طرح کی روش اختیار کی اور فروری ۱۹۴۹ء میں اپنی پارلیمنٹ تل ابیب سے یروشلم منتقل کر دی اور ۱۳ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو یروشلم کے اسرائیل کا دارالحکومت قرار دیے جانے کا اعلان کر دیا۔ یہ دونوں اقدام اقوام متحدہ کے نومبر ۱۹۴۷ء والی قرارداد کے خلاف تھے، جس کے مطابق یروشلم کو ایک الگ وجود قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۵۲ء تک یہ معاملہ اقوام متحدہ میں بار بار زیر بحث آیا، جس کے بعد یہ زیر التوا ہی رہا حتی کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ نے مکمل طور پر ایک نئی صورت حال پیدا کر دی۔

ابا عبان اسرائیل کے وزیر خارجہ رہے ہیں انھوں نے 'میرٹ اسٹوڈنٹس انسائیکلو پیڈیا' کے ۱۹۷۳ء کے سال نامے میں یروشلم پر ایک خوب مصور مضمون لکھا ہے۔ اس عالمانہ مضمون کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

.Yet none of this would have brought Jerusalem into the war had King Hussein heeded a message from Israeli Prime Minister Levi Eshkol on June 5, 1967. Fighting had broken out with Egypt as a result of President Gamal Abdel Nasser's blockade of the Straits of Tiran on May 22 and his intimidatory troop concentrations accompanied by threats to destroy Israel. Eshkol's message, conveyed through the United Nations chief of staff, General Odd Bull, said plainly that if Jordan kept out of the war, Israel would leave every-thing as it was. The reply was an all-out Jordonian assault on western Jerusalem. Indeed, the fighting in Jerusalem was the fiercest of that in any sector-and it took a heavy toll of Israeli lives. On June 5, Israel hastily improvised troop convoys for the Jerusalem front. By June 7 the laconic[49] message of the brigade commander ('The Temple Mount is ours') conveyed the momentous news that Jerusalem was united. It had

known many masters. Now, after 19 centuries, its original builders were back again. Soon the barriers were down-the barbed-wire fences, the tank traps, the Mandelbaum Gate, all the symptoms of ghetto-like separation-and Jews, Muslims, and Christians, with multitudes of pilgrims from all over the world, swarmed together, mingling, jostling, sometimes colliding, but always together in a single human destiny. Requests from United Nations organs that they get themselves divided again-back to their respective cages and compartments-evoked their good-humoured derision.[50]

پھر بھی اگر شاہ حسین نے اسرائیلی وزیر اعظم لاوی اشکول (Levi Eshkol) کے ۵رجون ۱۹۶۷ء کے پیغام کو اہمیت دی ہوتی تو ان میں سے کسی بات کی وجہ سے یروشلم میں جنگ برپا نہ ہوتی۔ صدر جمال عبدالناصر کے ۲۲رمئی کو آبنائے طیران کی ناکہ بندی کرنے اور اسرائیل کو تباہ و برباد کرنے کی دھمکیوں کے ساتھ مرعوب کرنے کے لیے افواج کی صف بندی کے نتیجے میں مصر کے ساتھ جنگ شروع ہوگئی۔ اقوام متحدہ کے چیف آف سٹاف جنرل اوڈ بل (Odd Bull) کے ذریعے سے پہنچائے گئے اشکول کے پیغام میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ اگر اردن جنگ سے باہر رہا تو اسرائیل ہر چیز کو اُسی حالت میں رکھے گا، جیسی یہ پہلے تھی۔ اس کے جواب میں اردن نے مغربی یروشلم پر ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یروشلم کی یہ جنگ کسی بھی سیکٹر سے زیادہ شدید تھی اور اس کی وجہ سے اسرائیل کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا تھا۔ ۵رجون کو اسرائیل نے جلدی سے یروشلم کے محاذ کے لیے فوجی دستے ترتیب دیے۔ ۷رجون تک بریگیڈ کمانڈر نے یہ عظیم اور یادگاری خبر (ہیکل کی پہاڑی اب ہماری ہے) پہنچائی کہ یروشلم اب متحد ہو گیا ہے۔ اس نے اب تک بہت سے مالک دیکھے تھے۔ انیس صدیوں کے بعد اب اس کے اصل معمار ایک بار پھر واپس آ گئے تھے۔ جلد ہی تمام رکاوٹیں — خاردار تاروں کے جنگلے، بارودی سرنگیں، منڈل بام گیٹ، غرض یہودیوں کی الگ بستیوں جیسی تمام علامات — ہٹا دی گئی تھیں۔ پوری دنیا کے یہودی، مسلمان اور عیسائی زائرین جوق در جوق اکٹھے ہوتے، ملتے جلتے، دھکم پیل کرتے، بلکہ بعض اوقات تو متصادم ہوتے نظر آتے تھے، لیکن ہمیشہ ایک متحدہ انسانی مقصد کی تکمیل کے لیے مصروف تھے۔ اقوام متحدہ کے اداروں کی طرف سے یہ درخواست، کہ وہ پھر الگ الگ ہو جائیں اور اپنے اپنے پنجروں اور حجروں میں پھر سے جا کر بند ہو جائیں، اُن کی حس مزاح کو تو دعوت دے رہی تھی، لیکن وہ اُس کا منہ چڑانے اور تمسخر اڑانے کے علاوہ کوئی

جواب نہ دے سکتے تھے۔

ابا عبان اپنے فاضلانہ مقالے کا اختتام اس عبارت کے ساتھ کرتے ہیں:

Jerusalem's population distribution (218,300 Jews, 62,300 Muslims, and 11,100 Christians) cannot fail to be determinant in its political status. But on a deeper and higher level of history, Jerusalem represents the confluence of many streams of memory and culture. Its sun has risen and set on a multitude of human longings, passions, agonies, and hopes. It is the capital of one nation and yet also the touchstone of the entire human condition.[51]

یروشلم کی آبادی کی تقسیم (دو لاکھ اٹھارہ ہزار تین سو یہودی، باسٹھ ہزار تین سو مسلمان اور گیارہ ہزار ایک سو عیسائی) اس کے سیاسی مستقبل کی حیثیت کے تعین میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، لیکن تاریخ کی اعلیٰ اور گہری سطح پر دیکھا جائے تو یروشلم ثقافت اور روایات کی بہت سی ندیوں کے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا سورج رنگارنگ انسانی امنگوں، جذبوں، دکھوں اور امیدوں پر طلوع وغروب ہوتا رہا ہے۔ یہ اگرچہ دارالحکومت تو ایک ہی قوم کا ہے، تاہم پورے عالمِ انسانیت کے احوال کی جانچ پرکھ کے لیے ایک کسوٹی کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

'دی جیوئش انسائیکلوپیڈیا' (۷: ۱۴۶، ۱۴۸) سے یروشلم کی سال بہ سال تاریخ کی ایک بعینہٖ جھلک درج ذیل ہے۔ وہاں درج ہے:

یہ سال بہ سال تاریخی چارٹ اُن زیادہ اہم واقعات کی ایک فہرست فراہم کرتا ہے جن کا یروشلم کے یہودیوں کی تاریخ سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق ہے:

B.C.

1500. Earliest historical mention of Jerusalem, found in the El-Amarna tablets.

1048. David takes possession of Jerusalem from the Jebusites.

1007. Solomon's Temple completed after seven years' labor [It may be ca. 955]

972. Shishak of Egypt takes the city from Rehoboam.

722. The fall of Samaria at the hands of Assyrians.

713. Sennacherib advances toward Jerusalem.

700. Hezekiah perfects the water-supply.

586. (Ab 9.) [Jerosalem] Captured by Nebuzar-adan [Nebuchadnezzer].

516. Rebuilt during reign of Darius.

350. Seized by the Persians.

332. Visited by Alexander the Great?

320 or 305. Seized by Ptolemy Soter.

170. Plundered by Antiochus Epiphanes.

165. Judas Maccabeus recaptures Jerusalem and reconsecrates the Temple.

166. Pompey enters Jerusalem.

37. Besieged and taken by Herod the Great.

20. Restoration of the Temple begun by Herod the Great.

C.E.

29. (April.) Jesus of Nazareth executed at Jerusalem.

70. (Nisan 14.) Siege commenced by Vespasian, lasting 134 days.

70. (Ab 9.) Jerusalem destroyed by Titus.

135. Hadrian rebuilds the city.

136. Jerusalem called Ælia Capitolina.

362. Restoration of the Temple undertaken by Julian the Apostate.

614. Jews aid the Persian Chosroes II. in attack on Jerusalem.

628. Retaken by Heraclius; Jews forbidden to enter the city.

637. Omar puts Jerusalem under Moslem power.

688. 'Abd al-Malik builds the Dome of the Rock.

1046. Solomon ben Judah head of the yeshibah at Jerusalem.

1077. Seljuk Turks capture Jerusalem.

1099. (July 15.) Crusaders put 70,000 infidels to the sword, and found a new Christian kingdom.

1100. "Assize of Jerusalem" established by Godfrey of Bouillon.

1140. Judah ha-Levi visits Jerusalem.

1173. Benjamin of Tudela visits Jerusalem.

1187. (Oct. 2.) Saladin defeats the Franks and takes Jerusalem.

1211. Several hundred English and French rabbis settle in Jerusalem.

1218. Al-Harizi visits Jerusalem.

1267. (Aug. 12.) Nahmanides visits Jerusalem.

1437. Elijah of Ferrara made chief rabbi.

1492. Jews expelled from Spain settle in Jerusalem.

1517. Capture by Ottoman Turks.

1580. Nahmanides synagogue closed by the Moslems, claiming that it had previously been a mosque.

1621. Isaiah Horowitz and a number of his friends settle in Jerusalem.

1627. Ibn Farukh, governor of Jerusalem and persecutor of the Jews, deposed.

1705. Jews subjected to certain vexatious restrictions in matters of attire.

1798. Napoleon visits Palestine; Jewish community of Jerusalem accused of assisting him and its members threatened with death.

1827. First visit of Moses Montefiore.

1838. Edward Robinson commences archeological research in Jerusalem.

1840. Crémieux, Montefiore, and Albert Cohn visit Jerusalem.

1841. (Nov. 7.) S. M. S. Alexander, convert to Christianity, consecrated first Anglican Bishop of Jerusalem.

1854. Albert Cohn establishes many charitable institutions.

1862. (Sept. 5.) Treaty to preserve the Holy Sepulcher signed by Russia, France, and Turkey.

1880. Siloam Inscription discovered.

1892. (Sept. 13) Railway from Jerusalem to Jaffa, built by a French company, opened.

1898. (Nov. 1.) William II. of Germany visits Jerusalem in state and receives a Jewish deputation.

1900. Abarbanel Library founded.

Sources Consulted (for 'Hist. Of Jerusalem')

ENCYCLOPAEDIAS, ETC.

Compton's Enc. Chicago: Compton's Learning Co., 1989, s.v.

'jerusalem' (12:99-102).

Enc. Americana. Connecticut: Grolier Incorpora-ted, 1986, s.v. 'Jerusalem', by J. L. Kraemer, Tel Aviv University, 16:26-32.

Enc. of Islam, New (1986) edn., s.v. 'al-Kuds' by O. Grabar, Harvard Univ.

Enc. of Judaism Second (2005) edn. Leiden: Brill, s.v. 'Jerusalem in Judaism', by Mayer Gruber (2:1201-1211).

Enc. of Religion, Second (2005) edn. USA: Thompson Gale, s.v. 'Jerusalem' by Reuven Firestone.

Grolier Academic Enc., 1985 (11:399-401).

Illustrated World Enc. NY: Illustrated World Enc., Inc., 1969 (12:2903-05).

International Standard Bible Enc. (Version 1.0 © 1997). Albany, OR USA: AGES Software, s.v. 'Jerusalem' (6:180-250).

Jewish Enc. NY: KTAV Publishing House, INC., 1901 (7:118-57).

Merit Students Enc. USA: Crowell-Collier Educational Corporation, 1967 edn., s.v. 'Jerusalem' by Donald N. Wilber (10:158-162).

-----Year Book 1973, s.v. 'Jerusalem' by Abba Eban (p. 46-55).

New Book of Knowledge, The Cildren's Enc. NY: Grolier Inc., 1970 (10:78-81).

New Caxton Enc. London: Caxton Pubg. Co., 1973, s.v. 'Jerusalem' (11:3420-22).

New Enc. Britannica, Macropaedia. Chicago: University of Chicago, 1982, s.v. 'Jerusalem' by Stewart Henry Perowne (10:138-44).

New Standard Enc. Chicago: Standard Educatioinal Corp., date etc. have been recorded in Vol. I only, which is not available (7:J-52 to J-55).

Universal World Reference Enc. Chicago, Illinois: Consolidated Book Publishers, 1964 (8:2709-10).

al-Suwaidān, Dr. Ṭariq. *Falastine, al-Tarikh al-Musawwar*. al-Ibda' al-Fikri, Kuwait, 2004 (84-86).

Jerusalem. Keter Books, Israel Pocvket Library, 5 (1973).

Jamie Scott & Paul simpsom-Housley. *Sacred Places and Profane Spaces.* NY: Greenwood Press, 88 Post Road West, Westport, CT 06881, 1991.

Islamic Studies (Special Issue on 'Jerusalem'), Vol. 40: Nos. 3,4 Autumn-Winter, 2001. Ed. Dr. Zafar Ishaq Ansari, Guest ed. Salma Khadra

Jayyusi. Islamabad: Isl. Research Institute, International Isl. Univ.

ATLASES

Oxford Bible Atlas. Ed. Herbert G. May. Oxford: Oxf. Univ. Press, 1984.

New Bible Atlas. Ed. J. J. Bimson and J. P. Kane. Leicester: I.V. Press, 1985.

Terrien, Samuel. *Lands of the Bible*. Wisconsin: Western Pblg. Co. Inc., 1957.

Magi, Giovanna. *Jerusalem*. Florence: Casa Editrice Bonechi, 1992.

DICTIONARIES, ETC:

Fausset's Bible Dic. (Version 1.0 © 2000). Albany, OR USA: AGES Software, s.v. 'Jerusalem' (2:417-51).

Interpreter's Dic. of the Bible (2000). Nashville: Abingdon Press, s.v. 'Jerusalem' by M. Burrows (2:843-66).

McKenzie, John L. *Dic. of the Bible*. London: Geoffrey Chapman (1984), s.v. 'Jerusalem' (426-31).

Smith, William. *Dic. of the Bible*. Michigan: Regency Reference Library, Zondervan Pblg House, Grand Rapids (1967), s.v. 'Jerusalem' (292-305).

Illustrated Bible Dic. Inter-Varsity Press (1980). S.v. 'Jerusalem' by D.F. Payne, London Bible College, (2:752-60).

حواشی ضمیمہ ۴ 'یروشلم' کی مختصر تاریخ

1. *International Standard Bible Enc.*, (Albany, OR USA: Books For The Ages, AGES Software, Version 1.0 © 1997), s.v. 'Jerusalem' by Geerhardus Vos, 6:181.
2. "*Jerusalem*", Israel Pocvket Library, (Kate Books, 1973), 5.

۳۔ قدیم حجری دور (Old Stone Age)، 10,000 BCE سے ماقبل کا دور (Paleolithic)۔

۴۔ وسطی حجری دور (Middle Stone Age)، 10,000 to 7,500 BCE کا دور (Mesolithic)۔

۵۔ اواخرِ حجری دور (the latest part of the Stone Age)، اس دور کی نمایاں خصوصیت پتھروں کے کٹے ہوئے اور صیقل شدہ ہتھیاروں اور اوزاروں کا استعمال ہے (Neolithic)۔ ('نیو شارٹر اوکسفرڈ ڈکشنری'، ۱۹۹۳ء)۔

۶۔ عہدِ کانسی (Copper Age)، 4,000 to 3,150 BCE (Chaleolithic)۔

۷۔ اس اصطلاح کے صحیح ہجے 'celts' ہونے چاہئیں، جس کے معنی ہیں: 'پتھر کا کلہاڑا'۔ جہاں تک 'Celts' (بڑے 'سی' کے ساتھ) کا تعلق ہے، یہ اصطلاح مغربی یورپ کے لوگوں کے لیے مستعمل ہے، جو رومن کے آنے سے پہلے برطانیہ میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ بڑے تند خو قسم کے جنگجو اور اعلیٰ قسم کے شہسوار تھے۔ وہ اچھے کسان بھی تھے اور بیلوں سے کھینچے جانے والے ہل استعمال کرتے تھے۔

8. *International Standard Bible Enc.*, CD-ROM Version 1.0, 1997, 6:227.
9. *International Standard Bible Enc.*, CD-ROM Version 1.0, 1997, 6:227-28.
10. *Enc. of Judaism*, Second (2005) edn., 2:1201.
11. *Interpreter's Dic. of the Bible*,(2000) . 2:846.
12. *Enc. Britannica: Macropaedia 15th edn. (1982), s.v. 'Jerusalem'*10:139.
13. *Interpreter's Dic. of the Bible*, (2000), 2:846-47.

۱۴۔ Judges 1:8 NKJV یہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے قبل بھی یہ شہر 'شہرِ امن' نہیں تھا۔

15.William Smith, *A Dic. of the Bible* (Michigan: Grand Rapid, 1067), 302.
16. *Interpreter's Dic. of the Bible* (2000), 2:847.

۱۷۔ دیکھیے Interpreter's Dic. of the Bible, 2:848.

18.*International Standard Bible Enc.*, 'Jerusalem,', 6:231.

19. *Enc. Britannica: Macropaedia 15th edn. (1982)*, 10:139.

20.2-Kings 14:14 KJV.

۲۱۔ ملاحظہ کیجیے 'سمتھ کی لغات بائبل'، ۱۹۶۷ء، زیر لفظ 'یوسیاہ' صفحہ ۳۲۴۔

22.*International Standard Bible Enc.*, s.v. 'Jerusalem,' by Geerhardus Vos, 6:237.

۲۳۔ 'Victuals' کے معنی ہیں: 'سامان رسد و خوراک'۔

۲۴۔ 'Overreach' کے معنی ہیں: 'ناممکن کے حصول کی کوشش کی وجہ سے ناکامی کا سامنا کرنا'۔

25. *International Standard Bible Enc.*, s.v. 'Jerusalem,' by Geerhardus Vos, 6:239.

26.See *International Standard Bible Enc.*, s.v. 'Jerusalem,' by Geerhardus Vos, 6:240f.

۲۷۔ جون ہارکینس یا یوحانن (John Hyrcanus or Johanan: 135-140 BC.) جو شمعون مکابی (Simon Maccabeus) کا بیٹا تھا، ہیکل کا سردار کاہن اور حسمونی (Hasmonean) خاندان کا ایک شہزادہ تھا۔ وہ عقل مند اور منصف مزاج حکمران اور ماہر جنگجو تھا۔

28. John L. McKenzie, *Dic. of the Bible* (1984), 340.

29.A. R. Fausset, *Bible Dic.* (Albaney: AGES Software, Version 1.0, 2000), 2:434.

۳۰۔ کیلی گولا (Caligula) جو قیصر اوگسٹس (Caesar Augutus) کے نام سے مشہور ہے، سلطنت روم کا تیسرا بادشاہ تھا۔ وہ ۳۱ راگست ۱۲ء میں پیدا ہوا اور ۲۴ رجنوری ۴۱ء کو روم میں قتل ہو گیا۔ اس کی یہودی بادشاہ اگرپا (Agrippa) کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ اس نے اپنی خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس نے مختلف مقامات پر ایسی قربان گاہیں تعمیر کروائیں جن پر اس کے نام کی قربانی دی جاتی تھی اور اس کی عبادت کی جاتی تھی (Jewish Enc., 3:514)۔

۳۱۔ ماخوذ از: A. R. Fausset, *Bible Dic.*, 2:435-36.

۳۲۔ جب نزدیک آ کر شہر کو دیکھا تو اس پر رویا اور کہا (...)، اور تجھ میں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ چھوڑیں گے (لوقا ۱۹: ۴۱، ۴۴)۔

33. *International Standard Bible Enc.*, s.v. 'Jerusalem,' by Geerhardus Vos, 6:247.

34.A. R. Fausset, *Bible Dic.*, 2:437-38.

35.*International Standard Bible Enc.*, s.v. 'Jerusalem,' by Geerhardus Vos, 6:248.

36.*International Standard Bible Enc.*, s.v. 'Jerusalem,' by Geerhardus Vos, 6:248, 49.

37.A. R. Fausset, *Bible Dic.*, (2000), 2:438.

۳۸۔ ڈاکٹر طارق السویدان، فلسطین: التاریخ المصور، (الابداع الفکر، کویت، ۲۰۰۴ء)، صفحہ ۸۴۔

۳۹۔ ڈاکٹر طارق السویدان، فلسطین: التاریخ المصور، (الابداع الفکر، کویت، ۲۰۰۴ء)، صفحات ۸۵،۸۶۔

40. *The Enc. of Islam New (1986) edn*, s.v. 'al-Kuds' by O. Graber, Harvard Univ. 5:324-26.

۴۱۔ ڈاکٹر طارق السویدان، فلسطین: التاریخ المصور، (الابداع الفکر، کویت، ۲۰۰۴ء)، صفحہ ۹۰۔

۴۲۔ رملہ (Ramla) شہر یروشلم کے شمال مشرق میں قریباً ۴۰ کلومیٹر کی مسافت پر ساحلی میدان میں واقع ہے۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک ارضِ فلسطین کا والی تھا۔ اپنے والد کی تعمیر کردہ مشہور عمارت 'قبۃ الصخریٰ' سے متاثر ہو کر سلیمان نے رملہ شہر بسایا اور اُسے صوبائی دارالحکومت کا درجہ دے دیا۔

43. A. R. Fausset, *Bible Dic.*, 2:438.
44. *The Enc. of Islam*, s.v. 'al-Kuds' by O. Graber, 5:330-31.
45. A. R. Fausset, *Bible Dic.*, 2:438.

۴۶۔ ۱۹۴۴ء میں مسلمان میئر کے انتقال کے بعد اس وقت کے قائم مقام یہودی میئر کو سرکاری طور پر مقرر کیے جانے کا مطالبہ کر دیا گیا۔ اسی چپقلش کے نتیجے میں کونسل کو تحلیل کر دیا گیا اور انگریز افسروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔

47. *Enc. Americana* (1985), s.v. 'Jerusalem' by J. L. Kraemer, 16:26f.
48. *The Enc. of Islam*, s.v. 'al-Kuds' by O. Graber, 5:337.

۴۹۔ 'laconic' سے مراد ہے: 'جامع، مختصر اور دو لفظی'۔

50. *Merit Students Enc.* (Year Book 1973), s.v. 'Jerusalem' by Abba Eban (the then Israeli Minister of Foreign Affairs), p.55.
51. *Merit Students Enc.* (Year Book 1973), p

کتابیات بسلسلہ اکلوتا فرزند ذبیح

(a)The Bible, Translations and Versions:

S. No NAME OF THE BOOK	ABBREVIATIONS
1. *Authorized/ King James Version.*	AV=KJV
2. *The Christian Community Bible*. Manila: Divine Word Publ., 1988.	CCB
3 *Contemporary English Version.* NY: American Bible Society, 1995.	CEV
4 *Easy-to-Read Version.* Texas: World Bible Trans. Center, Inc Fort Worth, 2000.	Easy-to-Read
5 *Good News Bible* [Today's Eng Version]. NY: American Bible Society, 1982.	GNB/TEV
6 *Good News Bible (Revised Edn.)* Minto: The Bible Society in Australia Inc, NSW 2566, 1994.	GNB Rvd.
7 *Greek New Testament.*	Greek.NT
8 *The Holy Scriptures Heb. & English* (Hebrew OT with Eng. Tr.). Middlesex: The Society for Distributing Heb. Scriptures, nd.	Heb.OT
9 *The Living Bible* Illinois: Tyndale House Publrs., 1976.	LB
10 James Moffatt. *A New Trans. of Bible.* London: Hodder & Stoughton, Ltd, 1941.	Moffatt
11 *The Torah. The Masoretic* Text. Jewish Publication. Society of America.	MT
12 *New American Bible*, Catholic Bibl. Association, 1991.	NAB
13 *The New American Standard Bible.* Cambridge Univ. Press, 1977.	NASB
14 *The New English Bible.* Oxford: Univ. Press, 1985.	NEB
15 *New International Version*. London, 1984.	NIV
16 *The New Jerusalem Bible*, Standard Edition. Bombay: St. Pauls, 1993.	NJB
17 *The New King James Version.* The Gideons International,1985.	NKJV
18 *New Living Translation*: Award Bible. Ed./Tr. A Huge Team of Tr. Illinois: Tyndale House Publishers, Inc. Wheaton, 1996.	NLT
19 *The New Oxford Annotated Bible*, with Apocrypha. Ed Bruce M. Metzger, R. E. Murphy. NY: Oxford Univ Press, 1989.	NOAB
20 *New Revd. Stand. Version, Catholic. Edn. for India*, 1993.	NRSV
21 *New World Trans. of the Scriptures.* NY: Watchtower Bible and Tract Society, 1984.	NWTS
22 *The NT, Standard Edn.* Tr. Conor Murphy, Limuru. Kenya: Paulines Publications Africa, 1995.	NTSEdn

23 *The OT books of poetry 26 trans.* Ed. Curtis Vaughan. Michigan: Zondervan B Publi-shers, Grand Rapids, 1981. 26 TransOTPoetry

24 *The Tr. from Peshitta* (The Authorized B. of the Church of the East), 1957. Peshitta

25 *The Reader's Digest Bible.* London; The Reader's Digest Association Ltd, 1995. RDB

26 *Revd Berkeley Version.* Gideon International, 1974. RBerkleyV

27 *Revd. Standard Version.* UK: The B.F.B.S., 1974. RSV

(B) COMMENTARIES OF THE BIBLE

Sr.No. NAME OF THE BOOK, AUTHOR, PUBLISHER, ETC.

1 *An American Com. on the NT.* Ed. Alvah Hovey. Phila-delphia: American Baptist Publication Society, 1886.

2 William Barclay. *The Daily Study Bible.* Bangalore: TPI,1995.

3 William MacDonald. Believers Bible Com. (NT). Kansas: A & O Press, PO Box 8550, Wichita, 1989.

4 *The Bible Knowledge Com.* Ed. John F. Walvoord, Roy B. Zuck. Illinois: Victor Books, Wheaton, 1986.

5 *Broadman Bible Com.* Tennessee: Broadman Press, 1971.

6 *The Collegeville Bible Com* (OT). Gen. Ed. Dianne Bergant. Minnesota: The Liturgical Press, Collegeville, 1992.

7 *A Commentary on the Holy Bible.* Ed. J. R. Dummelow. The Macmillan Co., 1956.

8 *The Expositor's Bible* (25 Vols). Ed. W. Robertson Nicoll. NY: A. C. Armstrong & Son, 3 & 5 West 18th Street, 1903.

9 John Fawcett, D.D. *The Devotional Family Bible.* London: Baldwin, New Bridge Str., 1811.

10 James Comper Gray and George M. Adams. *Bible Com.* Michigan: Zondervan Pblg. House, Grand Rapids, na.

11 *The Pentateuch and Haftorahs.* Ed. Dr. J. H. Hertz. London: Soncino Press, 1979. Hertz.

12 *The International Bible Commentary.* Ed. William R. Farmer et al. Bangalore: TPI, 2004.

13 Rev. S. R. Driver. *The International Critical Com.* (a Critical & Exegetical C. on Deu.). Edinburgh: T. & T. Clarke, 1895.

14 *The Interpreter's Bible.* Ed. George Arthur Buttrick. NY: Abingdon Cokisbury Press, Nashville, 1952.

15 Dr. I. W. Slotki. *Isaiah.* London: The Soncino Press, 1949.

16 *The Jerome Biblical Com.* Ed. Raymond E. Brown, Joseph A. Fitzmyer, Roland E. Murphy. Bangalore: TPI, 1987.

17 Ronald A. Knox. *The Holy Bible* Tr. From Latin Vulgate. London: Burns & Oates, Macmillan & Co Ltd, 1957.

18 Ronald A. Knox. *A NT Commentary for English Readers.* London: Burns Oates & Washbourne Ltd, 1955.

19 *The Learning Bible: Contemporary English Version.* NY: American Bible Society, 2000.

20 Matthew Henry. *A Commentary on the Holy Bible.* London: Ward, Lock & Co, Warwick House, Salisbury Square, E.C.

21 W. Gunther Plaut, Bernard J. Bamberger. *The Torah, A Modern Com.* NY: Union of American Heb Congregations, 1981.

22 *Nelson Study Bible*. Ed Earl D Radmacher. Nashville: Thomas Nelson Pub, 1997.

23 *The New Bible Com.* Ed. by F. Davidson etc. Michigan: W M. B. Eerdmans Publg. Co., Grand Rapids, 1953.

24 D. Guthrie, J. A. Motyer, etc. *The New Bible Commentary Revised Edn.* London: Inter-Versity Press, 1972.

25 *A New Catholic Com. on Holy Scripture*. Ed. Rev. Reginald C. Fuller. Surrey:Thomas Nelson & Sons Ltd, 1981.

26 *A New Commentary on Holy Scripture*. Ed. Charles Gore, H. L. Goudge, Alf. Guillaume. London: Society for Promoting Christian Knowledge, 1928.

27 *New Jerome Bible Com.* Ed. Raymond E. Brown, Joseph A. Fitzmyer, Roland E. Murphy. Bangalore: TPI, 1994.

28 *NIV Study Bible*. Ed. Kenneth Barker etc. Grand Rapids: Zondervan Publishing. House, 1995.

29 *The Open Bible* (Expanded Edn). Ed na. NY: Thomas Nelson Publishers, Nashville, 1985.

30 *Peake's Commentary on the Bible*. Ed, Matthew Black, H. H. Rowley. London: Thomas Nelson & Sons Ltd, 1967.

31 *Pocket Bible Com.* William Neil. HarperSanFrancisco, 1975.

32 *The Pulpit Commentary*. Ed. Rev. HDM Spence DD, Dean of Gloucester & Rev. Joseph S. Excell. London: Kegan Paul, Trench, Trubner & Co. Ltd, 1897.

33 Thomas Scott, Rector of the Aston Sanford, Bucks. *Scott's Bible*. Philadelphia: J. B. Lippincott & Co, 1857.

34 *Seventh-day Adventist Bible Com.* Ed. Francis D. Nichol. Hagerstown: Review & Herald Pblg Association, 1978.

35 *A Jewish Com. 'The Soncino Chumash'.* Ed. The Rev. Dr. A. Cohen. Surrey: The Soncino Press, Hindhead,1950.

36 Dr. Frank Charles Thompson. *Thompson Chain Ref Bible* (5th Ed.). Bangalore: The Bible Society of India, 1988.

37 Lawrence O. Richard. Victor. *Bible Background Com.* (NT). Colorado, 80918, USA: Victor Books/SP Publ., Inc., 2003.

38 Marvin R. Vincent. *Word Studies in NT. Michigan*: WM. B. Eerdmans Publishing. Co, Grand Rapids, 1946.

39 Warren W. Wiersbe. *Wiersbe's Expository Outlines on the NT*. Colorado 80918, USA: SP Pubns., Inc., Cook Communications Ministries, 2003.

40 *The Wycliffe Bible Com.* Ed. Charles F. Pfieffer (OT), Everett F. Harri-son (NT). Chicago: Moody Press, 1983.

(C) DICTIONARIES, ENCYCLOPEDIAS, CONCORDANCES AND ATLASES

SR.NO NAME, AUTHOR, EDITOR, PUBLISHER, YEAR, ETC.

1 *Adv Learner's Enc.* Dic. Ed. Jonathan Crowther. Oxford Univ. Press, 1994.

2 *The Enc. Americana International Edn.* (in 30 Vols.). Connecticut: Grolier Incorporated, Danbury, 1987.

3 *Arabic-English Dictionary.* Maan Zulfu Madina. NY: Pocket Books, 1973.

4 *Enc. Biblica.* Ed. Rev. T.K. Cheyne. London: Watts & Co. 1899.

5 *Enc. Britannica* (15th Edn.). Chicago: the Univ of Chicago, 1988.

6 *The Chambers Dic.* Ed. Catherine Schwarz. Edinburgh: Chambers Harrap Pub. Ltd., 1995.

7 *Chambers Essential English Dictionary.* 1998.

8 F. L. Cross. *The Oxf. Dic. of the Christian Church.* London: Oxf Univ Press, 1974.

9 *Colliers Enc.* (24 Vols.). NY, 1995.

10 Rev. James L. Dow. *Collins Gem Dic.* of Bible. London & Glasgow: Collins, 1974

11 Easton's 1897 *Bible Dic. in "Power Bible"* CD. ROM Version.

12 *Harper's Bible Dic.* Ed. Paul J. Achtemeier. Bangalore: Theological Publications in India, 1994.

13 *A Dic. of the Bible.* Ed. James Hastings. Edinburgh: T. & T. Clark, 1904. Hastings

14 *Dic. of Bible* Ed. James Hastings, Rvd. Edn. By Frederick C. Grant & H. H. Rowley. NY: Charles Scribner's Sons, 1963.

15 *Holman Concise Topical Concordance.* Tennessee, USA: Holman Bible Publishers, Nashville, 1998.

16 *Holman Topical Concordance.* Philadelphia, USA: A. J. Holman Co., 1973..

17 *The Illustrated Bible Dic.* Ed. J. D. Douglas, Rvn. Ed. N. Hillyer. Inter-Versity Press, 1980.

18 *International Standard Bible Encyclopedia,* OR USA: Books For The Ages, AGES Software, Versioin 1.0 © 1997

19 *The Interpreter's Dic. of Bible.* (5 Vol). Ed. George Arthur Buttrick. NY: Abington Press, Nashville, 1962.

20 *The Enc. of Islam* (New Edn.). Ed. E. Van Donzel, B. Lewis, C. E. Bosworth. Leiden: E. J. Brill, 1978.

21 *The Jewish Enc.* Mng. Ed. Dr Isidore Singer. NY: KTAV Pub House, Inc.,1901.

22 *Enc. Judaica*-CD-ROM-Ed. Version 1.0, Copyright 1997. Judaica Multimedia (Israel) Ltd.

23 *The Lion Handbook to the Bible.* Ed. David & Pat Alexander. Herts, England: Lion Publishing plc, 1986

24 *Longman Dic. of Eng. Language & Culture.* Essex: Longman Group UK Ltd, 1992 Longman Dic.

25 *Master Study Bible,* NAS, Enc, Concordance, a Harmony of the Gospels, etc. Nashville: Holman Bible Publishers, 1977.

26 JL McKenzie's *Dic. of Bible,* London: Geoffrey Chapman, 1984.

27 *A Dic. of Modern Written Arabic.* Ed. J. Milton Cowan. London: Macdonald & Evans Ltd, 1980.

28 *New Bible Dic.* (II Ed.). N. Hillyer (Revision Edn.). Leicestor: Inter-Varsity Press, Eng., 1986.

29 *The New Shorter Oxford English Dic.,* 1993

30 *The New Standard Enc & World Atlas* With an Introduction by The Rev. C.A. Alington, D.D., Hm of Eton. Prepared under the general editorship of J. M. Parrish, M.A. (Oxon), John R. Crossland, F.R.G.S., & A. W. Holland, managing ed. of the Enc. Britannica (13th Edn); with the specialist assistance of George Somerville, MD, DPM.; John S. Linnell, B.A. (Oxon); K. M. Gadd, M.A. (Oxon & London); C. H. Knowles, B.Sc. (London); the Rev. Eric

Dixon, M.C., B.A., B.D. (Lond.); E. S. Roberts, B.A., and over 40 experts, learned societies and institutions. Odhams Press Ltd, London, W. C. 2, 1932.

31 *The New World Dic.*-Concordance to the New American Bib. Manila. Philippines: Daughters of St Paul, 1994.

32 John R. Kohlenberger III. NIV *Compact Concordance*. Manila, Philippines: OMF Literature Inc. PO Box 2217, 2002.

33 J. D. Douglas & Merrill C. Tenney. *NIV Compact Dic. of the Bible*. Michigan: The Zondervan Corp., Grand Rapids, 1989.

34 *Oxf. Dic.& Thesaurus*. Melbourne: Oxf. Univ. Press, 1997.

35 *Pictorial Biblical Enc*. Ed. Gaalyahu Cornfeld. NY: Macmillan Co., 1964. Pictorial Bib Enc

36 *The Enc. of Religion*. NY: Macmillan Publishing Co., 1987.

37 *Roget's II New Thesaurus*. Ed. Fernando de Mello Vianna. Boston: Houghton Mifflin Co, 1980.

38 *The Seventh-day Adventist Bible Dic*. (Rvd Edn by R. H. Woolsley). Ed. Don F. Neufeld, Washington DC. Hagerstown: Review & Herald Publishing Association, 1978.

39 H.A.R. Gibb, J. H. Kramer. *Concise Enc. of Islam*. Leiden: Brill Academic Publishers, Inc. 2001.

40 W. Smith. *A Dic. of Bible* (Revd. Ed. F.N., M.A. Peloubet). Michigan; Regency Ref. Lib. Grand Rapids, 1984.

41 *The Standard Jewish Enc*. Ed. Dr. Cecil Roth. London: W. H. Allen, 1959.

42 James Strong. *Strong's Exhaustive Concordance*. Michigan: Baker Book House, Grand Rapids, 1984.

43 James Strong. *A Concise Dic. of the Words in The Hebrew Bible*. NY, Cincinnati: The Methodist Book Concern, 1890.

44 W. E. Vine, Merrill F. Unger, William White Jr. *Vine's Complete Expository Dictionary of O & NT Words with Topical Index*. Nashville, USA: Thomas Nelson, Inc., 1996.

45 *Webster's Dic. of Eng. Usage*. Ed. E. Ward Gilman. Massachusetts: Merriam-Webster Inc., Springfield, 1989.

46 *Webster's New Dic. of Synonyms*. Ed. Philip B. Grove. Massachusetts: G.&C. Merriam Co, Springfield, 1978.

47 *Webster's New World College Dic*. 3rd Edn. Ed. Victoria Neufeldt. NY, USA: Macmillan, 1997..

48 Aḥmad bin Fāris. *Mu'jam Maqāyīs al-Lughah*. Beirūt: Dār Iḥyā al-turāth al-'Arabī, 2001.

49 Ismāīl ibn Ḥammād al-Jawharī. *Tāj al-Lughat wa Ṣiḥāḥ al-'Arabiyyah*. Beirūt: Dār al-'Ilm lil Malāyīn, 1984.

50 Al-Ustādh al-Ṭāhir Aḥmad al-zāvī, *Tartīb al-Qāmūs al-Muḥīṭ 'ala Ṭarīqah al-Miṣbāḥ al-Munīr*, 1979.

51 *Mu'jam al-Wasīṭ*. Beirūt: Dār Iḥyā al-turāth al-'Arabī, 1972.

52 Ibn Manẓūr. *Lisān al-'Arab*. Beirūt: Dār Ṣādir, 1300 AH. Lisān al-'Arab

53 Mu'allim Buṭrus al-Bustānī. *Muḥīṭ al-Muḥīṭ*. Beirūt: Maktabah Lubnān Nāshirūn, 1993

(D) MISCELLANEOUS

SR NO NAME OF THE BOOK, AUTHOR, EDITOR, PUBLISHER, YEAR,

1 Al-Imām Abī 'Abd Allāh Muhtammad bin Isḥāq al-Fākihī, *Akhbār Makkah fī Qadīm al- Dahr*

wa Hadīthihi'. Makkah: Maktabah al-Nahdat al-Hadīthah, 1987.

2 Dr. Muḥammad Muḥsin Khān. *Tr. of the Meanings of Sahih Al-Bukhare*. Riyādh: Dār al-Salām, S. A., PO Box 22743, 1997.

3 Ḥamīd al-Dīn Farāhī. *al-Ra'y al-Ṣaḥīḥ fī man Huwa al-Dhabīḥ*. Damascus: Dar al-Qalam, 1999.

4 George Sale, 'The Preliminary discourse' *to the Alkoran of Mohammed*. London: Frederick Warne & Co., na.

5 *The Koran*, Tr. N. J. Dawood, India: Penguin Books, 1994.

6 N. J. Dawood, Revised Dr. Zayid. *The Quran, An Eng Trans*. Beirut: Dar Al-Choura, 1980.

7 *The QUR'AN*. Tr. E. H. Palmer. Delhi: Motilal Banarsidass, 1988.

8 Geddes MacGregor. *The Bible in the Making*. London: John Murray, 1961.

9 Raymond E. Brown. *An Introduction to NT*. Bangalore: Theological Pub in India (TPI), 2000.

10 *The Cambridge History of the Bible*. Ed. P. R. Ackroyd & C. F. Evans. Cambridge: at the University Press, 1970.

11 Paul Johnson. *A History of Christianity*. NY: Simon & Schuster, 1995.

12 Rheme Perkins. *NT Introduction. Bombay*: St Paul Publications, Bandra, 1992.

13 Werner H Schmidt. *OT Introduction*, Tr. by Matthew J. O'Connell, Bombay: St Paul Publications, Bandra, 1992.

14 *The Works of Flavius Josephus*. Tr. by W. Whiston. Boston: D Lothrop & Co., na.

15 The Book of the Jubilees, in *'The Apocrypha and Pseudepigrapha of the OT in Eng.'* Ed. R. H. Charles. Oxford: The Clarendon Press, 1968.

16 *A Lion Handbook: the World's Religions*. Ed. R. Pierce Beaver, etc. England: The Lion Publishing, Herts, 1984

17 Raymond E. Brown, Joseph A. Fitzmyer, and Roland E. Murphy. *The New Jerome Bible Handbook*. Minnesota: The Liturgical Press, Collegeville, 1993.

18 *The NT Background*. Ed. C. K. Barret. HarperSanFrancsco, 1995.

19 Bruce M. Metzger. *The Text of the NT*. Oxford: at the Clarendon Press, 1964.

20 F. F. Bruce. Places Abraham Knew. London: Scrip-ture Union, City Road, ECIVZNJ, 1984.

21 Joseph Kudasiewicz. *Synoptic Gospels Today*. Manila: T Pauls, Makati City, Philippines, 1996

22 Mawlānā Amīn Aḥsan Iṣlāḥī. *Tadabbur-e-Qur'ān*. (Lahore: Faran Foundation, 1977),

23 Ken Anderson. *Where to Find It in the Bible*. Nashville, USA: Thomas Nelson Publ, 1996.

حواشی کا انڈکس

باب دہم: ۲۸- ہاجرہ: ایک چھوڑی ہوئی بیوی
۲۹- نیا حرم ابدی اور بڑا ہوگا
۳۱،۳۰- اقتدار اور عظمت پھر کبھی ختم نہ ہوگی
۳۳- یروشلم کی دوبارہ تعمیر
۴۱- اونٹوں کے بڑے کاروان آئیں گے

باب یازدہم: ۰۱- ۸۴ ویں مزمور داؤد کا مصنف
۰۲- رب الافواج
۰۳- خیمہ اجتماع یا خیمہ عبادت
۰۴- داؤد کے دل میں بیت اللہ کی تمنا
۵تا۷- ابابیل کا بھی ایک گھر ہے
۰۹- ہمیشہ تیری تعریف کرتے ہیں
۱۰،۱۷- حج و زیارت کی خواہش
۱۲،۱۷- صیہون / مکہ
۱۳تا۱۵- بکہ
۱۶- جوق در جوق آنا
۱۸- اللہ کا حقیر ترین مہمان بننے کو عیش کی زندگی پر ترجیح
۳۰- ہفتادی ترجمہ
۳۱- ولگیٹ (Vulgate)

ضمیمہ اول: ۰۱- حضرت سارہ
۰۲- کنعان
۰۳- دودھ چھڑانے کی تقریب
۰۴- حضرت اسماعیلؑ ہاجرہ کے فرزند نہ کہ سارہ کے
۰۴- ابراہیم سے بے انصافی کی توقع

ضمیمہ اول: ۰۵- مسوراتی متن سے حذف
۰۵- منہ چڑانا، کھیل یا تمسخر
۰۶- ہاجرہ باندی نہیں بلکہ شہزادی تھی و باب دوم، حاشیہ ۲
۰۷- سارہ کا نام نہاد غصہ اور ظلم
۰۸- منکوحہ کنیز کا اخراج ممنوع
۰۹- سارہ اور ہاجرہ کے کردار
۱۰- سارہ کا نام نہاد کینہ
۱۱- اسماعیلؑ کا اخراج قابل ملامت
۱۲،۱۳- سارہ کے اسماعیلؑ کے ساتھ رویے پر ابراہیم کا دکھ
۱۳- خدا ابراہیم کو اس کے فطری دکھ پر تسلی دیتا ہے
۱۴- ابراہیم کا ہاجرہ سے لگاؤ
۱۵- اسماعیلؑ ایک بڑی قوم
۱۶- اسماعیلؑ: ابراہیمؑ کی نسل
۱۷- مشکیزہ یا بوتل
۱۸- ہاجرہ روٹیوں کے ایک تھیلے، پانی سے بھرے ایک مشکیزے، اور سترہ سال کے ایک لڑکے کا بوجھ کیسے اٹھا سکتی تھی؟ کیا ابراہیم ایسے ظالم ہو سکتے تھے؟
۱۹- یہ ناقابل یقین ہے کہ ابراہیمؑ اپنے بیٹے اسماعیلؑ اور اس کی ماں ہاجرہ کو اپنی بیوی سارہ کے حکم پر اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ سکتے تھے

ضمیمہ اول: ۲۱، ۲۸، ۲۹ – اسماعیلؑ ۱۶ یا ۱۷ سال کا جوان تھا

۲۲- اسماعیلؑ کی حفاظت کے لیے اللہ موجود تھا

۲۳- فرشتہ نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ

۲۴- ہاجرہ کی خداوند سے ہم کلامی

۲۵ تا ۲۷، ۳۰ – خداوند ہاجرہ اور اسماعیلؑ کے لیے مہربان اور قیوم تھا

۳۱- اسماعیلؑ جب فاران بھیجے گئے تو دودھ پیتے بچے تھے، سارہ کی ظلم و حسد سے بریت

۳۳ تا ۴۰ – بیر سبع کے معانی

۵۴- بیر سبع 'سات کا کنواں'

۵۵- زم زم

۵۸- کہانی کے متعلق مسلم روایت

۵۹- ہاجرہ کا صبر و سکون

ضمیمہ دوم: ۰۲- حذف / اتفاقی یا ارادی

۱۲- غلط وقت / موسم کا لباس وغیرہ

ضمیمہ سوم: ۰۱- تابوت سکینہ یا عہد کا تابوت

۰۲- ہیکل کے لیے فراہم کردہ سونے چاندی کی قیمت کا تخمینہ

۰۴- حرم شریف

ضمیمہ چہارم: ۰۳- قدیم حجری دور

۰۴- درمیانی حجری دور

۰۵- آخری حجری دور

۰۶- کانسی کا دور

۰۷- celts/ Celts

۲۳- Victuals

۲۴- Overreach

۲۷- جون ہارکینس

۳۰- کیلی گولا (قیصر آگسٹس)

۳۲- رملہ

۴۹- Laconic

اللہ تعالیٰ نے جس "اکلوتے بیٹے" کو قربانی کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا تھا، یہودیوں اور مسیحیوں کے نزدیک وہ اسمٰعیل نہیں بلکہ اسحٰق تھے۔ بائبل نے یہ قصہ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پورے قصے میں صرف ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی زبانی اس اکلوتے بیٹے کا نام اسحٰق بتایا گیا ہے۔ سیاق و سباق کے لحاظ سے یہ کسی طرح موزوں نہیں بنتا۔ قربانی کے لیے پیش کیے جانے کا یہ واقعہ بائبل میں اپنے وقوع سے قریباً ایک ہزار سال بعد ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا۔ اس بات کا کوئی علم نہیں کہ اس کا مصنف کون تھا اور ثقاہت کے لحاظ سے اس کا کیا مرتبہ تھا۔ لیکن یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ واقعے کا عینی شاہد نہ تھا۔

موجودہ کتاب نہ تو مناظرانہ نوعیت کی ہے اور نہ محض ایک معلوماتی تحریر ہے۔ یہ ایک طویل عرصے کی ریسرچ پر مبنی اس موضوع پر اس نوعیت کی پہلی علمی کاوش ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ کسی موضوع کو ثابت کرنے کے لیے کافی شہادت و دلائل مہیا کیے جائیں [illegible] یک طرفہ دلائل و شواہد پر رکھی گئی ہے۔ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ حوالہ جات لفظی یا معنوی تحریف کے بغیر دیانت داری سے پیش کیے جائیں۔

انگریزی ایڈیشن پر چند تبصروں سے اقتباسات

فاضل مصنف کا اسلوبِ تحریر معروضی، سائنٹیفک اور تحقیقی ہے۔ (...) یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ (سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، انڈیا، شمارہ ۳، جلد ۲۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴ء)۔

انھوں نے اپنے موقف کو بہت محکم دلائل سے ثابت کیا ہے۔ (...) یہ بلاشبہ ایک بہت گراں قدر علمی کوشش ہے (سہ ماہی فکر و نظر، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، شمارہ ۳، جلد ۴۲، جنوری تا مارچ ۲۰۰۵ء)۔

یہ کتاب مسلم مسیحی عالمانہ مکالمے کے میدان میں ایک بے مثال اضافہ ہے۔ یہ بات اپنی مثال آپ ہے کہ ایک مسلمان عالم اپنے دلائل کی فراہمی کے سلسلے میں مسیحی علمی ماخذ سے اس قدر استفادہ کرے۔ چنانچہ مسلم مسیحی مکالمے کے سلسلے میں ایک کاوش کے طور پر اس کتاب کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے (ریورنڈ [illegible]، دی ایشیا جرنل آف تھیولوجی، [illegible] ۲۰۰۵ء)۔

اگر ان کی دیانت دارانہ کاوش کے نتائج یہودی اور مسیحی کمیونٹی میں غیر جانبداری اور خیر سگالی کے جذبے سے پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں تو یہ مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے درمیان اس بین الاقوامی فضا کو سازگار بنانے میں بڑے مدد و معاون ثابت ہوں گے، جو صدیوں کی بے علمی اور بے اعتمادی کے سلسلے میں غلط فہمی اور مخاصمت کی وجہ سے اس قدر مکدر ہو چکے ہیں (ینگ مسلم ڈائجسٹ، بنگلور، انڈیا، ستمبر ۲۰۰۵ء)۔

انھوں نے اپنے دعوے کی تائید یا مخالف دعوے کی تردید کے لیے یہودی اور مسیحی علما کی تصانیف سے بھرپور استفادہ کیا ہے (ریڈینس ویوز ویکلی، نئی دہلی، انڈیا، ۱۹ تا ۲۲ جنوری ۲۰۰۵ء)۔

کتاب عالمانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اور مصنف نے کوشش کی ہے کہ اپنے نظریات کی تائید میں ناقابلِ تردید دلائل جمع کرے (اسلامک سٹڈیز، اسلام آباد، شمارہ ۱، جلد ۴۳، بہار ۲۰۰۵ء)۔

حقیقت میں یہ ایک ایسی کتاب ہے جو عظمتِ شان کے ہر معیار پر پوری اترتی ہے (کرنل (ریٹائرڈ) غلام سرور، روزنامہ پاکستان آبزرور، اسلام آباد، ۱۷ اگست ۲۰۰۳ء)۔

اس پاکستانی محقق (...) نے اس کی تالیف میں انتہائی حیرت انگیز علم و دانش اور تحقیقی جذبے سے کام لیا ہے۔ (...) مصنف بالآخر نہایت مضبوط بنیادوں پر یہ واضح کر دیتا ہے کہ صرف مسلم تعبیر ہی معروضی ہے (ببلیوگرافی [illegible]، برسلز، بیلجیم، ۳۶۶، [illegible] ۱۲، مارچ ۲۰۰۷ء)۔

یہ کتاب ہمارے عیسائی اور یہودی بھائیوں کو تحفے میں دینے کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اردو داں طبقے کے لیے بھی اگر اس کا ترجمہ کر دیا جائے تو اچھا ہوگا (ماہنامہ ترجمان القرآن بابت نومبر ۲۰۰۹ء، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور، تبصرہ از پروفیسر عبدالقدیر سلیم)۔